UnEven Page Numbers Within The Book Only

زمانہ

جلد ۷ — فروری ۱۹۳۸ء — نمبر ۲

قدیم ہندوستان اور اُس زمانہ کے ہندو مسلم تعلقات

(از سید طفیل احمد صاحب منگلوری (علیگ) مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل")

بدقسمتی سے آجکل ہندوستان کے متعلق ایک خیال یہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ زمانہ سابق میں مختلف اقوام کے حملہ آوروں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا، جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کی نہ جان و مال محفوظ تھی۔ نہ اُن کے کسی قسم کے حقوق تھے، نہ یہاں عدل و انصاف تھا نہ لوگوں کو کسی قسم کا امن اور سکون حاصل تھا اور نہ فارغ البالی اور خوشحالی کا پتہ تھا۔ اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ آجکل یہ سب چیزیں حاصل ہیں۔

مندرجہ بالا خیال صرف مسلمان اقلیت ہی کا نہیں بلکہ ہندو اکثریت کا بھی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے اُس زمانہ پر نظر ڈالی جائے جو مختلف اقوام کی باہمی کشاکش کا سمجھا جاتا ہے، اور دیکھا جائے کہ اُس زمانہ کی واقعی کیا حالت تھی، اور اہل ہند کو بنیادی حقوق جن پر کسی ملک کی خوشحالی اور آزادی کا انحصار ہے کس حد تک حاصل تھے۔

ایشیائی ملکوں کے درمیان آمدورفت اور تجارت

دراصل پہلے زمانہ میں ایک ملک والوں کا دوسرے ملک میں جانا اور وہاں رہنے کے لئے کشاکش کرنا اُن دنوں کی خصوصیات میں تھا۔ وہ زمانہ نہ صرف ہندوستان اور ایشیا بلکہ تمام دنیا میں مختلف گروہوں کے انتشار اور امتزاج کا تھا۔ اُس وقت کوئی ملک تو انسانوں کی پیدائش کے لئے زیادہ موزوں تھا اور کسی ملک کی زمین زیادہ...

اور پھلوں اور غلّوں کی کاشت اور مویشیوں کی چراگاہوں کے لئے زیادہ مناسب تھی۔ انھیں چراگاہوں اور زمینوں کی تلاش میں بعض قومیں خانہ بدوش پھرتی تھیں، اور بعض کسی حصۂ ملک میں رہ کر متمدن اور مہذب بن جاتی تھیں۔ اُن کا سب سے بڑا مولد وسط ایشیا تھا جہاں سے انسانوں کے مختلف جرگے یورپ، افریقہ اور چین تک جا کر بسے اور جنوبی و غربی ایشیا (جس میں ترکستان، افغانستان، ہندوستان، ایران، عرب، شام وغیرہ شامل ہیں) بمنزلہ اُن کے اصلی گھر کے ہو گئے تھے۔ اُس زمانہ کے ہندوستانیوں کو جبکہ ہندوستان کی شمالی سرحد کے درّے اور راستے بند ہیں اور اس کی وجہ سے اہل ہند مثل پردہ نشین عورتوں کے ہو گئے ہیں، پہلے زمانہ کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا جبکہ مختلف قوموں کی نقل و حرکت میں نہ کوہ ہمالیہ کی بلند اور برفانی چوٹیاں مانع ہوتی تھیں، اور نہ میلوں چوڑے دریا کوئی رکاوٹ پیدا کر سکتے تھے۔ اگر آجکل کے مصنوعی اخلاقی اصول کی رُو سے دراوڑی اور آریہ اور سِتھین قومیں اپنے قدم اپنے اصلی مولد و مسکن سے نہ نکالتیں اور سب قومیں اپنے اپنے پیدایشی ملکوں میں رہا کرتیں، تو غالباً آج تک ہندوستان کے نہ جنگل صاف ہوتے، نہ یہاں کاشت ہوتی نہ باغات نصب ہوتے، نہ عظیم الشان شہر بنتے، نہ موجودہ تمدن اور تہذیب قائم ہوتی، اور صرف ہندوستان کی یہ حالت نہیں ہوتی بلکہ یورپ بھی اپنی جنگلی اور بیابانی حالت سے ابتک نہ نکل پاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں براعظم ایشیا کے مختلف ملکوں کے درمیان نہایت آزادی سے آمد و رفت تھی اور چونکہ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان زیادہ سرسبز اور زرخیز تھا اس لئے لوگوں کی توجہ زیادہ تر اُس کی طرف رہتی تھی، اور اکثر قومیں جو اس طرف آتی تھیں بالعموم یہیں بود و باش اختیار کر کے اس ملک کو ترقی دیتی تھیں۔ اِس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جب کوئی نیا جتھا ہندوستان میں داخل ہوتا تو یہاں کے سردار اُس کا مقابلہ کرتے تھے، مگر وہ لڑائی سرداروں تک محدود رہتی تھی کامیابی یا ناکامی کے بعد یا تو وہ جتھا واپس چلا جاتا تھا یا ہندوستان میں رہ پڑتا۔ رہ جانے کی صورت میں بالکل وہی کیفیت ہو جاتی تھی جو عرسوں اور میلوں کے زمانہ میں ریل کے کسی درجہ میں نئے آنے والوں کی ہوتی ہے کہ داخل ہوتے وقت تو اُن کے ساتھ مُنتت مُنتت تک کی نوبت پہونچ جاتی ہے مگر تھوڑی دیر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے کے بعد دوستانہ تعلقات قایم ہو کر باہمی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر باہر سے داخل ہونے والے کا مقابلہ یہ سب مل کر کرتے ہیں، جو گھنٹہ بھر قبل آپس میں لڑ رہے تھے۔

علاوہ بریں ہر بیرونی حملے کے بعد جلد سکون ہو جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ فاتح کے قیام و بقا کا انحصار چونکہ عوام کی خوشنودی پر ہوتا تھا اس لئے وہ اپنی رعایا کی رضا جوئی کرتا تھا، وہ اور اُس کے اُمرا اور عُمّال اپنی دولت رعایا میں لُٹاتے تھے جس سے ہر پیشہ کے لوگ فارغ البال رہتے تھے اُس زمانہ کے اُمرا کا اسراف عمدہ اوصاف میں شمار کیا جاتا تھا۔ بعض امرا اور سلاطین ذاتی طور پر فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنی دولت رعایا کے خوشحال بنانے میں صرف کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے لوگوں کو سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم بنیادی حق روٹی کی طرف سے مطمئن ہونے کا بدرجۂ اتم حاصل تھا۔

پچھلی تاریخیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ سابق میں چین سے لیکر ایشیائے کوچک تک اور سائبیریا سے لیکر راس کماری تک جملہ ایشیائی ممالک کے راستے کھلے ہوئے تھے اور ان تمام ملکوں میں آزادی کے ساتھ تجارت ہوتی تھی، ہندوستان کا لوہا اور اسپات اور یہاں کی شکر وسط ایشیا تک جاکر فروخت ہوتی تھی۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان کی تجارت چین اور سلطنت روما کے ساتھ تھی۔ غرضیکہ مشرقی ایشیا کے لوگ غرب میں اور شمالی ایشیا کے لوگ جنوبی حصوں میں آتے جاتے تھے، اور جب کوئی سیّاح کسی ایک طرف سے اُٹھتا تھا تو ہر ملک کے کونے کونے میں پھر جاتا تھا۔ یہ حالت جملہ ایشیائی ملکوں میں تھی، اور وسط ایشیا سے لیکر ہندوستان تک تو بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہاں سے لیکر یہاں تک ایک ملک ہے جو مختلف صوبوں میں تقسیم ہے اور ان صوبوں کی حدود وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کے حدود

رگ وید کے بعض منتروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ قوم کے لوگ کسی دریا کے کنارے پر رہتے تھے، یہ دریا بعض کے نزدیک دریائے ہیلمنڈ تھا، بعض کے نزدیک دریائے انڈس تھا جو سندھ کو سیراب کرتا ہے، اِن دونوں میں سے کوئی دریا بھی کیوں نہ ہو یہ یقینی امر ہے کہ اُس زمانہ میں جس علاقہ میں آریہ قوم بستی تھی وہ دریائے ہیلمنڈ سے لیکر پنجاب تک تھا دریائے ہیلمنڈ کے متوازی شمال کی جانب اُونچی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جس نے افغانستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور جو در اصل ہندوستان کی قدیم ترین شمالی سرحد ہے۔ جو مغلوں کے زمانہ تک قائم رہی اور جہاں سے لیکر بندھیاچل تک ایک وسیع ملک تھا جو حقیقی معنوں میں ہندوستان تھا اور یہ ایک واقعہ ہے کہ تمدن، زبان، اور معاشرت کے اعتبار سے اُس کے ہر علاقہ کے باشندوں میں یکسانیت تھی۔ جیسی کہ گنگا جمنا کے درمیان رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب دکن کے باشندوں کے

مقابلہ میں غزنی اور کابل کے باشندوں سے زیادہ ملتی جلتی تھی۔ اور یہ عرض کیا گیا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہندوستان کی شمالی سرحد دریائے ہلمند کے متوازی تھی۔ مگر اکثر ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ ہندوستان کے صوبوں کا علاقہ اس سرحد کے پار تک پھیل جاتا تھا۔ مثلاً تاریخ ہند مصنفہ ڈاکٹر ایشری پرشاد میں تحریر ہے کہ مسیح سے چھ سو سال قبل آریہ ورت میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں اُن میں سے ایک کاندھار (قندھار) تھی، اس کا دارالسلطنت ٹیکسیلا تھا یہ ریاست پشاور کے قریب تھی۔ یہ وہی ٹیکسیلا ہے جہاں سے اب بودھوں کے مشہور دارالعلوم کی عمارتیں برآمد ہوئی ہیں اور موجودہ سرحد سے ایک سو بیس میل جنوب کی طرف واقع ہے جو کسی زمانہ میں ہندستان میں شامل تھا۔

اہل ہند کی واقفیت ایشیائی زبانوں سے

۵۰۰ قبل مسیح میں دارا کے زمانہ میں پنجاب ایران کا ایک صوبہ تھا اور اُس کے تعلقات اصلی ہندوستان یعنی صوبہ متحدہ کے مقابلہ میں ایران کے ساتھ زیادہ تھے۔ اسی طرح پہلی صدی عیسوی میں مشہور راجہ کنشک کا جو بودھ مذہب رکھتا تھا۔ علاقہ متھرا سے لیکر سمرقند تک تھا جو شمالی سرحد افغانستان سے دو سو میل آگے ترکستان میں واقع ہے۔ اس وقت برّاعظم ایشیا کے مختلف ملکوں میں باہمی میل جول کی وہی کیفیت تھی جو آج برّاعظم یورپ کے مختلف ممالک کے درمیان ہے کہ اُن کا تمدن، اُن کی معاشرت تقریبًا ایک ہے اُس وقت یہاں بھی ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کی زبان جاننے والے بکثرت ہوتے تھے اور یہ حالت نہ تھی کہ پنجاب کے لوگ اس وقت افغانستان یا ایران کی زبان سے بالکل بیگانہ ہیں جس طرح یورپ میں تقریبًا ہر شخص اُس برّاعظم کے ملکوں کی کئی کئی زبانیں جانتا ہے۔ بجنسہٖ یہی حالت برّاعظم ایشیا کے لوگوں کی تھی کہ ایک ہندی اگر فارسی اور پشتو بولتا تھا تو افغانی اور تاتاری بھی ہندی زبان میں با محاورہ گفتگو کرسکتا تھا، کیونکہ آمد و رفت کے راستے کھلے ہوئے تھے۔

ہندوستان مختلف مذاہب کا عجائب خانہ تھا

ایشیا کی مختلف زبانیں جاننے والے بالخصوص ہندوستان میں زیادہ تھے اس لئے کہ بوجہ سرسبزی اور غلّوں کی پیداوار کے مختلف اقوام کی آمد کے لئے اس ملک میں زیادہ کشش تھی۔ نیز مختلف اقوام کا مرکز ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں کم و بیش ہر عقیدے کے لوگ پائے جاتے تھے۔ اور ہندوستان مذہب کے اعتبار سے ایک اچھا خاصہ عجائب خانہ تھا جس میں ہر نمونے اور ہر عقیدے کے لوگ موجود تھے، اور امن و آشتی کے ساتھ یکجا رہ کر رواداری کا ایک بہترین نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اور یہ دعوی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف اقوام کے مذہبی اور معاشرتی حقوق کسی اور ملک میں یہاں کے برابر محفوظ نہ تھے۔

ہندوستان کی حالت براعظم یورپ سے بالکل مختلف تھی، جہاں مذہب کی بنا پر صدیوں تک کشت و خون ہوئے، اختلاف عقائد کی بنا پر ہزاروں بیگناہ آدمی زندہ جلا دیے گئے، شہر اور مضافات برباد کئے گئے۔ یورپ کے لوگ قدیم ہندوستان کی حالت کو بھی اپنے براعظم پر قیاس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہاں بھی ایک عقیدہ والے دوسرے عقیدہ والوں اور فاتحان اپنی مفتوحہ رعایا کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کے لئے مجبور کرتے ہونگے۔ اگر یہاں ایسا ہوا ہوتا تو اس ملک میں صدہا مختلف مذاہب اور مذہبی فرقوں کا وجود کیونکر ہوتا۔ یہاں کی حالت ہمیشہ سے بالکل مختلف رہی ہے اور بجز موجودہ زمانہ کے جبکہ سیاسی اثرات سے یہاں فرقہ پرستی پیدا ہوگئی ہے بالعموم تمام ایشیا اور بالخصوص ہندوستان ان گندگیوں اور آلائشوں سے بالکل بری اور پاک تھا۔

حملہ آوروں نے بودھوں کا مذہب اختیار کرلیا

اس وقت ہمارے سامنے وسط ایشیا کی حملہ آور اقوام کی نظیریں موجود ہیں، جو ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں، مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ انھوں نے بجائے اپنا مذہب پھیلانے کے خود اہل ہند کا مذہب اختیار کرلیا۔ مغل، ترک اور تاتاری جنھوں نے تمام ایشیا و یورپ کے براعظموں میں اودھم مچا رکھی تھی سب کے سب بودھ مذہب کے پیرو ہوگئے تھے۔ چین میں اہل ہند کی فوج چڑھ کر نہیں گئی مگر وہاں ہزاروں میل کے رقبہ میں بودھ مذہب پھیل گیا۔ وسط ایشیا اور ترکستان جن کے تصور سے کمزور قوموں میں لرزہ پڑتا تھا وہ بودھوں کی مذہبی یادگاروں کے خزانے ہیں۔ اِس وقت نئی دہلی میں سنٹرل ایشین میوزیم کے نام سے جو عجائب خانہ قائم کیا گیا ہے اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ترکستان بودھوں کے مندروں سے پٹا پڑا تھا۔ یہ وہی مذہب ہے جو کمزور ہندوستان میں پیدا ہوا اور اُس نے وسط ایشیا کی سب سے زیادہ خونخوار اور جنگجو اقوام کو اپنا حلقہ بگوش بنالیا۔

تاتاری فاتحین نے مغلوب مسلمانوں کا مذہب اختیار کرلیا

اس کے بعد عرب میں اسلام پیدا ہوا اور سرعت کے ساتھ بڑھا۔ اس کی نسبت مخالفین کہتے ہیں کہ وہ سلطنت کی قوت اور تلوار کے زور سے مختلف ممالک میں پھیلا۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ بے رحم تاتاریوں اور ترکوں نے اسلامی ممالک پر حملے کرکے اُس کے دارالسلطنت بغداد کو برباد اور سلطنت عباسیہ کو پاش پاش کردیا اور پھر اُنھیں ترکوں اور تاتاریوں سلجوقیوں اور مغلوں نے اپنے دست نگر اور مظلوم مسلمانوں کا مذہب اختیار کرلیا۔ اس حملہ کی تفصیل ڈاکٹر سر آرنلڈ نے اپنی کتاب اشاعت اسلام میں اسطرح کی ہے:۔

"مغلوں نے جو حملے مسلمانوں پر کئے اُن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے۔ چنگیز خاں نے مسلمانوں

کی تہذیب کے مرکزوں کو تاخت و تاراج کر دیا، عمارات کو مسمار باغات و زراعت کو برباد کر دیا۔ جب ہرات میں سے فوج گذری تو لاکھ آدمیوں میں سے صرف چالیس آدمی چھپ کر نکل پائے۔ بخارا میں مغلوں نے مسجدوں کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا، انسانوں کو قتل کیا جو بچے انھیں غلام بنا لیا۔ یہی حال سمرقند اور بلخ کا کیا۔ اسی طرح بغداد کو برباد کیا جو عباسیوں کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ بغداد کی لوٹ ایک ہفتہ تک جاری رہی جس میں دس لاکھ آدمی مارے گئے۔ سر پرسی سائیکس نے لکھا ہے کہ اس صدمہ سے مسلمانوں کی تہذیب پھر نہیں پنپی، زبانِ عربی کی اہمیت جاتی رہی۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سفّاک اور بے رحم مغل پھر مسلمان کس طرح ہو گئے، کیا وہ مسلمانوں کی تلوار کے زور سے ہوئے، یا اُن کے صبر و تحمل اور اخلاقی قوت سے، اور پھر کیسے مسلمان ہوئے کہ خونخواری کی جگہ اُن میں حد درجہ کی بُردباری اور رواداری پیدا ہو گئی۔ اِن بدیہی واقعات سے ظاہر ہے کہ ایشیا میں مذہب پھیلنے کے وجوہ دست و بازو کی قوت کے علاوہ کچھ اور ہوتے تھے۔ ہندوستان کے لوگ اپنی قوت سے واقف ہیں، وہ عربوں اور افغانیوں کو بھی دیکھتے ہیں کیا وہ لوگ یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ تھوڑے زور افغانیوں نے کسی زمانہ میں اول ہندوستانیوں سے دب کر بودھ مذہب اور پھر اس کے بعد عربوں سے مغلوب ہو کر اسلام قبول کیا ہوگا۔ یہ محض سیاسی فوائد کی بنا پر بعض خود غرض جماعتوں کا پروپیگنڈا ہے کہ ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تاکہ اس ملک میں فرقہ پرستی کی آگ سلگتی رہے اور قیامت تک یہ ملک غلامی میں پھنسا رہے۔

اسلام اور بودھ مذہب کے پھیلنے کے وجوہ

اگر غور سے دیکھا جائے تو ایشیا میں اسلام پھیلنے کی بڑی وجہ وہی ہے جو اس بر اعظم میں بودھ مذہب پھیلنے کی ہوئی تھی۔ اور وہ وجہ یہ تھی کہ بودھ مت اختیار کرنے والے خواہ امیر ہوں یا غریب، عالم ہوں یا جاہل سب کے سب تمدن کی ایک سطح پر آ جاتے تھے۔ ہزار ڈیڑھ ہزار برس بعد جب بودھ مذہب کی اس خصوصیت میں کمی ہو گئی اور ہندوستان کے ادنیٰ فرقے چھوت چھات کی سختی کی وجہ سے بیکسی کی حالت میں پہونچ گئے تب اسلام نے اُن کی مدد کی اور اُس کی مساوات کی تعلیم کی وجہ سے اُسے عوام الناس نے اختیار کیا۔ پنڈت سندر لال صاحب الہ آبادی نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر ارنلڈ کا یہ نظریہ تسلیم کیا ہے کہ "بنگال میں کپڑا بُننے والے ہندو ذلیل اور ناپاک سمجھے جاتے ہیں، اس لئے اُنھوں نے اسلام قبول کر کے اپنی تمدنی سطح کو بلند کر لیا۔"[2]

---

[1] ماخوذ از طبقات ناصری ۱۴ باب خروج بقول از قاضی منہاج السراج جرجانی قاضی دہلی۔
[2] مضمون پنڈت سندر لال از اخبار استقلال دیوبند مورخہ ۴ مارچ ۱۹۳۶ء

مذہب عیسوی بھی اوّل یورپ میں اِسی خصوصیت کی وجہ سے بڑھا اور پھیلا تھا، اور ہندوستان میں اگرچہ سلطنت ابتدا سے اُس کی پشت پر رہی، اور یورپ و امریکہ سے بیشمار روپیہ آکر یہاں اشاعت و تبلیغ پر صرف ہوتا ہے، تاہم اس وجہ سے کہ اہل یورپ دلیسی عیسائیوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ نہیں کرتے ہندوستان میں مسیحیت اُن کی مساعی کے مطابق نہیں پھیلی۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کس راستہ سے داخل ہوا۔ اس کی نسبت پنڈت سندرلال صاحب الہ آبادی نے صاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ "ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ جنوبی اطراف سے ہوئی، شمالی سے نہیں، اور وہ بھی اُس وقت جبکہ وہاں مسلمانی حکومت کا پتہ نہ تھا۔"[۱]

دراصل ہندوستان میں اسلام کی آمد کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا کہ بحری تجارت کے ذریعہ سے عرب تمام مشرقی جزائر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اوّل وہ آٹھ صدی قبل مسیح جزیرہ سماترا میں آنے اور اُسی دوران میں وہ جنوبی ہند کے ساحل ملابار اور سیلون میں رہنے لگے۔ اُس وقت ملابار میں بودھ جینی، برہمن، یہودی، عیسائی غرضکہ جملہ مذاہب کے لوگ رہتے تھے، اُنھیں میں سے عرب تھے جن کا عقیدہ بت پرستی اور ستارہ پرستی تھا۔ عرب میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو بوجہ عرب کے ساتھ آمدو رفت کے تعلقات کے سبب سے اول جنوبی ہند کے عرب اُس سے متاثر ہوئے اور اُن فیض صحبت اور ہمسائگی سے دوسرے ہندیوں نے اسلام کی طرف توجہ کی، حتیٰ کہ ملابار کے راجہ زیمورن کی نسبت مشہور ہے کہ اُسے اسلام کی طرف رغبت ہوئی اور وہ اپنا تخت اپنے ولیعہد کے سپرد کرکے عرب کو سمندر کے راستہ سے روانہ ہوا۔ اور اثنائے سفر میں فوت ہوکر یمن کے ساحل پر دفن ہوا۔ اِسی زیمورن نے اپنی ریاست میں حکم دیا تھا کہ مچھیروں کے ہر خاندان میں کم سے کم ایک مسلمان کی پرورش کی جائے۔ کہ وہ جہاز پر کام کرسکے۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنی تصنیف "عرب اور ہند کے تعلقات" اور مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی نے "تاریخ آئینۂ حقیقت نما" میں آنحضرت صلعم کے متعدد صحابہ کرام کے اسمار گرامی لکھے ہیں جنھوں نے اس نواح میں آکر وفات پائی جن میں سے ایک صحابی تمیم انصاری کا مزار مدراس کے نواح میں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو خالص تجارت یا تبلیغ کے سلسلہ سے ہندوستان میں آئے تھے اور

---

[۱] اسلام اور پیغمبر اسلام کے کارنامے از استقلال دیوبند نمبر ۹ جلد ۲

ان کا تعلق ملک گیری یا فوج کشی سے قطعاً نہ تھا۔ انھیں اصحاب کے فیضِ صحبت سے بقول مصنف تاریخ فرشتہ "سراندیپ یعنی سیلون کا راجہ بھی مسلمان ہوگیا تھا۔ پھر دوسری صدی ہجری یا آٹھویں صدی عیسوی میں ملابار کے راجہ مسمیٰ چیرامن پیرومل نے مسلمان سیاحوں کی بڑی تعظیم و تکریم کی، اُن کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور اُن کے ساتھ عرب کو روانہ ہوا مگر راستہ میں انتقال کیا۔ مسلمانانِ عرب کے ساتھ ہندو راجاؤں کے اس حسنِ اخلاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی ہند کے بہت سے مقامات میں اسلام اچھی طرح جاگزیں ہوگیا اور اُن کی مسجدیں اور معبد مختلف شہروں میں بکثرت بن گئے۔ اُس زمانہ کی نسبت مورخوں نے لکھا ہے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی بقدر دس ۱۰ فیصدی کے ہوگئی تھی۔ اُسی زمانہ کی نسبت تاریخوں میں مالوہ کے راجہ کی نسبت بھی تحریر ہے کہ وہ مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا تھا اور اُن سے عقیدت رکھتا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کی ابتدا

ابتدائی تبلیغی دَور کے بعد اب ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس کے واقعات یہ ہیں کہ صوبۂ سندھ اور عرب کے درمیان ایران کا ملک واقع تھا۔ پہلی صدی ہجری یا ساتویں صدی عیسوی میں ایرانیوں اور عربوں کے درمیان متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ اُن میں سے مقامات نہاوند اور ذات السلاسل قادسیہ اور مکران کی لڑائیوں میں سندھ کے راجہ ایرانیوں کی طرف سے لڑتے رہے حتیٰ کہ ایک بار راجہ داہر کے نائب نے گورنر قندھار پر حملہ کیا مگر عربوں نے اُس کا کوئی انتقام نہیں لیا۔ اُسی کے ساتھ خلفائے بنو اُمیہ کی سلطنت کے باغی مسلمان ہمیشہ راجہ داہر کے ہاں پناہ لیتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں محمد بن علافی اُس سے باغی ہوکر معہ پانسو سپاہیوں کے لشکر کے راجہ داہر کے ہاں چلا آیا۔ راجہ موصوف نے اُس کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور بعد کی خدمات کے صلہ میں اُسے اپنا وزیر بنا لیا اور سکہ کے ایک طرف اُس کا نام مسکوک کیا۔ اس دوران میں راجہ سراندیپ نے آٹھ جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا جن میں قیمتی تحائف بار کئے گئے تھے اور اُن میں بہت سے مسلمان سوداگروں اور حاجیوں کا قافلہ سوار تھا۔ یہ بیڑا بادِ مخالف سے بہہ کر ساحل دابیل بندرگاہ سندھ کے قریب پہونچا، جسے راجہ داہر کے گورنر نے لوٹ کر مردوں عورتوں اور بچّوں کو قید کر لیا۔ حجّاج کو جب اس واقعہ کی خبر پہونچی تو اُس نے راجہ داہر کو خط لکھا، اُس کا جواب گستاخانہ پہونچا۔ اس لئے حجاج نے پچھلے تمام واقعات کی بنا پر خلیفہ سے سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔ مگر قبل اس کے کہ عربوں کی فوج دابیل تک پہونچے راجہ داہر نے پیش قدمی کرکے اُسے پے درپے دو شکستیں دیں۔ بالآخر حجاج نے محمد بن قاسم کو جن کی عمر سترہ ۱۷ سال کی تھی اس مُہم پر روانہ کیا

جنھوں نے سندھ کو فتح کیا۔ اس حملہ کے تفصیلی حالات بیان کرنا طوالت سے خالی نہیں اس لئے ہم صرف یہ دکھانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب راجہ داہر کی طرف سے محمد بن علافی مسلمانوں کے پانسو جوانوں کے ساتھ لڑ رہے تھے تو یہ جنگ ہرگز کوئی مذہبی لڑائی نہ ہو سکتی تھی، بلکہ خالص سیاسی لڑائی تھی۔ اسی طرح محمد بن قاسم کو جب کامیابی شروع ہوئی تو انھوں نے اپنے مشیروں میں ہندو سرداروں کو داخل کیا۔ چنانچہ اُن کا سب سے بڑا مشیر کاکا تھا جسے مسلمان مشیروں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ محکمۂ مال کا تمام انتظام برہمنوں کے سپرد کیا۔ موکا اور راسل ڈھو سپاہی تھے، اِن میں سے موکا محمد بن قاسم کا طرفدار اور راسل راجہ داہر کا طرفدار تھا۔ محمد بن قاسم کی فوج میں ہندو جاٹ شامل ہو کر لڑتے تھے۔ سی ساگر اول محمد بن قاسم کا مقابلہ کرتا ہے، اس کے بعد اُس کا وزیر اور خاص رازدار بنا دیا جاتا ہے۔ ایک طرف سے جے سیہ اور محمد علافی لڑ رہے ہیں تو دوسری طرف سے محمد بن قاسم کے ساتھ کاکا مقابلہ پر آ رہے ہیں۔ سندھ میں قدم رکھتے وقت محمد بن قاسم کے ساتھ صرف بارہ ہزار فوج تھی، مگر فتح ملتان کے وقت تک یہ پچاس ہزار ہو گئی۔ گویا اُس کے لشکر میں چھہتر[1] فیصدی ہندو شامل ہیں اور ہندوؤں کی بھی یہ حالت ہے کہ آج محمد بن قاسم کے مقابلہ میں لڑ رہے ہیں اور دوسرے دن مغلوب ہو کر جب ساتھ ہو جاتے ہیں تو مسلمانوں کے ساتھ پوری وفاداری اور جاں نثاری کرتے ہیں۔

اِن واقعات سے بجز اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ہندو ہوں یا مسلمان سب کے سب مذہبی تعصب سے پاک تھے، اور مذہب و سیاست دونوں چیزوں کو اپنے اپنے حدود کے اندر رکھتے تھے۔

مسلمانوں کا برتاؤ برہمنوں کے ساتھ

اب رہا محمد بن قاسم کا برہمنوں اور مندروں کے ساتھ برتاؤ، اُس کی نسبت اُس زمانہ کے ہندو مورخوں نے تسلیم کیا ہے کہ اُنھوں نے ہندوؤں کے مندر وغیرہ نہیں توڑے۔ زمانۂ قدیم میں عام خیال یہ تھا کہ ہر قوم کے دیوتا جنگ کے وقت اپنی اپنی قوم کو مدد دیتے ہیں۔ پس جب کوئی قوم فتح پاتی تو اُس قوم کے معبود کی طاقت دیکھ کر مفتوح قوم کے لوگ فاتح قوم کا مذہب اختیار کر لیتے۔ اسی کلیہ کے مطابق راجہ داہر کے مارے جانے پر جب ہندوستان کے لوگ مسلمان ہونے لگے تو محمد بن قاسم نے دوسرے روز اعلان کر دیا کہ جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے ہماری طرف سے کوئی تعرض نہ ہو گا۔ برہمن آباد فتح ہونے پر مندروں کے پجاری محمد بن قاسم کے پاس گئے اور کہا کہ ہندوؤں نے مسلمان سپاہیوں کے ڈر سے بتوں کی پوجا کے لئے مندروں میں آنا کم کر دیا ہے جس سے ہماری آمدنی میں فرق آ گیا ہے۔ مندروں کی مرمت بھی نہیں ہوئی۔ تم اُنھیں درست کرا دو اور ہندوؤں کو مجبور کرو کہ وہ مندروں میں آ کر پوجا کریں۔

---

[1] تاریخ آئینۂ حقیقت نما مصنفہ مولوی اکبر شاہ خاں صاحب۔
[2] تاریخ آئینۂ حقیقت نما مصنفہ مولوی اکبر شاہ خاں صاحب۔

یہ سُنکر خلیفہ سے بذریعہ خط کے استصواب کیا گیا۔ جواب آنے پر محمد بن قاسم نے اعلان کردیا کہ برہمنوں کے دان پُن۔ دکشنا۔ بھینٹ جس طرح پہلے دیتے تھے اب بھی دیں۔ اپنے مندروں میں آزادانہ پوجا پاٹ کریں۔ سرکاری مالگذاری میں سے تین روپیہ فی صدی برہمنوں کے لئے الگ خزانے میں جمع کیا جائے اِس روپیہ کو برہمن جس وقت چاہیں اپنے مندروں کی مرمت اور ضروری سامان کے لئے خزانہ سے برآمد کرسکتے ہیں۔ پھر سب سے بڑے پنڈت کو رانا کا خطاب دیکر ان کے امورمذہبی کا مہتمم اور افسر مقرر کردیا۔[1]

محمد بن قاسم اور اُس کے بعد مسلمان گورنروں نے سندھ میں مثل مساجد کے ہندوؤں کے مندروں کے لئے بھی بڑی بڑی جاگیریں وقف کیں۔

محمد بن قاسم کا اعزاز ان تمام باتوں کا اثر یہ ہوا کہ جب محمد بن قاسم چارسال ہندوستان میں رہنے کے بعد عرب کو بُلائے گئے تو شہر کیرج کے ہندوؤں اور بودھوں نے اپنے شہر میں اُن کا ایک مجسمہ (بُت) بناکر رکھا اور اُس کی پرستش شروع کی۔[2]

اُس کے واپس جانے کے چند روز بعد یہاں کے راجے خود مختار ہو گئے، اور کچھ دنوں کے لئے بغاوت ہو گئی۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ سرکشی کے زمانہ میں بھی مسلمانوں اور نومسلموں کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا گیا اور نہ نومسلموں نے اسلام ترک کرنے کا ارادہ کیا۔ برخلاف اس کے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے زمانہ میں راجہ جے سیہ بن داہر نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ اس زمانہ میں جابجا ہندو رُوسار سلطنت اسلامیہ کی طرف سے بسر حکومت تھے۔ تاہم ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سندھیوں نے اسلام قبول کیا۔

مسلمانان عرب کی خانہ جنگیوں میں ہندوؤں کی شرکت اُس زمانہ میں ہندو مسلمانوں میں اس قدر قریبی تعلقات قائم ہو گئے تھے کہ خاص عرب میں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں میں ہندو شریک ہوتے تھے، چنانچہ برہمنوں کا ایک خاندان اپنے کو اسی بنا پر حسینی برہمن کہتا ہے کہ بقول اُن کے اُن کے بزرگوں نے میدان کربلا میں سادات کا ساتھ دیا تھا۔

اسی طرح محض چند صدیوں کے اختلاط سے ہندو مسلمانوں کا تمدن ایک ہو گیا تھا، اور سندھیوں عراقیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کا لباس یکساں ہو گیا تھا۔[3]

ہندوؤں کی جنگی قابلیت محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی کے متعلق ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لکھا جائے جو اول الذکر کے پونے چارسو سال بعد ہندوستان میں آیا اور جس کے حملوں کا بڑا چرچا ہے۔ اُس وقت

[1] آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۹۷-۹۸
[2] آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۱۰۱
[3] آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۱۱۰
[4] آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۱۱۹

تک مسلمان جنوبی ہند، ساحل ملابار، کاٹھیاواڑ، بروچ میں آباد ہو چکے تھے، گویا ہندوکش سے لے کر راس کماری تک پھیل چکے تھے۔ وہ ریاستوں میں وزارت کے عہدوں تک پہونچ گئے تھے اور اپنے حکمرانوں کے ساتھ ہر حملہ آور کے مقابلہ میں لڑتے تھے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ اُس زمانہ کے متعلق ایک غلط خیال یہ ہے کہ مسلمان دور دراز ممالک کے رہنے والے اور غیر معمولی قسم کے خوفناک انسان تھے جو ہندوستان پر چڑھ چڑھ کر آتے اور اُسے تہ و بالا کرتے رہتے تھے۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے ہندو ہوں یا مسلمان سب اپنے کو ایک چہار دیواری کے اندر محدود اور بے دست و پا پاتے ہیں، اور اس قدر کمزور اور بزدل ہو گئے ہیں کہ وہ خود اپنے ملک میں افغانی تو بڑی چیز ہیں معمولی قسم کے آوارہ گرد پردیسیوں تک سے ڈرتے ہیں۔ ان حالات میں یہ یقین آنا مشکل ہے کہ کسی زمانہ میں خود ہندوستان کے لوگ افغانیوں اور ترکوں پر چڑھ کر جاتے ہوں گے، حالانکہ یہ تاریخی واقعات ہیں کہ ہندو برابر اُن اقوام کے دوش بدوش یا اُن کے مقابلہ میں بڑی مردانگی سے لڑا کرتے تھے، اور کیوں نہ لڑتے جبکہ ہندوستان کی حدود ایران اور افغانستان تک پھیلی ہوئی تھیں، اور قندھار اور مکران جو اب افغانستان اور ایران میں واقع ہیں ہندوستان کے اندر داخل تھے، اور کبھی مسلمان بادشاہوں اور کبھی ہندو راجاؤں کے زیر حکومت رہتے تھے۔ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی زیادہ تر قومیں وسط ایشیا سے آئی ہوئی تھیں، عادات و اطوار تقریبًا ایک تھے، آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، جب اَن بَن ہوتی تھی تو ایک دوسرے پر دھاوے بھی ہوتے تھے مگر وہ دھاوے ایسے تھے جیسے کہ پچھلی صدی میں سکھوں کے مغلوں پر مرہٹوں کے مرہٹوں پر، اور یہ سب کچھ سیاسی ضرورتوں کے تحت میں ہوتا تھا نہ کہ مذہب کے، جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر لڑائی میں دونوں طرف سے ہندو اور مسلمان ملے جلے ہوتے تھے، اور بعض وقت تو یہ لڑائیاں دو حقیقی بھائیوں اور باپ بیٹوں کے درمیان ہوتی تھیں۔ اگر سلطنت اور مذہب لازم ملزوم ہوتے تو اس وقت سب سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی صوبۂ متحدہ میں ہونی چاہیئے تھی جہاں صدیوں تک ان کا دار السلطنت رہا۔ مگر حالت اس کے برعکس ہے اور صوبۂ متحدہ میں صرف چودہ فی صدی مسلمان ہیں۔

غزنویوں کے حالات یہاں پر ہم چند واقعات غزنویوں اور راجہ جے پال کے باہمی جنگ و جدال کے متعلق لکھتے ہیں جن کے مفتوحات کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کی باہمی لڑائیاں کہاں تک مذہبی اختلاف پر مبنی تھیں۔ امیر ناصر الدین سبکتگین غزنی کا حاکم تھا اور راجہ جیپال پنجاب کا راجہ تھا۔ امیر ناصر الدین طوس کے قریب خانہ جنگیوں میں مصروف تھا۔ جیپال نے جس کے دل میں بھی ملک گیری کا جذبہ تھا سبکتگین کو ترددات میں مبتلا دیکھ کر غزنی کی طرف پیش قدمی کی۔ سبکتگین کو جب

اس حملہ کا حال معلوم ہوا تو وہ اپنے بیٹے محمود کے ساتھ غزنی لوٹ کر آیا اور جے پال کی فوجوں سے لڑا۔ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اُس وقت جے پال کا پلّہ بھاری تھا اور اُس کی فتح یقینی تھی مگر غزنی میں شدت کے ساتھ برفباری ہونے لگی اس لئے ہندوستان کی فوج کو وہاں سے پسپا ہونا پڑا۔ یہ جنگ بقول مورخ سجان رائے غزنی میں ہوئی، جیپال نے اُس وقت مجبور ہوکر سبکتگین سے صلح کرلی اور اُس کے آدمی اپنے ساتھ یہ کہہ کر دارالسلطنت لاہور میں لایا۔ کہ اُن کے ہاتھ اپنا تدرانہ بھیجے گا۔ مگر بقول مورخین اُس نے بدعہدی کی، اس بدعہدی کے بعد سبکتگین اور جے پال کے درمیان ایک مستقل بنار مخاصمت قائم ہوگئی۔ جس کی وجہ سے سبکتگین کی وفات کے بعد محمود اور جیپال کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر چونکہ غزنویوں اور تاتاریوں کے درمیان بھی جنگ کا مستقل سلسلہ جاری تھا۔ اس لئے سلطان محمود بالعموم موسم گرما میں وسط ایشیا میں مصروف بہ پیکار ہوتا تو موسم سرما میں راجگان ہند سے۔ اور چونکہ یہ لڑائیاں خالص سیاسی تھیں اور مذہبی یا قومی نہ تھیں، اس لئے ایک طرف سرحد کے مسلمان راجہ جیپال کے ساتھ ہوکر سلطان محمود کے خلاف لڑتے تھے تو دوسری طرف محمود کی ہندو فوجیں راجاؤں کے خلاف لڑتی تھیں۔ چنانچہ شیخ حمید راجہ جیپال کی فوج کا کمانڈر تھا، برخلاف اس کے کوٹ کی لڑائی میں قلعہ بھیم کا ہندو راجہ محمود کے ساتھ تھا، اور اس لڑائی کے بعد دس ہزار ہندو محمود کی فوج میں داخل ہوئے جن کا سپہ سالار سوہندرائے تھا۔ اسی طرح تھانیسر کی لڑائی میں محمود کے ساتھ بارہ ہزار ہندو تھے۔ جب قنوج، مہابن اور برن (بلند شہر) پر فوج کشی ہوئی تو راجہ کشمیر برابر سلطان محمود کی رہبری کررہے تھے۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ مشہور سومنات کی لڑائی میں سمندر کی طرف سے جو حملہ کیا گیا اُس میں ہندو سپاہی کشتیوں پر سوار تھے۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ اُس زمانہ کے ہندو نہ کمزور تھے اور نہ بزدل اور نہ بے حمیت، جو اپنے مذہب کے خلاف محمود کے ساتھ ہو جاتے بلکہ جرأت، مردانگی اور فراخ دلی میں ترک مسلمانوں کے جوڑ کے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی مختلف قومیں آپس میں تو ایک دوسرے سے تعصب رکھتی تھیں مگر ہندوؤں سے کوئی تعصب نہ رکھتا تھا۔ مثلاً محمود غزنوی نے افغان کو کبھی اپنی فوج میں داخل نہیں کیا۔ اسی طرح علاؤالدین نے کسی ترک کو فوج میں گھسنے نہیں دیا۔ مگر ان دونوں نے بے دریغ اپنی فوجوں میں ہندوؤں کو نہ صرف بطور سپاہیوں کے بلکہ بطور افسروں اور جرنیلوں کے رکھا اب رہا ہندوؤں کے ساتھ سلطان محمود کا برتاؤ، اس کی نسبت ہم زیادہ کہنا نہیں چاہتے کیونکہ اس موقع پہ سلطان محمود کی حمایت کرنا ہمارا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اُس زمانہ کی لڑائیاں مذہبی

یا قومی نہ تھیں۔ اس کی تائید میں مورخ الفنسٹن کا ایک قول نقل کر دینا کافی معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سلطان محمود نے ایک ہندو کو بھی مسلمان بنایا ہو، اور سوائے لڑائی کے کسی ہندو کو قتل کیا ہو"

سلطان محمود کے بعد اُس کا جانشین سلطان مسعود ہوا۔ اُس کے بڑے عہدے دار اور درباری ہندو بھی تھے۔ جب اُس کے نائب احمد نیالتگین نے سرکشی کی تو تمام مسلمان درباریوں کو چھوڑ کر سلطان مسعود نے ایک ہندو سردار تلک نامی کو متعین کیا جس نے احمد مذکور کو شکست دی، اور قتل کیا۔ پھر اسی تلک نے سلطان مسعود کی طرف سے راجہ ہانسی کے خلاف لڑ کر قلعہ ہانسی فتح کیا۔ ایک طرف تو ہندو مسعود کی جانب سے ہندوستان میں لڑ رہے تھے، دوسری طرف پالنسو ہندو سرخس میں سلجوقیوں کے خلاف مسعود کی طرف سے مصروف بہ پیکار تھے۔ اس لڑائی میں سلجوقیوں سے شکست کھا کر سلطان مسعود نے ارادہ کیا کہ وہ اپنا دارالسلطنت غزنی سے ہٹا کر لاہور کر دے، اس کے لئے اُس نے تین ہزار اونٹ سونے چاندی اور جواہرات کے لادے، اور تمام اُس خزانہ کو ہندو فوج کے ساتھ لاہور کو روانہ کیا، جو بالآخر جہلم کے کنارے آکر لوٹ لیا گیا۔ پس اُس زمانہ میں ہندوستان کے کسی صوبہ کا روپیہ غزنی جانے یا غزنی کا روپیہ کسی دوسرے صوبہ میں جا کر لُٹ جانے کے معنی یہ نہ تھے کہ وہ روپیہ ہندوستان سے باہر چلا گیا، یا باہر کا روپیہ ہندوستان میں آیا۔ حقیقت کے اعتبار سے اُس زمانہ میں یہ بے معنی الفاظ تھے۔

اور غزنویوں کے بعد جبکہ مسلمان بادشاہوں کا دارالسلطنت غزنی سے ہٹ گیا تو مسلمان فاتحوں کے غیر ملکی ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہا۔ وہی غزنی جس کو اس زمانہ میں مسلمانوں کے تعصب اور مذہبیت کا مرکز قرار دے رکھا ہے، اُس پر وہ وقت بھی گذر گیا ہے جبکہ بہرام شاہ ہندو راجاؤں اور ٹھاکروں کی فوج ساتھ لیکر غزنی پر چڑھائی کرتا ہے، اور جب شہر پر اُس کا قبضہ ہو جاتا ہے تو علاء الدین حسن غوریوں کا لشکر بہرام شاہ کے خلاف لاتا ہے، اُس میں ہندو فوجیں بھی غزنی کی حفاظت کے لئے بہرام شاہ کی طرف سے لڑتی ہیں۔ مگر علاء الدین حسن کامیاب ہوکر غزنی میں سات شبانہ روز قتل کا بازار گرم کر کے شہر میں آگ لگا دیتا ہے اور غزنوی سلاطین کے مقبروں کو اُدھیڑ کر اُن کی لاشوں اور ہڈیوں کو نکلوا کر آگ میں جلا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے علاء الدین کو جہاں سوز کا لقب ملتا ہے، اور وہ کامیابی کے بعد ایک فخریہ نظم لکھتا ہے۔

مگر غوریوں کے بعد جس قدر حملے ہندوستان کی سلطنت پر ہوئے وہ دراصل غلام خاندان،

لجیوں، تغلقوں، سیدوں، لودیوں پر تھے۔ اور یہ سب کے سب مسلمانوں کے خاندان تھے۔ حتیٰ کہ سب سے اخیر میں مغل غالب آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب حملے سراسر سیاسی تھے اور مذہبی تعصبات سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اُس زمانہ کی لڑائیوں کی خصوصیت یہ تھی کہ صرف بادشاہوں میں لڑائی ہوتی تھی اور اُس کا اثر رعایا پر کچھ نہ پڑتا تھا۔ بادشاہ یکے بعد دیگرے جاتے اور آتے تھے، اور سوسائٹی کا نظام بدستور قائم رہتا تھا۔ اِن سب بادشاہوں کا اور بالخصوص مغلوں کا جو برتاؤ اہل ہند کے ساتھ رہا ہے اُس کی تفصیل اگر یہاں کی جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں گے۔ صرف نمونہ کے طور پر بابر کا وصیت نامہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو اُس نے اپنے بیٹے ہمایوں کے حق میں یکم جمادی الاول ۹۳۵ھ مطابق ۹۔۲۰ جنوری ۱۵۲۹ء بمقام دھولپور بزبان فارسی لکھا تھا۔ اُس کا ضروری اقتباس اُردو میں حسب ذیل ہے:۔

"استحکام سلطنت کے مدنظر تحریر ہے کہ اے میرے فرزند ہندوستان مذاہب مختلفہ سے بھرا پڑا ہے۔ الحمدللہ کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے ان سب پر تمہیں بادشاہی عطا فرمائی۔ تمہیں لازم ہے کہ اپنے دل کو ہر قسم کے مذہبی تعصبات سے خالی کر کے ہر قوم کے طریق کے مطابق عدل و انصاف کرو۔ اپنی بادشاہی کے اندر کسی قوم کے عبادت گاہوں کو خراب مت کرنا، اور ایسا انصاف کرنا کہ بادشاہ رعیت سے اور رعیت بادشاہ سے خوشحال ہو جائے۔ اسلام کی ترقی تیغ ظلم کے بجائے تیغ احسان سے بہتر ہے۔ اہل سنت اور شیعہ کے مناقشات سے بھی چشم پوشی کرنا، کیونکہ اختلاف ضعف اسلام کا باعث ہے۔ مختلف العقیدہ رعایا کو اربعہ عناصر کی طرح متحد کر دو تاکہ سلطنت کا جسم امراض مختلفہ سے محفوظ رہے[1]۔"

یہ امر کہ بابر کی اولاد نے اُس کے وصیت نامہ پر عمل کیا، اس سے ظاہر ہے کہ مغل بادشاہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ تقریباً تین سو سال تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔

رُباعی

ہر چند شکارِ درد و حرماں ہوں میں
صحت نے کہا کہ عین راحت ہوں میں
اُلفت سے کہا جو میں نے تو بھی کچھ کہہ
تو اُس نے یہی کہا کہ اُلفت ہوں میں

ادیب لکھنوی

---

[1] تاریخ کا روشن پہلو از محمد دین فوق صفحہ ۲۱

صبحِ وطن

(از پنڈت اندرجیت شرما، ماچھرہ ضلع میرٹھ)

غیب کے پردے سے جس وقت نکل آتی ہے — نور برسا کے شبِ تار پہ چھا جاتی ہے
گلشنِ ہند کی ہر بزم کو گرماتی ہے — دلِ بیمار کو پیغامِ شفا لاتی ہے
محو ہو جاتا ہے ہر ذرّہ ضیا باری پر
دل تڑپ اُٹھتے ہیں سب نغمۂ بیداری پر

ترے دیدار سے ہو جاتی ہیں آنکھیں روشن — نور سے تیرے چمک اُٹھتا ہے ایوانِ کُہن
کاہ کیا کوہ بھی ہو جاتے ہیں سرگرمِ سخن — وجد میں جھومنے لگتے ہیں جوانانِ چمن
شور ہوتا ہے ترا دَیر میں بُت خانے میں
رنگ کھلتا ہے ترا جام میں پیمانے میں

غنچۂ دل کو کھلاتی ہیں ہوائیں تیری — مست کر دیتی ہیں روحوں کو نوائیں تیری
خفتہ بختوں کو جگاتی ہیں فضائیں تیری — گھر بنا لیتی ہیں آنکھوں میں ادائیں تیری
کلفتِ زیست مٹا دیتے ہیں تیرے منظر
یادِ جنّت کی بھلا دیتے ہیں تیرے منظر

جس میں تیرا نہ گذر ہو کوئی گلزار نہیں — تیرا جلوہ نہ ہو جس پر کوئی کہسار نہیں
کونسی بزم ہے جس میں تو ضیا بار نہیں — تو نہیں ہے تو کہیں گرمیِ بازار نہیں
زینتِ صحنِ چمن ہے ترے دم سے باقی
نغمۂ حُبِّ وطن ہے ترے دم سے باقی

تیرا ہی جوش ہے ذرّوں کا تلاطم کیا ہے — تیرا ہی حسن ہے پھولوں کا تبسم کیا ہے
تیرا ہی ذکر ہے کلیوں کا تکلم کیا ہے — تیرا ہی راگ ہے چڑیوں کا ترنم کیا ہے
یہ صبوحی میں جو مشغول ہیں پینے والے
نظر آتے ہیں ترے جام کے سب متوالے

آسماں پر جو ترا روئے دُلارا چمکا ۔۔۔ گھاٹ گنگا کا تو جمنا کا کنارا چمکا
بے نواؤں کا غریبوں کا سہارا چمکا ۔۔۔ مادرِ ہند کی قسمت کا ستارا چمکا
نگہِ لطف سے سب غمزدہ دل شاد ہوئے
غیر آباد جو جنگل تھے وہ آباد ہوئے

ہم نے ہر حال میں اپنا تجھے رہبر پایا ۔۔۔ خار پر ہاتھ جو ڈالا تو گل تر پایا
آنکھ سے ٹپکے ہوئے اشک کو گوہر پایا ۔۔۔ جب کھلی آنکھ ترا سامنے منظر پایا
درد میں دُکھ میں کبھی ساتھ نہ چھوڑا تو نے
خدمتِ خلق سے منھ ہی نہیں موڑا تو نے

تیرے ہی فیض سے معمور ہے دامانِ وطن ۔۔۔ رشکِ جنت ہے ترے نور سے میدانِ وطن
ہے تو ہی روحِ وطن اور تو ہی جانِ وطن ۔۔۔ خاک میں دیکھ نہ مِل جائے کہیں شانِ وطن
باغِ ہستی میں ترے دم سے بہار آئی ہے
تجھ پہ سو جان سے قرباں دلِ سودائی ہے

کھنچ گئی دل پہ ترے نقشِ وفا کی تصویر ۔۔۔ دمِ عیسیٰ ہے ہمیں تیری ہوا کی تاثیر
چھوڑ کر اب تجھے ہوں کس سے بھلا دامنگیر ۔۔۔ تو ہی تدبیر ہماری ہے تو ہی ہے تقدیر
زندگی بھر نہ چھٹے ہاتھ سے تیرا دامن
بعد مرنے کے مِلے تیرے ہی سایہ کا کفن

اے کشورِ ہندوستاں!

اے خلد سے لائی ہوئی رنگیں بہاروں کے وطن
کوثر ہے جن میں موجزن، اُن آبشاروں کے وطن
نازاں ہے جن پر ایشیا اُن کوہساروں کے وطن
بے کیف تیرے سامنے افسانۂ باغِ جناں
اے کشورِ ہندوستاں
اونچا رہے تیرا نشاں

روش صدیقی

شاہراہ مجاہد (بہاول)

اداکاری

(از منشی جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی بی-اے-ایل ایل-بی)

فنِ رقص کی طرح اداکاری کی ابتدا بھی اس عہد قدیم کی رہینِ منت ہے جبکہ نطق زبان والفاظ کے استعمال سے ناآشنا ہونے کے باوجود بیتاب تکلم تھا، لیکن ابھی اس رنگین فن نے نقالی کی حدود سے تجاوز نہ کیا تھا، نہ اس میں وہ صلاحیت پیدا ہوئی تھی کہ بیک جنبش دل کی گہرائیوں میں گدگدی پیدا کر کے روح پر وجدانی کیفیت طاری کردے، تاہم وہ ظہور وشہود کی ساعتِ اولین ہی سے محتاج اثر نہ تھی اس اعتبار سے اداکاری کے نقوش اولین فنونِ لطیفہ کی صف میں جگہ پانے کے مستحق قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

ظاہر ہے کہ ہر فن کا مخزن ومولد فطرت ہے، اور نقالی بھی اپنی وسعت وہمہ گیری کے لحاظ سے فطرتِ بشری کے مطابق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روزِ ازل ہی سے نقالی کی قدرت انسانی خمیر میں ودیعت ہوئی ہے۔ بہر حال اداکاری کے ابتدائی مدارج اور انتہائی عروج کے پیشِ نظر اس فنِ لطیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(۱) نقالی،

(۲) اصل کاری

نقالی سے مراد یہ ہے کہ اداکار اپنی عضلاتی حرکتوں اور جنبشِ اعضاء کی وساطت سے کسی شے کی ہو بہو نقل یا تصویر اُتار کر دکھا دے۔ لیکن اصل کاری کا درجہ اس سے بلند تر ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس میں نقالی کے ساتھ ساتھ مادۂ تخلیق سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر نقالی کا جسمانی حرکات وسکنات سے تعلق ہے، اور اصل کاری روحانیات سے وابستہ ہے۔ نقالی میں وجدانی کیفیات اور جمالیات کا عنصر اصل کاری کی بہ نسبت اس قدر قلیل ہوتا ہے کہ اس سے خلاقی کا جوہر یک لخت معدوم ومفقود ہو جاتا ہے۔ اور وہ شانِ خود نمائی مترشح نہیں ہوتی جو اصل کاری کا حصہ ہے۔

ابھینے یا اداکاری ناٹک کا جزو لاینفک ہے۔ یہ ثابت ہے کہ "نرتیہ ناٹک" ہندی ناٹکوں کی ابتدائی صورت ہیں۔ ان میں "درو راگ" کے تتبع میں جو ناچ مستعمل ومروج تھے وہ منسلکہ ومتعلقہ گیتوں کی حرف بحرف

ترجمانی کرتے تھے۔ مغنیہ کی لَے کے زیر اثر رقاصہ راگ کی تشکیل کے ساتھ ساتھ جذبات کا اظہار ابھینے یا تباوہ کی خاموش زبان میں کرتی جاتی تھی۔ لیکن ابھینے کے ساتھ رقص کا ہونا لازمی تھا۔ اس طرح ناچ تو ابھینے سے آزاد تھا، مگر ابھینے یا تباوہ ہر حالت میں ناچ کا پابند تھا۔

اگر رقص کی معینہ حرکات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تباوہ خود رقص ہی کا ایک جزو ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اداکاری کی ابتدا رقص کی رہین منت ہے۔ ہند قدیم کے "چھایا ناٹک" عام ناٹکوں کے پیشرو تسلیم کئے جا چکے ہیں۔ "کٹھ پتلی کا ناچ" ان کا دوسرا نام ہے۔ کٹھ پتلی کے ناچ یا چھایا ناٹک میں اداکاری کی تمام ابتدائی خصوصیات موجود ہیں۔ اور فنی نقطۂ نگاہ سے نقالی کا بہترین نمونہ ہیں۔ فنِ رقص کی ترقی کے دوش بدوش نرتیہ ناٹک کُومّی (कुम्मी) کیکوتکلی (कैकोत्तकली) اور کتھاکلی وغیرہ ناچ عرصۂ ظہور میں آئے جو آگے چل کر اصطلاحی ناٹکوں کا سنگِ بنیاد بن گئے۔

نرتیہ یا رقص کے ذریعہ "شر دیہ کاویہ" بھی "درشیہ کاویہ" بنجاتا ہے اور سامعہ کی بجائے باصرہ پر اثرانداز ہوکر فردوسِ گوش کو جنتِ نگاہ بنا دیتا ہے۔ رقص کی غیر معمولی رفعتوں نے ابھینے یا اداکاری کو اپنے مخصوص انداز میں مقید کر لیا تھا، اور اس پر بیشمار پابندیاں عائد کردی تھیں۔ شدہ شدہ یہ اصولی پابندیاں اتنی بلند و باریک ہوتی گئیں، اور فن رقص اس درجہ ادق ہوگیا کہ ہر شخص اُسے کامیابی کے ساتھ اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہ بنا سکا، اس لئے اس سے اداکاری یا تباوہ کا فن اخذ کیا گیا۔

نرتیہ ناٹکوں تک تو ان قیود کی پابندی قائم و برقرار رہی، لیکن اصطلاحی ناٹکوں کے آغاز کے ساتھ ساتھ ان کا شیرازہ ایسا منتشر ہوا کہ اصول اور معیار فن کا سارا طلسم چشم زدن میں ٹوٹ کر رہ گیا اور اداکاری نے نہ صرف ایک جداگانہ فن کی حیثیت اختیار کرلی بلکہ وہ اصل کاری سے بھی ہمدوش ہوگئی۔ اس طرح ابھینے (اداکاری) رقص سے مطلق آزاد ہوگیا۔ اب جو ناٹک مروج ہوئے ان کی تصنیف کا اصل مقصد اصل کاری قرار پایا۔ چنانچہ گونگے سوانگوں اور خاموش مظاہروں سے ان کا آغاز ہوا، اور جب اصطلاحی ناٹکوں کا دَور دَورہ ہوا تو یہ فن انتہائے کمال کو جا پہنچا لیکن راگ ناٹکوں کی تخلیق سے اس کی تمام تر رفعتیں معرض زوال میں آگئیں۔ اور اداکاری سے نقالی کا جو عنصر خارج کر دیا گیا تھا پھر عود کر آیا۔

راگ ناٹک صرف تباوہ تک ہی محدود تھے رقص سے بالواسطہ انھیں کوئی تعلق نہ تھا، لیکن چونکہ راگ ناٹکوں میں زبان کا استعمال بھی ہونے لگا تھا اس لئے اداکاری بھی پستی کی جانب

مائل ہو چلی۔ زبان کے استعمال سے اداکار کی توجہ منقسم ہو جاتی ہے اور اس کی حرکات و سکنات میں وہ دلپذیری و جاذبیت باقی نہیں رہتی جو خاموش اداکاری کی لگاوٹوں کی جان ہے۔

رقص میں ابھینے یا اداکاری کا مظاہرہ حسبِ شان کے ساتھ ہوتا ہے اور نظر نوازی کا جو سامان رقص فراہم کرتا ہے وہ محض اداکاری کی دسترس سے باہر ہے۔ جہاں تک ابھینے (اداکاری) کا تعلق ہے رقص اسے اپنے مخصوص انداز میں دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ رقص موسیقی، مصوّری اور شاعری کا حسین مجموعہ ہے لیکن اداکاری میں مصوّری کے زیرِ اہتمام شعریت کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی رقص تصنع کی گرفت سے اتنا آزاد نہیں ہے جتنا کہ ابھینے (تباوہ) اصولی طور پر ہے یا ہو سکتا ہے۔ اداکاری نسبتاً حقیقت سے قریب تر ہے۔ اس لحاظ سے اُسے فنِ رقص پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن وہ جن پست اور اسفل جذبات کی مظہر ہے رقص کا اُن سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ عشق و شیفتگی کی جو بے پناہ عریانی اس کا خاصّہ ہے، اس سے رقص فطری طور پر محترز ہے۔ اداکاری دنیائے مجاز کا مخصوص حربہ ہے مگر رقص ہمہ تن روحانی بلندیوں سے ہمدوش ہے۔ وہ سراپا تجلّی ہے سقم و سوقیت سے بیگانہ۔ اداکاری حُسن ہے مگر بے نیازِ حجاب، عریانی سے مملو، سحر کاری رقص کا حصہ ہے اور حسن کاری اداکاری کا طرۂ امتیاز دونوں در اصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ لیکن دونوں الگ الگ اور ایک دوسرے سے دُور دُور۔

اداکاری کا میدان وسیع تر ہے اور وہ رقص کی طرح لَے اور تال کی پابندیوں سے قطعاً آزاد ہے اس وسعت و ہمہ گیری کے باوجود اس پر عامیانہ رنگ غالب ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کرنا اور احساسات و جذبات کی لامحدود گہرائیوں کی تشکیل و تخلیق اس کا اہم فریضہ ہے اداکار اپنے جسم کو اس طرح متحرک کرتا ہے کہ محسوسات کی ایک لطیف دنیا کیفیتِ مجسّم بن کر آنکھوں کے سامنے بھر جاتی ہے اور درد و مسرّت کا ایک بے پایاں سمندر متشکّل و متحرک ہو کر روح کی پہنائیوں میں ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔

انسانی جذبات کی دنیا جوش و غضب، نفرت و پسندیدگی، کلفت و مسرّت، درد و آسودگی، عجز و تکبّر، ترحم و تفکّر، اضطراب و اطمینان، فکر و آسودگی، غفلت و بیداری، شعور و بدحواسی، طلب و تقاضہ تکرار و محبّت، رونے اور ہنسنے کے مختلف پہلوؤں کی وسیع حدود میں پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن ہمارے جذبات میں خواہ وہ کسی نوع کے کیوں نہ ہوں رنج یا خوشی کا احساس مضمر رہتا ہے۔ اداکاری انھیں جذبات کو اُبھارتی ہے اور معیّنہ عضلاتی حرکات کی مدد سے روح میں ایک خاص ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔

اداکار سر، ہاتھ، پیر، چہرہ، اور آنکھوں کی مدد سے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے مطالب

کی ادائیگی میں زبان کا بھی سہارا لیتا ہے، لیکن جو کام آنکھیں کرتی ہیں وہ کسی دوسری طرح ممکن نہیں۔ آنکھوں سے تشکّر و اطمینان، محبت و عقیدت، اضطراب و عذاب، غیض و غضب، نفرت و حقارت، غم و مسرت، جوش و سکون، اور صبر و استقلال غرض ہر وہ راز عیاں ہو جاتا ہے جو اداکار کے دل میں نہاں ہو۔ لیکن دل پر قابو پانا آسان ہے، آنکھوں پر اقتدار حاصل کرنا دشوار ہے۔

بلحاظ فن اداکاری نہایت اہم اور دشوار مشغلہ ہے، جہاں ایک ہی جذبہ کے اظہار کے مختلف ذرائع ہیں وہاں متضاد محسوسات کی نمود و نمایش کا ایک ہی طریق بھی ہے۔ مثال کے لئے یوں سمجھیئے کہ اظہار غم و ہمدردی کے لئے بھی آنسو بہائے جا سکتے ہیں، اور انتہائی جوش و مسرت کے باعث بھی آدمی رونے لگتا ہے۔ آنکھوں سے بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے اور انگلی سے بھی۔ اقرار و انکار کے لئے زبان بھی ہلائی جا سکتی ہے اور سر بھی، اب یہ اداکار کا کام ہے کہ اس کی حرکات و سکنات میں ایسی موزونیت ہو کہ جس سے مطلوبہ جذبہ کا درست اظہار ہو سکے، اور اس کی روح کا پیغام سمجھنے میں دیکھنے والوں کی غلط فہمی کا امکان و اندیشہ نہ رہے۔ اور وہ اپنے عمل میں اس طریقۂ کار کا انتخاب کرے جو تناسب واقعات کے اعتبار سے برمحل و مناسب ہونے کے علاوہ سب سے زیادہ موثر اور جاذبِ توجہ ہو۔

اداکار کا فرض اولین ہے کہ وہ کسی جذبہ کی تشکیل و ترجمانی سے پیشتر یہ معلوم کرلے کہ اس کے بنیادی تاثرات کیا ہیں۔ آیا اُس کا جذبہ رنج سے ملحق ہے یا خوشی سے قریب تر؟ مثلاً رحم و ہمدردی کے آنسوؤں میں بےچینی مستور ہوتی ہے اور مسرت کے آنسوؤں میں سکون و امید۔ اسی طرح نفرت و حقارت میں اُلجھن و انقباض اور پسندیدگی میں خوشی و اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ جب وہ یہ معلوم کرلے گا کہ تو پھر وہ احساسات کے امتیازات کو بآسانی واضح کر سکے گا۔ اس لئے اداکار کا ذکی الحس ہونا ضروری ہے اور حصولِ کامیابی کے لئے ذہنیات کا ادراک لابدی۔

"بھرت نے ناٹیہ" سے اوستھانوکیرتیہ ناٹیم (" अवस्थानुकृति: नाट्यम ") یا ذہنی کیفیات اور مزاجی تبدیلیوں کی ایسی جیتی جاگتی مصوّری مراد لی ہے جو بھاؤ [محسوسات) (भाव)] راگ تال ترنگ، ترنم اور تغزل سے ہمدوش ہو۔

ہم پیشتر لکھ چکے ہیں کہ بھرت ناٹیہ شاستر کے نزدیک ناچ دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) ناٹیہ، اور (۲) اناٹیہ

پہلی قسم کے ناچوں میں اداکاری اور بتاوہ پیش پیش ہوتا ہے اور دوسری نوع کے رقص بتادے

سے عاری ہوتے ہیں، اور ان کا مقصد لَے (लै) کی تشکیل اور لطیف جسمانی حرکات کے ذریعہ حسن کاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کتھک ناچ ادنیٰ درجہ کا ناٹیہ نرتیہ مانا گیا ہے۔ اسمیں اداکاری کا درجہ بہت پست ہوتا ہے۔ پس معیاری اداکاری میں ناٹیہ کی تمامتر خصوصیات کا موجود ہونا ضروری ہے۔

بھرت نے ناٹیہ کو دو حصّوں میں منقسم کیا ہے: (۱) روپک (۲) اُپ روپک۔

روپک (रुपक) سے واکیارتھ ابھینے (वाक्यार्थ अभिनय) یا رس ابھینے اور اُپ روپک (उप रुपक) سے پدارتھ ابھینے یا بھاؤ ابھینے" مراد لی گئی ہے۔ روپک میں زبان کا استعمال ناگزیر ہے اور اُپ روپک میں بھاؤ یا محسوسات کو ترجیح حاصل ہے۔ ناٹیہ شاستر میں ابھینے کی چار قسمیں گنائی گئی ہیں۔

(۱) واچیکا वाचिका یا تقریر

(۲) ستویکا सत्तविका یا محسوسات کی عضلاتی تشکیل

(۳) انگیکا۔ اور अङ्गिका یا جسمانی نقل وحرکت۔

اور (۴) اہریا अहरिया یا میک اَپ (تبدیل ہیئت)

رقص کے لئے جیسا کہ ظاہر ہے واچیکا اور اہریا کی اصولاً کوئی حاجت نہیں ہے۔

نرت کو ناٹیہ شاستر نے اداکاری کا جزو لطیف مانا ہے۔ ادنیٰ قسم کے ناچ (اناٹیہ) نرت کہلاتے ہیں بتاوے میں ہست ابھینے (हस्य अभिनय) یا مُدرا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہاتھوں کی توڑ مروڑ سے ارتھ (अर्थ) یا تخیلات اور مادّی اشیاء کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ یہی مُدرا اجنٹا کے غار خصوصاً غار نمبر ۱ اور نئی دہلی کے قلعہ کی جدید مصوری کی جان ہے، جو نندلال بوس، وینکٹ اپّا، شارداُ اُکیل اور اسِت ہالدار کے اعجاز قلمکاری کی رہین ہیں۔

بھرت نے بھی اداکاری کا بہترین ذریعہ آنکھ ہی کو مانا ہے، محسوسات سب سے پہلے آنکھ ہی سے ترشح ہوتے ہیں۔ پھر جسم کے مختلف حصص پر ان کا اثر پڑتا ہے، اور جسمانی نقل وحرکت سے ان کی تشریح ہوتی ہے۔

آنکھوں سے تینتیس ۳۳ ویبھ چاری بھاؤ (वीभचारी भाव) یا عام جذبات اور نو ۹ استھائی بھاؤ (स्थायी भाव) یا مخصوص جذبات نمایاں ہوتے ہیں جو دیکھنے والے کے دل میں رس یا کیفیات کی لہریں موجزن کردیتے ہیں۔

آنکھوں کے علاوہ چہرے کے دوسرے حصّے مثلاً رخسار، ابرو، ناک، ہونٹ وغیرہ سے بھی

ام لیا جاتا ہے، ریچیکا (रेचिका) یا گردن اور کمر کے اوپر کے حصۂ جسم کی حرکت سے بھی نمود جذبات
یں مدد لیجاتی ہے۔ بھرت کے نزدیک انگیکا ابھینے (आङ्गिका अभिनय) یا عضلاتی نقل و حرکت
ین طرح کی ہوتی ہے:۔

(۱) چہرہ کا عمل،

(۲) عام جسمانی حرکات،

اور (۳) آنا جانا، اُٹھنا بیٹھنا، وغیرہ

رقص میں جسم کے حسب ذیل چھ انگ (अङ्ग) یا حصوں سے کام لیا جاتا ہے:۔

(۱) سر، (۲) ہاتھ، (۳) کولا، (۴) کمر، (۵) پیر، (۶) بغل اور سر سے سینہ تک کی ہیئت انسانی،
ان کے معاون یہ چھ اُپ انگ (उपअङ्ग) ہوتے ہیں:۔

(۱) آنکھ، (۲) ناک، (۳) ابرو، (۴) رخسار، (۵) ہونٹ، (۶) اور زنخدان۔ ان کا تعلق چہرے
کے بناؤ بگاڑ سے ہے، اور مُدرا کا شریرا ابھینے (शरीर अभिनय) سے۔ اداکاری میں
اُپ انگ کا درجہ پہلا ہے اور رقص میں دوسرا۔ بھرت نے ایک اشلوک میں کہا ہے:۔

"گلے سے راگ نکلتا ہے، پیر سے تال بتائی جاتی ہے، آنکھوں سے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور ہاتھوں
سے ماسوا کی تشکیل کی جاتی ہے۔"

قدیم سنسکرت ادب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موہنی اتّم، اور بینایک کو ٹوبا ابھینے نرتیہ
بہت پُرانے ناچ ہیں۔ رگ وید سے لیکر والمیک اور ویاس تک کی تصانیف میں ان کا تذکرہ مدفون ہے
گووند دکشت نے سنگیت سُدھا (सङ्गीत सुधा) میں لکھا ہے کہ دھروپد کی طرح "کیش گان"
ویتھی ناٹک کا سنگ بنیاد تھے۔ ویتھی ناٹک دراصل راگ ناٹکوں ہی کی ایک قسم ہے۔ دکن میں جب
ان کی دھوم ہوئی تو لوگ کُھلم کُھلا بھرت اور نندیشور کے معینہ اُصولوں سے انحراف کرنے لگے۔ اس طرح
پدارتھ ابھینے کے طریق کار میں غیر معمولی اختلاف ہوتا گیا۔ ناٹیہ شاستر کے باب نہم میں اداکاری کے
نکات پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔ شلپ آدی کرم اور ابھینے درپن نے بھرت کے فرمانوں کی توضیح کرنے میں
قلم توڑ دیا ہے۔

ناٹیہ شاستر کے مطابق اداکاری کے لئے تبدیل ہیئت نہایت ضروری چیز ہے، اس کے لئے لباس
اور دوسری بیشمار اشیاء مثلاً رنگ و روغن، غبار و غازہ وغیرہ کا ذکر ناٹیہ شاستر میں بڑی شرح و بسط کے
ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اداکار کے حسنِ اخلاق، تعلیم و تربیت، بود و باش، خورد و نوش اور

چال چلن کے متعلق بہت سی باتیں کہی گئی ہیں، اور اظہارِ جذبات و محسوسات کے بیشمار پیرائے بیان کئے گئے ہیں۔ آنکھ کی طرح مُدرا کو صدہا قسم کی ذہنی کیفیات کا مظہر تسلیم کیا گیا ہے، ہاتھوں کا یہ عمل ٹپکا کہلاتا ہے۔ اسی طرح پیروں کی حرکات کو چینشٹا کہتے ہیں۔ مُدرا اور کارِ نظر کے بعض نمونے نیچے دیئے جاتے ہیں جن سے اداکاری کے طرزِ عمل میں جو اہم اختلافات وقتاً فوقتاً رونما ہوئے روشن ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ افتراقات اختلاطاتِ فن کے دامن گیر ہے۔

بھرت کی تفصیلی ہدایات شاہد ہیں کہ عہدِ قدیم میں صرف اعلیٰ طبقہ اور کیرکٹر کے تعلیم یافتہ افراد ہی اداکار بننے کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اب یہ بھانڈوں کا پیشہ سمجھا جاتا ہے۔

زمانہ تیس سال پہلے

آج سے تیس سال پہلے "زمانہ" فروری ۱۹۱۳ء میں ہمارے مرحوم دوست حضرت نادر کاکوروی کی "جلوہ گاہ دنیا" کے عنوان سے ایک دلکش و سبق آموز نظم شائع ہوئی تھی جس کے ابتدائی تین بند ہدیۂ ناظرین ہیں۔

عجب ترکیب سے رکھی ہے صانع نے بنا اس کی　کہ صدیاں ہوگئیں اک اینٹ بھی جس کی نہیں کھسکی
لگی رہتی ہے آمد رفت جسمیں روز جس تس کی　وہی رونق ہے جسکی اور وہی دلچسپیاں جسکی
خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

کچھ اس حکمت سے ہی ترکیب اسمیں رطب و یابس کی　کہ آپہونچا ادھر جاڑا اگر گرمی اُدھر کھسکی
بس اک دورِ تسلسل ہے بہار اس کی خزاں اسکی　وہی چتون ہے بلبل کی وہی آنکھیں ہیں نرگس کی
خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

بساطیں اُٹھ گئیں کچھ کے دارا و سکندر کی　صفیں برہم ہوئیں جم جم کے خاقان اور قیصر کی
جہاں تھی نورتن کل تک بکرماجیت و اکبر کی　وہاں اجلاس کونسل کر رہی ہے اب گورنر کی
خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

مغربی تہذیب

(از حضرت محمود اسرائیلی - بمبئی)

اک شخص کہہ رہے تھے کہ گلزارِ ہند میں
اہلِ فرنگ آئے نسیمِ چمن کی طرح
آمد نے انکی دل کے شگوفے کھلا دیئے
نسرین و یاسمین و گلِ نسترن کی طرح
شاہانِ مغلیہ کا نہ احوال پوچھیئے
وہ نوچتے رہے ہمیں زاغ و زغن کی طرح
مَیں نے کہا بجا ہے یہ ارشاد، اور آپ
اک نکتہ اس میں کہہ گئے اہلِ سخن کی طرح
اس مغربی نسیم نے گل تو کھلائے ہیں
یہ اور بات ہے وہ نہ ہوں یاسمن کی طرح
اور اس میں شک نہیں ہر کہ مٹھی میں زر بھی ہے
مانا کہ ہے شگوفۂ صحنِ چمن کی طرح
لب پر شگفتگی ہے تو دل تیرِ غم سے چاک
دیکھو جسے وہ ہے گلِ آشفتہ تن کی طرح

درسِ عمل

(از پنڈت آنند نراین ملا ایم۔اے۔ ایل ایل بی)

عشرت گہِ صیاد کا ساماں لیکر
گلچیں کے لئے دولتِ داماں لیکر
کبتک یہ گل و بہار غیروں کے لئے
غیرت ہو تو مٹ جاؤ گلستاں لیکر

ہندوستان کے بنک*

(۲) پریسیڈنسی بنک

(از مسٹر شبلی - بی - کام)

طرز جدید کے بنک ہندوستان میں جدید بنکوں کا عہد یوروپین زمانہ سے شروع ہوتا ہے ۔ پہلے پہل کلکتہ میں "ایجنسی گھر" بنائے گئے، جنھوں نے محض اپنے کاروبار کی امداد کے لئے لین دین شروع کیا۔ ساہوکارانہ حیثیت سے یہ "ایجنسی گھر" تاجروں اور مال پیدا کرنے والوں سے تعلق رکھتے تھے ور جہازوں اور نیل کے کارخانوں وغیرہ کی ضمانت پر ان کو قرض دیتے تھے۔ ہندوستان میں جو انگریز ور یوروپین سکونت پذیر تھے وہ بھی اپنا روپیہ سرکاری کفالتوں میں لگانے کے بجائے انھیں ایجنسیوں بں جمع کر دیتے تھے۔ ان کی شرح سود بھی خاطرخواہ تھی۔

مگر سٹہ بازی میں حصہ لینے کی وجہ سے ایجنسی گھروں کی ساکھ جاتی رہی اور بالآخر سنہ ۳۲-۱۸۲۹ء کے لی مشکلات کی وجہ سے ان کا خاتمہ ہوگیا۔

اِن ایجنسی گھروں کے علاوہ اسی اثنا میں میسرز الیگزنڈر اینڈ کمپنی نے ایک "ہندوستان بنک" ی یوروپین طرز پر قائم کیا، لیکن وہ بھی سنہ ۳۲-۱۸۲۹ء کی کساد بازاری کی وجہ سے فیل ہوگیا۔

اِس کی راکھ پر "یونین بنک" چلایا گیا، لیکن وہ بھی بالآخر سنہ ۱۸۴۸ء میں ٹوٹ گیا۔

بعدازاں جو بنک قائم کئے گئے ان کا تذکرہ "مشترک سرمایہ دار بنکوں" کے تحت میں آئیگا۔

فی الحال ہم پریسیڈنسی بنکوں کا حال لکھتے ہیں جو ملک کے تین بڑے بڑے احاطوں کے لئے قائم کئے گئے۔

اطی بنک انیسویں صدی کے اوائل میں غیر ممالک کے ساتھ ہندوستان کی تجارت بہت کم تھی۔ ملکی رت کا چلانا دیسی بنکوں کے ہاتھ میں تھا، جوں جوں تجارت نے فروغ پایا یوروپین طرز پر بنکوں کے ام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایجنسی گھروں یا ہندوستانی بنکوں سے کام لینے میں اول تو مصارف کثیر

* اس سلسلے کا پہلا مضمون زمانہ جنوری ۳۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

آتے تھے دوسرے یہ کوئی قابلِ اطمینان طریقہ نہ تھا۔ اِس لئے ۱۸۰۶ء میں کلکتہ میں پہلا پریسیڈنسی بنک پچاس لاکھ کے سرمایہ سے قائم ہوا۔ اس سرمایہ میں دس لاکھ روپئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیئے۔

بمبئی میں پہلا بنک ۱۸۴۰ء میں قائم ہوا جس کا سرمایہ باون لاکھ روپیہ قرار دیا گیا، جس میں سے تین لاکھ روپیہ گورنمنٹ نے دیا۔ یہ بنک ۱۸۶۸ء میں بند ہوگیا۔ کیونکہ اِس نے امریکہ میں روئی کے قحط اور خانہ جنگی کی وجہ سے جو سٹّہ بازی ہوئی اُس میں نمایاں حصّہ لیکر نقصان کثیر اُٹھایا۔

مدراس بنک ۱۸۴۳ء میں تیس لاکھ روپیے کے سرمایہ سے قائم ہوا، اس میں بھی تین لاکھ روپیہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیا۔

اِن تین پریسیڈنسی بنکوں کے قائم ہونے کی وجہ سے بنگال بنک کے تمام ہندوستان پر حاوی ہونے کا جو امکان تھا وہ جاتا رہا۔

آغاز ہی سے اِن پریسیڈنسی بنکوں کا گورنمنٹ کے ساتھ قریبی تعلق تھا، گورنمنٹ نے نہ صرف سرمایہ کی فراہمی میں حصّہ لیا بلکہ اُسے ڈائرکٹروں کی تقرری کا بھی اختیار حاصل تھا۔

۱۸۵۷ء تک سکرٹری اور خزانچی کے عہدے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول ملازموں کے ہاتھ میں رہے، اس کے عوض بنکوں کو بعض مراعات دی گئیں جن میں سے گورنمنٹ ساہوکاری کا اجارہ سب سے اہم تھا۔

بعض بندشوں کی وجہ سے اجرائے نوٹ کے حق کا بہت کم عملی فائدہ ہوا، مثلاً کل موجبات "نقد زرِ محفوظ" سے پہلے تین گنا اور بعدہٗ چار گنا سے زائد نہ ہو سکتے تھے۔ ۱۸۳۹ء کے بعد نوٹوں کے جاری ہونے کی انتہائی مقدار بھی مقرر کردی گئی، مگر ۱۸۶۲ء میں اجرائے نوٹ کا حق واپس لے لیا گیا، کیونکہ گورنمنٹ نے خود اپنا کاغذی سکہ جاری کرنا شروع کردیا۔ اس کے معاوضہ کے طور پر گورنمنٹ اپنی رقومات پریسیڈنسی بنکوں میں بطور امانت رکھوانے لگی

قانون پریسیڈنسی بنک ۱۸۷۶ء کی رو سے گورنمنٹ نے اپنے سرمایہ کا ایک حصہ واپس لے لیا اور ڈائرکٹر، سیکرٹری اور خزانچی وغیرہ مقرر کرنے کا حق بھی بنکوں کے حصہ داروں کو دیدیا۔

اس کے بعد پریسیڈنسی بنک سرکاری نہ رہے بلکہ اُن کی حیثیت عام تجارتی بنکوں کی سی ہوگئی اگرچہ وہ اب بھی ہندوستان کے مالی نظام کا جزو لاینفک متصور ہوتے تھے، اور حکومت کی قلیل امانتیں رکھنے کے علاوہ سرکاری قرضے کا انتظام و انصرام بھی انھیں کے سپرد تھا مگر انھیں گورنمنٹ سے اپنے حسابات کی پڑتال کروانا اور ہفتہ واری گوشوارے بھی شائع کرنا پڑتے تھے۔

محفوظ سرکاری خزانے ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۶ء تک صدر مقاموں پر گورنمنٹ کی تمام رقومات پریسیڈنسی بنکوں میں رکھنا ضروری تھا۔ لیکن چونکہ بنگال بنک اور بمبئی بنک سے امانتیں واپس لینے میں بعض دشواریوں کا تجربہ ہوا اس لئے گورنمنٹ نے بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں اپنے خزانے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

بعد ازاں گورنمنٹ کی رقومات کا اکثر حصہ اِن محفوظ خزانوں میں رکھا جانے لگا، اور صرف روزمرہ کی ضروریات کے لئے ایک قلیل حصہ تعلقہ اور ضلع کے خزانوں میں رکھا گیا۔

۱۸۷۶ء سے نئے انتظامات شروع ہوئے، جن کے مطابق گورنمنٹ نے ایک خاص معیار سے کم رقومات پر سُود دینا بھی منظور کرلیا۔ اگرچہ وہ رقومات جمع کرنے والوں سے کوئی وعدہ کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ مگر عملی طور پر خاص معیار سے زیادہ ہی رقمیں جمع رہنے لگیں، لیکن ساہوکاروں کے نقطۂ نظر سے ان کی مقدار قلیل ہی رہی۔ بہرحال زیادہ تر رقم سرکاری خزانوں میں جمع ہوتی رہی اور گرانی کے زمانہ میں اُس کی کتنی ہی ضرورت ہوتی ہو لیکن یہ رقمیں رہیں مقفل رہتیں۔

وقتاً فوقتاً تجاویز پیش کی گئیں کہ پریسیڈنسی بنکوں کے ذریعہ خزانوں سے لوگوں کو تھوڑے عرصہ کے لئے قرضے دیدیئے جایا کریں۔ لیکن گورنمنٹ اِن تجاویز پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ تھی، کیونکہ ہندوستان کے حالات بعض اوقات فوری ضروریات کے محتاج ہوجاتے تھے، اور وقت پر روپیہ میسّر نہ آنے سے بہت سی مشکلات کا سامنا ہوسکتا تھا، دوسرے اس سے یہ غلط فہمی بھی پھیلنے کا اندیشہ تھا کہ سرمایہ گورنمنٹ لگارہی ہے، حالانکہ وہ لوگوں کے فاضل اندوختے کا حصہ تھا۔

تاہم گورنمنٹ پر بہت زور دیا گیا اور بالآخر ۱۸۹۸ء میں وزیر ہند سے سفارش کی گئی کہ وہ زائد روپیہ ہر سال جنوری سے مئی تک پریسیڈنسی بنکوں کو مقررہ شرح سُود سے ایک فیصدی کم شرح پر قرض دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ وزیر ہند نے یہ سفارش اِس شرط پر منظور کرلی کہ اس دادوستد سے گورنمنٹ کی تحصیل وصول و ترسیل زر میں کوئی ہرج واقع نہ ہو۔ نیز یہ قرض مروجہ شرح بنک پر دیئے جائیں۔ چونکہ یہ شرائط بہت کڑی تھیں اس لئے شاذ ہی قرضے دیے گئے۔

چمبرلین کمیشن نے اس کے بجائے محفوظ خزانہ کے طریق کو اُڑانے یا ان رقومات کو پریسیڈنسی بنکوں میں منتقل کردینے کی سفارش کی، اور مندرجہ بالا شرائط کو نرم کرنے کی رائے دیکر تجویز کیا کہ پریسیڈنسی بنکوں کو عام نرخ بنک سے ایک یا دو فیصدی کم شرح پر قرض دیا جائے۔

جنگ ۱۹۱۴ء کے دوران میں گورنمنٹ نے ایک کثیر رقم پریسیڈنسی بنکوں کو اس غرض کے لئے دی تاکہ عوام کو جنگی قرضے میں حصہ لینے میں آسانی ہو۔

۱۹۲۱ء میں محفوظ خزانہ کا طریقہ اُڑا دیا گیا، اور گورنمنٹ کے حسابات پہلے امپیریل بنک میں اور اب ۱۹۳۵ء میں ریزرو بنک میں رکھے جانے لگے ہیں۔

کاروباری بندشیں | پریسیڈنسی بنکوں پر جو بندشیں لگائی گئی تھیں اُن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) عام طور پر کسی بنک کو غیر ملکی مبادلہ کا کام کرنے کی اجازت نہ تھی، صرف مدراس پریسیڈنسی کے بنک کو سیلون کے متعلق اجازت تھی۔

(۲) کسی بنک کو غیر ملکوں سے قرض لینے کی اجازت نہ تھی۔

(۳) قرض دینے کے لئے بھی روپیہ کی مقدار، مدت قرض اور ضمانتوں وغیرہ پر بندشیں لگا دی گئی تھیں جس کاروبار کی انھیں اجازت تھی اُس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ امانتیں لے سکتے تھے اور گورنمنٹ اور دیگر نیم سرکاری کفالتوں میں روپیہ لگا سکتے تھے۔ انھیں ملکی ہنڈیوں پر بٹہ کاٹنے کی اجازت تھی وہ ہنڈیوں اور پرامیسری نوٹوں کی ضمانت پر قرض دے سکتے تھے، اور قیمتی اشیاء کی امانتیں رکھنے سونے چاندی کی خرید و فروخت کرنے اور بعض میونسپل بورڈوں کے اُدھار کاروبار کا انتظام کرنے کی بھی اجازت تھی۔

اِن بندشوں کے باوجود پریسیڈنسی بنکوں نے کافی ترقی کی، اور گورنمنٹ کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے ملک میں اُن کی ساکھ اور ناموری قائم ہوگئی تھی۔

ذیل میں اعداد و شمار کا ایک نقشہ دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۵ء سے لیکر ۱۹۲۰ء تک پریسیڈنسی بنکوں کی کیا پوزیشن تھی:۔

لاکھ روپیوں میں۔

سال عیسوی	سرمایہ	زر محفوظ	سرکاری امانتیں	دیگر امانتیں	نقد	روپیہ جو کاروبار میں لگا	منافع فیصدی
بنگال بنک							
۱۸۹۵ء	۲۰۰	۶۸	۱۸۴	۶۷۷	۴۲۲	۱۳۲	۱۰
۱۹۱۳ء	۲۰۰	۱۹۱	۳۰۱	۱۸۲۴	۸۴۰	۳۱۹	۱۴
۱۹۲۰ء	۲۰۰	۲۱۰	۴۳۴	۳۳۹۸	۱۲۲۱	۹۱۰	۱۹ ½

سال عیسوی	سرمایہ	زر محفوظ	سرکاری امانتیں	دیگر امانتیں	نقد	روپیہ جو کاروبار میں لگا	منافع فیصدی
بمبئی بنک							
سنہ ۱۸۹۵ء	۱۰۰	۵۱	۷۶	۳۵۸	۲۲۸	۱۰۵	۱۱
سنہ ۱۹۱۳ء	۱۰۰	۱۰۶	۲۰۰	۱۰۱۵	۴۷۷	۲۳۲	۱۴
سنہ ۱۹۲۰ء	۱۰۰	۱۲۰	۳۴۹	۲۷۴۸	۸۷۶	۲۹۸	۲۲
مدراس بنک							
سنہ ۱۸۹۵ء	۵۰	۱۶	۴۵	۲۷۸	۱۴۴	۴۵	۱۰
سنہ ۱۹۱۳ء	۷۵	۷۳	۸۶	۸۰۵	۲۱۹	۱۷۷	۱۲
سنہ ۱۹۲۰ء	۷۵	۴۵	۱۱۸	۱۵۷۹	۵۰۵	۲۱۱	۱۸

اِس نقشہ سے ظاہر ہے کہ مالی استحکام کے لحاظ سے بنگال بنک اوّل درجہ پر تھا، بمبئی بنک اُس سے کم اور سب سے کم درجہ پر مدراس بنک تھا۔ تمام بنکوں میں سرمایہ بمشکل بڑھا، لہذا کاروبار اور سرمایہ کا تناسب قائم نہ رہ سکا بلکہ دونوں میں روز افزوں فرق ہوتا گیا۔ جنگ کے دَوران میں نجی امانتیں بڑھ گئیں اور زرنقد کا تناسب بھی کافی رہا، یعنی موجبات کا کم سے کم ۳۰ فیصدی جو روپیہ کاروبار میں لگا دیا گیا وہ بھی بڑھتا رہا جو بنکوں کے استحکام کا ثبوت ہے

سنہ ۱۹۲۰ء میں اِن تینوں پریسیڈنسی بنکوں کو ایک میں مدغم کرکے امپریل بنک قائم کیا گیا، جس کا مفصل حال آئندہ لکھا جائیگا۔

مذہب

(از حضرت فیاض بی اے)

مذہب کے سینہ کی امانت مذہب — اخلاق کے مفہوم کی وسعت مذہب
فسوس، مگر آج یہ ہم بھولے ہیں! — انسان کو رحمت ہے کہ زحمت مذہب

ٕمت ہی مجھے، تجھے ہے زحمت مذہب — دوزخ ترا مذہب، مرا جنّت مذہب
ٕاہد مجھے کفر و دیں سے کرنا کیا ہے — مجھ مستِ وطن کا ہے محبّت مذہب

یہ دھرم قدیم ہے، وہ مذہب معقول، — ہے رَب کی نظر میں کون زائد مقبول؟
ٕرصت ہے تو بیٹھا ہوا یہ سوچ، مگر — انساں بھی ہے تو، یہ نہ خدا کے لئے بھُول

ٕک منزلِ مقصود ہے، راہیں سَو ہیں — جلوہ ہے وہی ایک، نگاہیں سَو ہیں
ٕف برہمن و شیخ کی کوتہ نظری — مجروحِ وطن کے لب پہ آہیں سَو ہیں

آپس میں یہ چھوت چھات، نفرت کیسی — یہ نام پہ مذہب کے عداوت کیسی
انسان انسان ایک سے ہیں سب — انسان کو انسان سے نفرت کیسی

بندوں میں کوئی فرق نہ کچھ رب میں فرق — الفاظ میں کچھ فرق نہ مطلب میں فرق
انسانیت آنکھوں سے جہاں اوجھل ہو — سمجھو کہ وہیں پڑ گیا مذہب میں فرق

ہندی نہ ہوئے کبھی مسلماں ہندو — ہے اِن کے لباس و نام میں بھی تفرق کی بو
مذہب کی یہی ہے شان و تعریف اگر — گردن پہ ہے اِس کی آدمیت کا لہو

رہنے دے خدا کو دل میں، مذہب گھر میں | کر فرق خدا کے لئے گھر، باہر میں
تو روح کو پاک کر کے انساں بن جا | ہر وقت جنوں سا کیوں ہے تیرے سر میں



مذہب تو تری روح کو چمکاتا ہے | مذہب تو بڑی آدمیت لاتا ہے
مشرق سے ہوا تھا جس ستارہ کا طلوع | تو اُس کو ڈبوتے نہیں شرماتا ہے

حُبِّ وطن اور مسلمان

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

ظرف اور اس حد کا تنگ اے حامیٔ دینِ مبیں | حیف اے نا آشنائے رحمۃ اللعالمیں
حیف اے دیوار کے پابند، اے در کے اسیر | اپنے حجرے، اپنی مسجد، اپنے منبر کے اسیر!
دل پہ تیرے نقش ہے وہ فلسفہ ادیان کا | کاٹتا ہے رشتہ جو انسان سے انسان کا
مجھ سے کیا کرتا ہے ہندو کے تعصب کا گلہ؟ | مجھ سے کیوں کہتا ہے ہندو کی جفا کا ماجرا؟
تنگ فکر و تنگ داماں تنگ ظرف و تنگ جیب | مان بھی لوں میں کہ ہندو عیب ہے اور زندہ عیب
فرض بھی کر لوں کہ ہندو ہند کی رسوائی ہے | لیکن اسکو کیا کروں پھر بھی وہ میرا بھائی ہے
باز آیا میں تو ایسے مذہبی طاعون سے | بھائیوں کا ہاتھ تر ہو بھائیوں کے خون سے!
سبحہ و زنار کی لہروں ہی پر کہتا ہے تو | اور اس تنگی پہ مجھ کو کم نظر کہتا ہے تو!
تیری ہستی تنگنائے کفر و ایماں کے لئے | میں بنا ہوں آب و رنگِ نوعِ انساں کے لئے!
گو بجتی ہیں قصرِ آفاقی میں آوازیں مری | کفر و ایماں سے بہت بالا ہیں پروازیں مری
لیکن اسکے ساتھ ہی اے مبتلائے کفر و دیں | دولتِ حُبِّ وطن کو چھوڑنا ممکن نہیں!
سعی کرنا چاہیئے پہلے تو گھر کے واسطے | گھر سے فرصت ہو تو پھر نوعِ بشر کے واسطے
تیرے لب پر ہے عراق و شام و مصر و روم و چیں | لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں
کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں | کل جہاں تیرا۔ مگر ہندوستاں تیرا نہیں؟
مردِ حق کو قعرِ باطل سے اُبھرنا چاہیئے | کعبۂ حبِّ وطن میں سجدہ کرنا چاہیئے

سب سے پہلے مرد بن ہندوستاں کے واسطے
ہند جاگ اُٹھے تو پھر سارے جہاں کے واسطے

(نظم)

کاروبار

(ایک سین کا ڈرامہ)

(از حاجی محمد صادق صاحب لیوبی)

افراد

جمشید جی	(باپ)	زریدون	(سالہ)
عباس	(بیٹا)	وکیل	
شیریں	(بیٹی)	منظر	(خوابگاہ)
امینہ	(بیوی)		

(ڈاکٹر اور وکیل جمشید جی کے سرہانے کھڑے ہیں)

ڈاکٹر (جمشید جی سے) اے مردِ نکوکار! اپنے گھر دَر کو سنبھال لے، کوئی دم میں اب دنیا سے اُٹھا چاہتا ہے، میں افسوس سے کہتا ہوں کہ تو چراغِ سحری ہے کہ اب بجھا اور اب بجھا!

(جمشید جی کراہتا ہے)

وکیل - جمشید جی! وقت نازک ہے، وصیت کی تکمیل میں زرا عجلت سے کام لیجئے، مبادا دم آئے یا نہ آئے!

جمشید جی: مَیں موت سے گھبراتا نہیں، لیکن یہ غم کھائے جاتا ہے کہ میرے بعد اس کاروبار کو کون سنبھالے گا!

وکیل (ڈاکٹر سے) مناسب ہوگا کہ سارا کُنبہ بلا لیا جائے، اب نبض چھوٹ چلی ہے اور سانس بھی اُکھڑ چکا ہے۔

(ڈاکٹر آواز دیتا ہے، شیریں اندر آتی ہے)

شیریں: ڈاکٹر صاحب! کیا اب کوئی امید نہیں؟

ڈاکٹر: نہیں! عزیزہ اب اللہ ہی اللہ ہے، حالت غیر ہو چکی ہے، گھونگھرو بولنے لگا ہے، ناک کا بانسا پھر چکا ہے!

شیریں (بسور کر) ہے ہے!

وکیل: سب کو بلا لو،

(شیریں لڑکھڑا کر در کھول دیتی ہے، عباس، فریدون، اور جمشید جی کی بیوی آمینہ اندر داخل ہوتی ہیں)

وکیل، کیا سارا کنبہ آگیا ہے یا کوئی رہ گیا ہے؟

شیریں، جناب! بس سب آچکے ہیں،

(جمشید جی سنبھالا لیکر متوحش نظروں سے دیکھتا ہے، اور پھر بالیں سے سر اٹھاتا ہے۔)

جمشید جی، کیا سب آگئے، یہ سارا کنبہ یہاں کیوں اکٹھا ہے؟

ڈاکٹر: ہاں صاحب سب موجود ہیں!

جمشید جی: (اُدبُدا کر اور دل پہ ہاتھ رکھ کر) بے وقوف کہیں کے..... پھر دکان کا کون نگراں ہوگا:

(جمشید جی بستر سے کود کر دروازہ سے دوڑتا ہے)

(پردہ)

از مہد تا لحد

(حضرت جوش ملیح آبادی)

ہے مہد سے تا لحد برابر بچپن
صرف اتنا بڑا ہوا ہے بچوں کا چلن
نام اپنے کھلونوں کے بدل لیتے ہیں
اطفال بزرگ، "یعنی" پیران کہن۔

تھے پہلے کھلونوں کی طلب میں بیتاب
پھر حسن کے جلووں کے رہے بے خور و خواب
اب ہیں زن و فرزند پہ دل سے قربان
بڈھے ہیں تو تمغوں پہ ہیں بیتاب!

شاعر کی قدر

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

م کی بے مثل ہندی شاعری کا باکمال
یعنی بھوشن شاعرِ خوش لہجہ ورنگیں مقال

پر اس کے دل کو شیواجی سے تھا فطری لگاؤ
اور اُس کی شاعری بھی تھی اُسی کے وقفِ حال

ں مگر اک مرتبہ اپنے وطن جاتے ہوئے
آکے وہ ٹھہرا جہاں فرمانروا تھا چھتر سال

مت شاعر کا تھا رانا جو دل سے معترف
میہمانی میں نہ تھا مطلق کمی کا احتمال

د تھا لیکن شِوا کے دیکھتے رانا کے پاس
پیشکش کے واسطے گویا نہ ساماں تھا نہ مال

ر دنوں کے بعد ہی مہماں کی رخصت کے وقت
آخرش پیدا ہوا جب رخصتانے کا سوال

ھی ممکن تھا بہر صورت کیا رانا نے نذر
تھا مگر شاعر کے چہرے سے عیاں رنگِ ملال

ہیں رانا کے خیال آیا یہ اُس دم ناگہاں
ہو نہ شاعر کو کہیں تحقیر کا اپنی خیال

ناکر جلد ہی اِک پالکی بردار کو
پالکی رانا نے خود لی اپنے کندھے پر سنبھال!

ھکر شاعر وہیں اُترا زمیں پر ایک دم
آگئے آنکھوں میں اشکِ انبساط و انفعال

پڑا وہ دست بستہ عرض یوں کرتے ہوئے!
"آہ کس مشکل میں رانا جی رہے ہیں مجھ کو ڈال

انی کے لئے کر دیجئے مجھکو معاف
قدر شاعر کی زیادہ اس سے ہونا ہے محال

توسمجھا تھا کہ قدر اپنی شِواجی پر ہے ختم
آپ نے اُس سے بھی بڑھکر آج قائم کی مثال!"

ا اور اُس جگہ سے ہو گیا خوش خوش رواں
لے کے خود اِس واقعہ سے ایک یہ اُمید فال

یعنی بھوشن کی نگاہوں میں ثنا کے مستحق
اب سے تھے دونوں شِواجی اور رانا چھتر سال

میرزا واجد حسین یاسؔ یگانہؔ لکھنوی

(آیاتِ وجدانی پر ایک نظر)

از مسٹر مالک رام ایم اے۔ ایل ایل بی

بیاد رید گرایں جا بود زباندانے غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد غالبؔ

مُدتوں تک اُردو شاعری کا سرمایہ جذباتِ عشقیہ رہا۔ تاآنکہ اسمیں تنوع پیدا ہوا اور قصیدہ اور مرثیہ بھی موضوعاتِ شاعری قرار پائے۔ نظیرؔ اکبرآبادی غالباً پہلا اُردو شاعر ہے۔ جس نے اپنی شاعری کیلئے وسیع میدان چُنا اور جو صحیح معنوں میں قومی شاعر کہلا سکتا ہے مگر افسوس اُس پر کافی توجہ نہیں دی گئی۔ اور جس داد کا وہ مستحق ہے۔ وہ اُسے نہیں ملی۔ حالانکہ وہی ایک شاعر ہے جو ملک کی زیادہ سے زیادہ آبادی کے خیالات کا ترجمان ہے۔ اور جسے ہم بلاخوفِ تردید دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھار بعض شاعروں نے تصوف پر بھی خامہ فرسائی کی۔ لیکن عام طور پر اُردو شعراء عشق و محبت کے مضامین ہی لکھتے رہے۔ یہ شرف غالبؔ کیلئے تھا۔ کہ اُنھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ پیدا کی۔ اور حُسن و عشق کے ساتھ ساتھ فلسفہ کو بھی موضوعِ فکر بنایا اور اِسمیں شک نہیں کہ وہ اس میں حیرت انگیز حد تک کامیاب ہوئے۔ نقشِ اول ہی اتنا کامیاب رہا کہ تعجب ہوتا ہے۔ ان کے سامنے کوئی مثال موجود نہ تھی۔ جس کی وہ تقلید کر سکتے۔ بے شک اول اول اُنھوں نے بیدلؔ وغیرہ کے رنگ کا تتبع کیا۔ لیکن کچھ لوگوں کی تنقید و نکتہ چینی اور کچھ اُن کی طبع سلیم نے اُنھیں بتا دیا۔ کہ یہ غلط راستہ ہے۔ بہر حال غالبؔ کے بعد اُردو شاعری کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اور آج تو ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر گئی

آج کی صحبت میں جس شاعر کا ذکر کرنا مدِ نظر ہے۔ وہ غالبؔ کے بعد کے دَور کا فرد ہے۔ عشق و محبت کے مضامین وہ بھی لکھتا ہے۔ لیکن خال خال۔ اِس کا دِل پسند موضوع فلسفۂ و حیاتِ انسانی ہے۔ آیندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے کہ وہ اِس باب میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔

(۲)

عظیم آباد نہایت قدیم زمانہ سے اُردو علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ جن دِنوں دہلی میں مغلیہ سلطنت شمع سحری بنی ہوئی تھی۔ مقامی اُمراء کی سرپرستی میں عظیم آباد اُردو زبان کی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ راسخؔ اور مرزا دبیلؔ کے

رہنے والے تھے۔ راسخ عظیم آبادی میر کے معاصرین میں تھے۔ ان کا کلام سلاست اور دل نشینی اور گھلاوٹ میں اپنے نامور معاصروں سے کسی طرح کم نہیں۔ متاخرین میں حضرت شاد عظیم آبادی کا نام کسی سے مخفی نہیں، وہ حال ہی میں ہم سے جدا ہوئے۔ مگر ہماری ناقدری کا یہ عالم ہے کہ آج شاد کا کوئی مجموعۂ کلام دیکھنے کو نہیں ہے۔

میرزا واجد حسین یاس یگانہ بھی اسی عظیم آباد کی خاک سے پیدا ہوئے، اور جب تک عظیم آباد میں رہے۔ یاس تخلص کرتے رہے۔ مگر ۱۹۰۶ء میں طبی ضرورتوں کے ماتحت لکھنؤ کا سفر کیا۔ اور یہاں کی فضا انھیں کچھ ایسی بھا گئی، کہ یہیں کے ہو رہے۔ آخر یہیں شادی کر لی۔ اور عظیم آبادی ثم لکھنوی ہو گئے۔ بعض ادبی معرکوں کی یادگار میں اپنا جدید تخلص یگانہ رکھا۔ چنانچہ اب وہ ملک میں میرزا یاس یگانہ یا صرف میرزا یگانہ کے نام سے مشہور ہیں۔

میرزا صاحب کی ابتدائی تعلیم جناب حسرت عظیم آبادی اور بیتاب عظیم آبادی کی نگرانی میں ہوئی اور اس کے بعد وہ خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے۔ اس وقت تک اُن کے کلام کے تین مجموعے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ نشترِ یاس (لکھنؤ) جس میں ۱۹۱۴ء تک کا کلام ہے، آیاتِ وجدانی ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی اور اسمیں نشترِ یاس کا انتخاب بھی شامل ہے۔ ترانہ نام سے ۱۹۳۳ء میں اُن کی رباعیوں کا مجموعہ بھی لاہور سے شائع ہوا۔

جیسا میں لکھ چکا ہوں۔ میرزا یاس کا دل پسند موضوع فلسفۂ حیاتِ انسانی ہے، انسان اشرف المخلوقات ہے۔ ہمیں اپنے اردگرد جو جہانِ رنگ و بو نظر آتا ہے۔ وہ سب انسان کیلئے ہے۔ فطرت کے ارتقار کا منتہائے مقصود ہستیِ انسان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ہستی کا مطالعہ کسقدر مشکل اور مہتم بالشان چیز ہے۔ میرزا صاحب نے انسان اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کا غائر مطالعہ کرکے اپنے نتائج فکر ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔

(۳)

ہستیِ باری تعالیٰ کا ایک زبردست ثبوت انسانی عزم کی ناکامیابی میں مضمر ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ انسان حصولِ مقصد کے لئے تمام دنیوی سامان مہیا کرتا ہے اور ایک شاطر کی طرح تمام مرحلوں کو سوچ بچار کر راہ کی تمام رکاوٹوں کے تدارک کا انتظام کرکے اپنی جگہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اب ضرور فتح و ظفر میرے قدم چومے گی لیکن عین اُسوقت جب اُسے عروسِ مدعا کا رُخ نظر آنے لگتا ہے۔ اور وہ اس اُمید میں سرشار ہوتا ہے کہ اب کوئی دم میں پالا مار لیا۔ کوئی ایسا غیر متوقع حادثہ پیش آتا ہے کہ سارا کھیل تلپٹ ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی عزائم و انتظامات کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی ہے۔ جو اس سے زیادہ قادر و توانا ہے۔ جو اس کے ارادوں کو لمحہ بھر میں درہم برہم کر سکتی ہے۔ اور جس کی مدد کے بغیر انسان کسی ارادہ کو فعل میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ عرفتُ ربّی

بفسخ العزائم" میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا۔ دیکھئے یگانہ نے بھی اسی حقیقت کو کس قابلیت سے اور کیسی شگفتہ زبان میں بیان کیا ہے ؎

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

انسان کا فرض ہے کہ اپنے خالق سے تعلق پیدا کرے۔ دہریت سے زیادہ ناشکری کوئی نہیں ہوسکتی۔ آزادی بڑا دلکش لفظ ہے لیکن وہ کشتی جس کو ساحل سے لگانے کیلئے کوئی رسی نہیں اور وہاں قائم رکھنے کیلئے کوئی میخ نہیں، وہ طوفان کے رحم پر ہے۔ جو اُسے جہاں چاہے بہالے جائے۔ لیکن اگر اسے ساحل سے لگانے کیلئے رشتہ قائم ہے۔ تو وہ دریا کی سیر کے بعد بھی اپنے مامن وماوا میں پہنچ سکتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال اِس شخص کا ہے۔ جو کسی خاص سلسلہ میں منسلک نہیں۔ وہ دوسروں کے خیالات کے ریلے میں جلد بہہ جاتا ہے۔ چونکہ اس کا اپنا مرکز کوئی نہیں ہوتا۔ اِس لئے اُس کی ساری عمر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے میں گذر جاتی ہے۔ اِسی لئے کہا ہے ؎

کسی کے ہورہو، اچھی نہیں یہ آزادی کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

لیکن مشکل یہ ہے کہ ؎

شاہدِ نادیدہ را آثار نتواں یافتن دسترس بر پردۂ اسرار نتواں یافتن

اِس گتھی کو سُلجھانے کیلئے جب ہم اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں۔ تو ذرہ ذرہ اِس یوسف پنہاں تک ہماری رہبری کرنے کو موجود ہے۔ اِنسان کا فطری ذوق شاہد ہے کہ اِس کارخانۂ ہستی کی پیدائش اور اس کا اصول پر جاری رہنا اِس امر کا مقتضی ہے۔ کہ پس پردہ کوئی ہستی اِس نظام کی باگ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ جیسے ہم مسافر کا کھوج اس کے قدموں سے لگالیتے ہیں۔ اِسی طرح خداوند تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت یہ نظامِ عالم ہے۔

ذوق می تواں دانست رنگِ حسنِ نادیدہ ہست شاہدِ عادل بوئے پیرہن تنہا

پھر یہی نہیں کہ ہم ہی وصالِ حقیقی کے مشتاق ہیں۔ بلکہ اس کا ان نشانات کو پیدا کرنا جو اس تک ہماری رہبری کرتے ہیں اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ خود بھی اس کا خواہش مند ہے۔ البتہ اِس کیلئے ہمارے دل میں سچی طلب اور خواہش ہونا لازم ہے۔ جب یہ چیز پیدا ہو جائے گی وہ خود ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچانے کے اسباب مہیا کردیگا

بوئے یوسف خود دلیلِ منزلِ مقصود ہے جذبِ صادق غائبانہ رہنما ہو جائیگا

لیکن خدا کی رہنمائی کا طریقہ ہم انسانوں کے طریقہ سے مختلف ہے۔ وہ جس زبان میں گفتگو کرتا ہے اسے سمجھنے کیلئے خاص صلاحیت کی ضرورت ہے۔ نہ صرف وہ چیزیں جو ہماری آنکھوں کو حسین ودلکش نظر آتی ہیں۔ اس کی قدرت کی مظہر ہیں۔ بلکہ دنیا کی تمام اشیاء خواہ وہ ہمارے معیارِ حسن کے مطابق خوبصورت ہوں یا بدصورت خالق کی صنعت کا کامل نمونہ ہیں۔ اور اگر ہمارا ادراک صحیح ہو، تو ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کونسی چیز خوبصورت ہے اور کونسی بدصورت۔ کیونکہ جب ہم یہ خیال کریں گے کہ یہ سب اشیاء

حُسنِ ازل کی مختلف صورتیں ہیں۔ تو ہمارے لئے بدصورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا ؎

خامۂ قدرت کی ہر صنعت ہے آپ اپنی مثال   امتیازِ خوب و زشت آنکھوں کو مشکل ہوگیا

صرف پھول ہی   معرفت الٰہی کے نکات نہیں بتاتے۔ بلکہ کانٹے بھی مطالب کی ایک دُنیا اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ البتہ دیکھنے والی آنکھ اور سمجھنے والا دماغ چاہیئے۔ جب یہ چیزیں حاصل ہوجائیں۔ تو پھر ہمارے لئے کانٹوں کی زبان بھی اتنی ہی فصیح و بلیغ اور آسان ہوگی جتنی پھولوں کی ؎

حُسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں   معنیٔ بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر دنیا کی تمام اشیا جمالِ خداوندی کی مظہر ہیں۔ تو کیا وجہ کہ دُنیا میں کفر اور ایمان دونوں قائم ہیں۔ کیوں تمام دُنیا ہستیِ باری تعالیٰ کی قائل نہیں ہوجاتی؟ ظاہر ہے کہ جبتک یہ دُنیا قائم ہے۔ مختلف اشیا کے مختلف طبائع پر علیحدہ علیحدہ اثرات ہوں گے۔ ہم آئے دن دُنیا میں اسکی مثالیں دیکھتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں کہ چُلّو میں اُلّو ہو جائیں۔ اور ایسے بلا نوش بھی ہیں کہ خُم کے خُم چڑھا جائیں۔ اور انھیں محسوس تک نہ ہو۔ بعض کے لئے ایک قطرہ زہر کا قطعِ حیات کیلئے کافی ہے اور ایسے بندگانِ خدا بھی ہیں۔ جو سانپوں کو گاجر مولی کی طرح کھاجاتے ہیں، سچ ہے ؎

وہی ساقی، وہی ساغر، وہی شیشہ، وہی بادہ   مگر لازم نہیں ہر ایک پر یکساں اثر ہونا

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اِن اشیا کی ظاہری شکل وصورت سے گذر کر اُن کے بطون تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ جو لوگ چھلکے تک رہتے ہیں وہ اِس معرفت کے حصول میں لازماً ناکام رہتے ہیں۔ جو اُن کے مغز میں پوشیدہ ہے۔ بے شک ان کا ظاہر بھی بہت دِلکش اور دلفریب ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان اُن کی کُنہ تک پہنچ جائے۔ تو ان کی ظاہری دلفریبی آنکھوں سے گرجائے ؎

صورت پرست کب ہوتے معنی سے آشنا   عالم فریب طُور کا افسانہ ہوگیا

بعض لوگ اِس امر کیلئے رہبر کی تلاش میں سرگشتہ وحیران پھرتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سفر میں صحیح رہبر نہیں ملتا۔ یہ نام نہاد رہبر خود دلیلِ مطلوب کی شکل سے اُتنے ہی ناآشنا ہیں، جتنے ہم۔ پھر وہ ہماری کیا رہبری کریں گے۔ اِسی لئے پوچھتے ہیں ؎

سیکڑوں آوارۂ صحرا نظر آئے مگر   کوئی صورت آشنا بھی صاحبِ محمل کا ہے؟

ایسے لوگوں کی شکلیں بہت گمراہ کن ہوتی ہیں۔ یہ لوگ شکل سے خدا رسیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ مذہب کے ظاہری احکام کے سختی سے پابند ہوتے ہیں۔ اِس لئے انسان سرسری نظر میں دھوکا کھاجاتا ہے لیکن درحقیقت وہ بھی منزلِ مقصود سے اتنے ہی دُور ہوتے ہیں جتنا رندِ بادہ نوش۔ اِس معاملہ میں صحیح دلیلِ راہ

ہمارا قلب مصفا اور ضمیرِ حق شناس ہوتا ہے۔ ایک ریاکار "مرشد" پر ایک دِل پاکیزہ کو ہر حالت میں ترجیح حاصل ہے ؎

کیست ازیں ہر دو کہ بکشاید درے از معرفت زاہدِ شب زندہ دارے یا دِلِ بیدارِ ما

زاہد ظاہر پرست کے نزدیک ایمان ان باتوں میں مضمر ہے کہ انسان صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھکر نمازیں پڑھے کہ اس کی پیشانی پر گھٹے پڑ جائیں۔ لیکن اگر یہی ایمان ہے تو پھر ایک حیوان بھی تعلیم سے اِنسان بن سکتا ہے۔ تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ کتنے طوطے بھی ہم انسانوں کی طرح باتیں کرتے تھے دراصل ایمان اور خدا پرستی اور اتقار کا فیصلہ اعمال سے ہے۔ اِس اعتقاد سے بھلا کیا حاصل جسکا نتیجہ اعمالِ نیک نہیں ہوتا۔ جسطرح محض باتیں کرلینے سے حیوان اِنسان نہیں بن سکتا۔ بلکہ اِس کیلئے اِنسانوں کے سے اعمال کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کوئی اِنسان محض ظاہری اور بیرونی رسومِ مذہب ادا کرلینے سے باخُدا نہیں بن سکتا۔ بلکہ اِس کے ساتھ تزکیۂ نفس اور عملِ صالحہ بھی لازم ہیں ؎

پڑھ کے دُو کلمے اگر کوئی مسلماں ہوجائے پھر تو حیوان بھی دو روز میں انساں ہوجائے

دِل بیدار بھی ایک عجیب نعمت ہے۔ اس کے استغنا اور بے نیازی کی کوئی حد نہیں۔ اسے کامیابی پر کوئی خوشی نہیں اور ناکامیابی پر غم نہیں۔ وہ اپنا رہبر آپ ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ؎

یہ دِل بے مُدّعا۔ بیگانۂ اُمید و بیم غرق ہوکر آپ اپنا ناخُدا ہو جاتے گا

اگر خدا کسی کو ایسا دِلِ بیدار ودیعت کردے۔ تو پھر اس شخص کو اس کے احکام کی پابندی میں کسی طرح کی جھجک روا نہیں رکھنا چاہئے۔ ایسے دِل کا فیصلہ شاذ ہی غلط ہوتا ہے۔ اِس لئے جب وہ کسی سمت چلنے کو کہے، تو سمجھ لو۔ کہ منزلِ مقصود کا راستہ یہی ہے۔ پھر کسی بدرقہ کا انتظار کرنے میں اپنی راہ کھوٹی مت کرو ؎

ہزار ہاتھ اسی جانب ہے منزلِ مقصود دلیلِ راہ کا کیا غم ملا ملا یا نہ ملا

اگر ہم ایسے دِل کے ساتھ تعاون کریں۔ تو وہ سلوک کی منزلیں جلد جلد طے کرکے خود اللہ تعالیٰ کے نزول کا مقام بن جائے گا۔ ایسے شخص کی قوتِ مدرکہ بھی غیر معمولی طور پر تیز ہوجاتی ہے ؎

عشق سے آئینۂ ادراک کے جوہر کھلے خانۂ دل شاہدِ معنی کی منزل ہوگیا

لیکن شاہدِ حقیقی کے دیدار کے راستہ میں ایک کی جگہ دو دو رکاوٹیں ہیں۔ ایک تو خود خداوند تعالیٰ نے اپنے گرد ہی ایک حجابات کا حصار کھینچ رکھا ہے۔ دوسرے ہماری نظر دنیوی اسباب کے سبب ان حجابات کے اس طرف جمالِ ازلی کے نظارہ کی نعمت حاصل کرنیسے محروم رہتی ہے ؎

حضرتِ مجنوں کُجا: نظارۂ لیلےٰ کُجا ایک پردہ آنکھ کا ہے دوسرا محمل کا ہے

لیکن دراصل وہ پردے جو خدا کی طرف سے ہیں، وہ سب عارضی ہیں۔ خدا ان پردوں کے ذریعہ خود لوٹاتا ہے یہ پردے ساز کے پردے ہیں۔ پردۂ محمل تو خود بخود اُٹھ جائے گا۔ بشرطیکہ ہم ان پردوں کو دور کر سکیں۔ جو ہماری غفلت اور ناعاقبت اندیشی کے ہاتھوں حائل ہوگئے ہیں۔ جب تک ہم اپنے آپ کو اس قابل نہیں بنا لیتے کہ وہ ہمیں اپنے دیدار سے مسرور کرے۔ یہ دوسرے پردے بھی قائم رہیں گے ؂

چشمِ نامحرم سے غافل روئے لیلیٰ ہے نہاں　　ورنہ اک دھوکا ہی دھوکا پردۂ محمل کا ہے

ہماری غفلتوں کے پردے ہی وصالِ محبوب کے راستہ میں حائل ہیں۔ کسی جگہ ان پردوں نے تنعم و تعیش کی شکل اختیار کر رکھی ہے اور کسی جگہ افلاس اور فاقہ پرستی کی۔ لیکن دونوں صورتوں میں یہ سامانِ غفلت ثابت ہوتے ہیں۔ جہاں یہ سامانِ دنیوی کی شکل میں نمایاں ہیں۔ وہاں صاحبِ سامان اسی جہاں کو سب کچھ سمجھے ہوتے عاقبت سے غافل ہے۔ وہ اپنی طاقت کے زعم میں ظلم کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ سے جو سراسر محبت و رافت ہے، دور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جہاں دوسری صورت ہے، وہاں یا تو کسبِ معیشت کی کشمکش اتنی سخت ہے کہ ہمیں پیٹ پالنے کے لئے سیکڑوں جتن اور دغا فریب کرنا پڑتے ہیں۔ یا ہم دوسروں کو عیش کرتے دیکھکر دہریت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ہم خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدائے عادل کی موجودگی میں ایک جگہ مارے فاقوں کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوں اور دوسری جگہ حیوانوں کے آگے بارہ پکوان رکھے ہوں۔ غرض آرام و آسائش ہو یا عسرت و کلفت۔ دونوں گمراہ کرنیوالی چیزیں ہیں ؂

پردۂ غفلت وہی ہے بس نظر کا فرق ہے　　خواب رنگا رنگ یا خوابِ پریشاں دیکھنا

آپ نے دیکھا کہ افلاس بذاتِ خود راستہ سے بھٹکانے والی چیز نہیں بلکہ جب وہ بہتات کے مقابلہ میں آتا ہے تو انسان اپنی حالت پر نظر کرکے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ اس جہان میں فلک بوس محلات۔ کے بنانے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم آخرت میں اپنے لئے مقام پیدا کریں۔ تو یہاں کی عارضی خوشیاں اپنی تمام دلکشی کھو دیتی ہیں۔ جب تک ہم اسی جہاں کو مقصدِ حیات سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم اپنے انجام سے غافل ہیں، جونہی ہماری آنکھ کھُلے گی۔ یہ سب چیزیں جو اسوقت چکا چوند پیدا کر رہی ہیں۔ آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگینگی ؂

رنگ و بوئے عارضی سے دل بہلنے کا نہیں　　فکرِ فردا ہے نظر میں خارِ دامانِ بہار

اس جہاں میں جتنا حُسن ہے تقابل سے ہے۔ ہم ایک چیز کو کریہہ اور بدصورت کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کسی خوبصورت اور دلکش چیز کا تصور ہمارے سامنے ہے ہم دنیا کی بہترین سے بہترین نعمت سے متمتع ہونا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ ہمارے نزدیک اس سے زیادہ دل پسند چیز اور کوئی نہیں۔ لیکن اگر ہم اس لذت سے واقف ہوں جو وصالِ الٰہی اور معرفتِ حقیقی میں ہے تو ہم اسے ان تمام دنیوی نعمتوں پر ترجیح دینے لگیں۔ اس دُنیا کی

شیریں (سسک کر) ہے ہے!

وکیل: سب کو بلا لو،

(شیریں لڑکھڑا کر در کھول دیتی ہے، عباس، فریدون، اور جمشید جی کی بیوی آمینہ اندر داخل ہوتی ہیں)

وکیل: کیا سارا کنبہ آ گیا ہے یا کوئی رہ گیا ہے؟

شیریں: جناب! بس سب آ چکے ہیں،

(جمشید جی سنبھالا لیکر متوحش نظروں سے دیکھتا ہے، اور پھر بالیں سے سر اٹھاتا ہے۔)

جمشید جی: کیا سب آ گئے، یہ سارا کنبہ یہاں کیوں اکٹھا ہے؛

ڈاکٹر: ہاں صاحب سب موجود ہیں!

جمشید جی: (اُدُبدا کر اور دل پہ ہاتھ رکھ کر) بے وقوف کہیں کے ..... پھر دکان کا کون نگراں ہوگا:

(جمشید جی بستر سے کود کر دروازہ سے دوڑتا ہے)

(پردہ)

ازمہد تا لحد

(حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

ہے مہد سے تا لحد بر انگیختن
صرف اتنا بٹا ہوا ہے گرمیٔ انجمن
نام اپنے کھلونوں کے بدل لیتے ہیں
اطفال بزرگ "یعنی" پیرانِ کہن۔

طفلی میں کھلونوں کی طلب میں بیتاب
پھر حسن کے جلووں کے لیے بے خور و خواب
اب ہیں زر و زن وفرزند و دل سے قربان
بڑھاپے میں [illegible] بنے بیٹھے ہیں جناب!

شاعر کی قدر

(از منشی اقبال ورما سحر ہنگامی)

رزم کی بے مثل ہندی شاعری کا باکمال — یعنی بھوشن شاعرِ خوش لہجہ و رنگیں مقال
گرچہ اس کے دل کو شیواجی سے تھا فطری لگاؤ — اور اُس کی شاعری بھی تھی اُسی کے وقفِ حال
ہاں مگر اِک مرتبہ اپنے وطن جاتے ہوئے — آ کے وہ ٹھہرا جہاں فرمانروا تھا چھتر سال
عظمتِ شاعر کا تھا رانا جو دل سے معترف — میہمانی میں نہ تھا مطلق کمی کا احتمال
یہ تو تھا لیکن شِوا کے دیکھتے رانا کے پاس — پیشکش کے واسطے گویا نہ ساماں تھا نہ مال
کچھ دنوں کے بعد ہی مہمان کی رخصت کے وقت — آخرش پیدا ہوا جب رخصتانے کا سوال
جو بھی ممکن تھا بہر صورت کیا رانا نے نذر — تھا مگر شاعر کے چہرے سے عیاں رنگِ ملال
دل میں رانا کے خیال آیا یہ اُس دم ناگہاں — ہو نہ شاعر کو کہیں تحقیر کا اپنی خیال
تو ہٹا کر جلد ہی اِک پالکی بردار کو — پالکی رانا نے خود لی اپنے کندھے پر سنبھال!
دیکھ کر شاعر وہیں اُترا زمیں پر ایک دم — آ گئے آنکھوں میں اشکِ انبساط و انفعال
رو پڑا وہ دست بستہ عرض یوں کرتے ہوئے! — "آہ کس مشکل میں رانا جی رہے ہیں مجھ کو ڈال
بدگمانی کے لئے کر دیجئے مجھکو معاف — قدر شاعر کی زیادہ اس سے ہونا ہے محال
میں تو سمجھا تھا کہ قدر اپنی شِواجی پر ہے ختم — آپ نے اُس سے بھی بڑھکر آج قائم کی مثال!"
یہ کہا اور اُس جگہ سے ہو گیا خوش خوش رواں — لے کے خود اِس واقعہ سے ایک پُر اُمید فال

یعنی بھوشن کی نگاہوں میں ثنا کے مستحق
اب سے تھے دو لو شِواجی اور رانا چھتر سال

میرزا واجد حسین یاسؔ یگانہ لکھنوی

(آیاتِ وجدانی پر ایک نظر)

از مسٹر مالک رام ایم اے۔ ایل ایل بی

بیا در یدہ گرایں جا بود زباندانے غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد غالبؔ

مُدتوں تک اُردو شاعری کا سرمایہ جذباتِ عشقیہ رہا۔ تا آنکہ اِسمیں تنوع پیدا ہوا اور قصیدہ اور مرثیہ بھی موضوعاتِ شاعری قرار پائے۔ نظیرؔ اکبرآبادی غالباً پہلا اُردو شاعر ہے۔ جس نے اپنی شاعری کیلئے وسیع میدان چُنا اور جو صحیح معنوں میں قومی شاعر کہلا سکتا ہے مگر افسوس اُس پر کافی توجہ نہیں دی گئی۔ اور جس داد کا وہ مستحق ہے۔ وہ اُسے نہیں ملی۔ حالانکہ وہی ایک شاعر ہے جو ملک کی زیادہ سے زیادہ آبادی کے خیالات کا ترجمان ہے۔ اور جسے ہم بلاخوفِ تردید دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھار بعض شاعروں نے تصوف پر بھی خامہ فرسائی کی۔ لیکن عام طور پر اُردو شعراء عشق و محبت کے مضامین ہی لکھتے رہے۔ یہ شرف غالبؔ کیلئے تھا کہ اُنھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ پیدا کی۔ اور حُسن و عشق کے ساتھ ساتھ فلسفہ کو بھی موضوعِ فکر بنایا اور اِسمیں شک نہیں کہ وہ اس میں حیرت انگیز حد تک کامیاب ہوئے۔ نقشِ اول ہی اتنا کامیاب رہا کہ تعجب ہوتا ہے۔ ان کے سامنے کوئی مثال موجود نہ تھی۔ جس کی وہ تقلید کر سکتے۔ بے شک اول اول اُنھوں نے بیدلؔ وغیرہ کے رنگ کا تتبع کیا۔ لیکن کچھ لوگوں کی تنقید و نکتہ چینی اور کچھ اُن کی طبعِ سلیم نے اُنھیں بتادیا۔ کہ یہ غلط راستہ ہے۔ بہرحال غالبؔ کے بعد اُردو شاعری کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اور آج تو ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر گئی

آج کی صحبت میں جس شاعر کا ذکر کرنا مدنظر ہے۔ وہ غالبؔ کے بعد کے دَور کا فرد ہے۔ عشق و محبت کے مضامین وہ بھی لکھتا ہے۔ لیکن خال خال۔ اِس کا دِل پسند موضوع فلسفۂ وحیاتِ انسانی ہے۔ آیندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے کہ وہ اِس باب میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔

(۲)

عظیم آباد نہایت قدیم زمانہ سے اُردو علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ جن دنوں دہلی میں مغلیہ سلطنت شمعِ سحری بنی ہوئی تھی۔ مقامی اُمراء کی سرپرستی میں عظیم آباد اُردو زبان کی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ راسخؔ اور فریادؔ جیسے

رہنے والے تھے۔ راسخ عظیم آبادی میر کے معاصرین میں تھے۔ ان کا کلام سلاست اور، دل نشینی اور گھلاوٹ میں اپنے نامور معاصروں سے کسی طرح کم نہیں۔ متاخرین میں حضرت شاد عظیم آبادی کا نام کسی سے مخفی نہیں، وہ حال ہی میں ہم سے جدا ہوئے۔ مگر ہماری ناقدری کا یہ عالم ہے کہ آج شاد کا کوئی مجموعۂ کلام دیکھنے کو نہیں ہے۔

میرزا واجد حسین یاس یگانہ بھی اسی عظیم آباد کی خاک سے پیدا ہوئے، اور جب تک عظیم آباد میں رہے۔ یاس تخلص کرتے رہے۔ مگر ۱۹۰۵ء میں طبی ضرورتوں کے ماتحت لکھنؤ کا سفر کیا۔ اور یہاں کی فضا انھیں کچھ ایسی بھا گئی، کہ یہیں کے ہو رہے۔ آخر یہیں شادی کرلی۔ اور عظیم آبادی ثم لکھنوی ہوگئے۔ بعض ادبی معرکوں کی یادگار میں اپنا جدید تخلص یگانہ رکھا۔ چنانچہ اب وہ ملک میں میرزا یاس یگانہ یا صرف میرزا یگانہ کے نام سے مشہور ہیں۔

میرزا صاحب کی ابتدائی تعلیم جناب حسرت عظیم آبادی اور بیتاب عظیم آبادی کی نگرانی میں ہوئی اور اس کے بعد وہ خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے۔ اس وقت تک اُن کے کلام کے تین مجموعے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ نشترِ یاس (لکھنؤ) جسمیں ۱۹۱۴ء تک کا کلام ہے، آیاتِ وجدانی ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوئی اور اسمیں نشترِ یاس کا انتخاب بھی شامل ہے۔ ترانہ نام سے ۱۹۳۳ء میں اُن کی رباعیوں کا مجموعہ بھی لاہور سے شائع ہوا۔

جیسا میں لکھ چکا ہوں۔ میرزا یاس کا دل پسند موضوع فلسفۂ حیاتِ انسانی ہے، انسان اشرف المخلوقات ہے۔ ہمیں اپنے اردگرد جو جہانِ رنگ و بو نظر آتا ہے۔ وہ سب انسان کیلئے ہے۔ فطرت کے ارتقاء کا منتہائے مقصود ہستیِ انسان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ہستی کا مطالعہ کسقدر مشکل اور مہتم بالشان چیز ہے۔ میرزا صاحب نے انسان اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کا غائر مطالعہ کرکے اپنے نتائج فکر ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔

(۳)

ہستیِ باری تعالیٰ کا ایک زبردست ثبوت انسانی عزم کی ناکامیابی میں مضمر ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ انسان حصولِ مقصد کے لئے تمام دنیوی سامان مہیا کرتا ہے اور ایک شاطر کی طرح تمام مرحلوں کو سوچ بچار کر راہ کی تمام رکاوٹوں کے تدارک کا انتظام کرکے اپنی جگہ مطمئن ہوجاتا ہے کہ اب ضرور فتح و ظفر میرے قدم چومے گی لیکن عین اُسوقت جب اُسے عروسِ مُدعا کا رُخ نظر آنے لگتا ہے۔ اور وہ اس اُمید میں سرشار ہوتا ہے کہ اب کوئی دم میں پالا مار لیا۔ کوئی ایسا غیر متوقع حادثہ پیش آتا ہے کہ سارا کھیل تلپٹ ہوجاتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی عزائم و انتظامات کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی ہے۔ جو اِس سے زیادہ قادر و توانا ہے۔ جو اِس کے ارادوں کو لمحہ بھر میں درہم برہم کرسکتی ہے۔ اور جس کی مدد کے بغیر انسان کسی ارادہ کو فعل میں تبدیل نہیں کرسکتا۔ عرفتُ ربّی

بفسخ العزائم" میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا۔ دیکھئے یگانہ نے بھی اسی حقیقت کو کس قابلیت سے اور کیسی شگفتہ زبان میں بیان کیا ہے ؎

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے	وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

انسان کا فرض ہے کہ اپنے خالق سے تعلق پیدا کرے۔ دہریت سے زیادہ ناشکری کوئی نہیں ہوسکتی۔ آزادی بڑا دلکش لفظ ہے لیکن وہ کشتی جس کو ساحل سے لگانے کیلئے کوئی رسی نہیں اور وہاں قائم رکھنے کیلئے کوئی میخ نہیں، وہ طوفان کے رحم پر ہے۔ جو اُسے جہاں چاہے بہالے جائے۔ لیکن اگر اسے ساحل سے لگانے کیلئے رشتہ قائم ہے۔ تو وہ دریا کی سیر کے بعد بھی اپنے مامن وماوا میں پہنچ سکتی ہے۔ بعینہ یہی حال اس شخص کا ہے۔ جو کسی خاص سلسلہ میں منسلک نہیں۔ وہ دوسروں کے خیالات کے ریلے میں جلد بہہ جاتا ہے۔ چونکہ اس کا اپنا مرکز کوئی نہیں ہوتا۔ اس لئے اُس کی ساری عمر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے میں گذر جاتی ہے۔ اسی لئے کہا ہے ؎

کسی کے ہو رہو، اچھی نہیں یہ آزادی	کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

لیکن مشکل یہ ہے کہ ؎

شاہدِ نادیدہ را آثار نتواں یافتن	دسترس بر پردۂ اسرار نتواں یافتن

اس گتھی کو سلجھانے کیلئے جب ہم اپنے ارد گرد نظر ڈالتے ہیں۔ تو ذرہ ذرہ اس یوسف پنہاں تک ہماری رہبری کرنے کو موجود ہے۔ انسان کا فطری ذوق شاہد ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی پیدائش اور اس کا اصول پر جاری رہنا اس امر کا مقتضی ہے کہ پس پردہ کوئی ہستی اس نظام کی باگ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ جیسے ہم مسافر کا کھوج اس کے قدموں سے لگالیتے ہیں۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت یہ نظامِ عالم ہے۔

ذوق می تواں دانست رنگِ حسنِ نادیدہ	ہست شاہد عادل بوئے پیرہن تنہا

پھر یہی نہیں کہ ہم ہی وصالِ حقیقی کے مشتاق ہیں۔ بلکہ اس کا ان نشانات کو پیدا کرنا جو اس تک ہماری رہبری کرتے ہیں اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ خود بھی اس کا خواہش مند ہے۔ البتہ اس کیلئے ہمارے دل میں سچی طلب اور خواہش ہونا لازم ہے۔ جب یہ چیز پیدا ہو جائے گی وہ خود ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچانے کے اسباب مہیا کردیگا

بوئے یوسف خود دلیلِ منزلِ مقصود ہے	جذبِ صادق غائبانہ رہنما ہو جائیگا

لیکن خدا کی رہنمائی کا طریقہ ہم انسانوں کے طریقہ سے مختلف ہے۔ وہ جس زبان میں گفتگو کرتا ہے اسے سمجھنے کیلئے خاص صلاحیت کی ضرورت ہے۔ نہ صرف وہ چیزیں جو ہماری آنکھوں کو حسین و دلکش نظر آتی ہیں۔ اس کی قدرت کی مظہر ہیں۔ بلکہ دنیا کی تمام اشیاء، خواہ وہ ہمارے معیارِ حسن کے مطابق خوبصورت ہوں یا بدصورت خالق کی صنعت کا کامل نمونہ ہیں۔ اور اگر ہمارا ادراک صحیح ہو، تو ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ کونسی چیز خوبصورت ہے اور کونسی بدصورت۔ کیونکہ جب ہم یہ خیال کریں گے کہ یہ سب اشیاء

حُسنِ ازل کی مختلف صورتیں ہیں۔ تو ہمارے لئے بدصورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا ؂

خامۂ قدرت کی ہر صنعت ہے آپ اپنی مثال　　امتیازِ خوب و زشت آنکھوں کو مشکل ہوگیا

صرف پھول ہی معرفتِ الٰہی کے نکات نہیں بتاتے۔ بلکہ کانٹے بھی مطالب کی ایک دُنیا اپنے اندر لئے ہوتے ہیں۔ البتہ دیکھنے والی آنکھ اور سمجھنے والا دماغ چاہیئے۔ جب یہ چیزیں حاصل ہو جائیں۔ تو پھر ہمارے لئے کانٹوں کی زبان بھی اتنی ہی فصیح و بلیغ اور آسان ہوگی جتنی پھولوں کی ؂

حُسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں　　معنیٔ بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر دنیا کی تمام اشیا جمالِ خداوندی کی مظہر ہیں۔ تو کیا وجہ کہ دُنیا میں کفر اور ایمان دونوں قائم ہیں۔ کیوں تمام دُنیا ہستیِ باری تعالیٰ کی قائل نہیں ہو جاتی؟ ظاہر ہے کہ جبتک یہ دُنیا قائم ہے۔ مختلف اشیا کے مختلف طبائع پر علیحدہ علیحدہ اثرات ہوں گے۔ ہم آئے دن دُنیا میں اسکی مثالیں دیکھتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں کہ چلّو میں اُلّو ہو جائیں۔ اور ایسے بلا نوش بھی ہیں کہ خُم کے خُم چڑھا جائیں۔ اور اُنھیں محسوس تک نہ ہو۔ بعض کے لئے ایک قطرہ زہر کا قطعِ حیات کیلئے کافی ہے اور ایسے بندگانِ خدا بھی ہیں۔ جو سانپوں کو گاجر مولی کی طرح کھا جاتے ہیں۔ سچ ہے ؂

وہی ساقی، وہی ساغر، وہی شیشہ، وہی بادہ　　مگر لازم نہیں ہر ایک پر یکساں اثر ہونا

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اِن اشیا کی ظاہری شکل و صورت سے گذر کر اُن کے بطون تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ جو لوگ چھلکے تک رہتے ہیں وہ اس معرفت کے حصول میں لازماً ناکام رہتے ہیں۔ جو اُن کے مغز میں پوشیدہ ہے۔ بے شک ان کا ظاہر بھی بہت دلکش اور دلفریب ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان اُن کی کُنہ تک پہنچ جائے۔ تو ان کی ظاہری دلفریبی آنکھوں سے گر جائے ؂

صورت پرست کب ہوتے معنی سے آشنا　　عالم فریب طُور کا افسانہ ہوگیا

بعض لوگ اِس امر کیلئے رہبر کی تلاش میں سرگشتہ و حیران پھرتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سفر میں صحیح رہبر نہیں ملتا۔ یہ نام نہاد رہبر خود لیلیٰ مطلوب کی شکل سے اُتنے ہی ناآشنا ہیں، جتنے ہم۔ پھر وہ ہماری کیا رہبری کریں گے۔ اِسی لئے پوچھتے ہیں ؂

سیکڑوں آوارۂ صحرا نظر آئے مگر　　کوئی صورت آشنا بھی صاحبِ محمل کا ہے؟

ایسے لوگوں کی شکلیں بہت گمراہ کن ہوتی ہیں۔ یہ لوگ شکل سے خدا رسیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ مذہب کے ظاہری احکام کے سختی سے پابند ہوتے ہیں۔ اِس لئے انسان سرسری نظر میں دھوکا کھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ بھی منزلِ مقصود سے اتنے ہی دُور ہوتے ہیں جتنا رندِ بادہ نوش۔ اِس معاملہ میں صحیح دلیلِ راہ

ہمارا قلبِ مصفا اور ضمیرِ حق شناس ہوتا ہے۔ ایک ریاکار "مرشد" پر ایک دِل پاکیزہ کو ہر حالت میں ترجیح حاصل ہے ؎

کیست ازیں ہر دو کہ بکشایدِ درے از معرفت زاہدِ شب زندہ دارے یا دِلِ بیدارِ ما

زاہد ظاہر پرست کے نزدیک ایمان ان باتوں میں مضمر ہے کہ انسان صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھکر نمازیں پڑھے کہ اس کی پیشانی پر گھٹے پڑ جائیں۔ لیکن اگر یہی ایمان ہے تو پھر ایک حیوان بھی تعلیم سے اِنسان بن سکتا ہے۔ تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ کتنے طوطے بھی ہم انسانوں کی طرح باتیں کرتے تھے

دراصل ایمان اور خدا پرستی اور اتقاء کا فیصلہ اعمال سے ہے۔ اِس اعتقاد سے بھلا کیا حاصل جسکا نتیجہ اعمالِ نیک نہیں ہوتا۔ جسطرح محض باتیں کرلینے سے حیوان اِنسان نہیں بن سکتا۔ بلکہ اِس کیلئے اِنسانوں کے سے اعمال کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کوئی اِنسان محض ظاہری اور بیرونی رسومِ مذہب ادا کرلینے سے باخُدا نہیں بن سکتا۔ بلکہ اِس کے ساتھ تزکیۂ نفس اور عملِ صالحہ بھی لازم ہیں ؎

پڑھ کے دُو کلمے اگر کوئی مسلماں ہو جائے پھر تو حیوان بھی دو روز میں انساں ہو جائے

دِلِ بیدار بھی ایک عجیب نعمت ہے۔ اس کے استغنا اور بے نیازی کی کوئی حد نہیں۔ اسے کامیابی پر کوئی خوشی نہیں اور ناکامیابی پر غم نہیں۔ وہ اپنا رہبر آپ ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ؎

یہ دِلِ بے مُدعا۔ بیگانۂ اُمید و بیم غرق ہوکر آپ اپنا ناخُدا ہو جائے گا

اگر خدا کسی کو ایسا دلِ بیدار ودیعت کردے۔ تو پھر اس شخص کو اس کے احکام کی پابندی میں کسی طرح کی جھجک روا نہیں رکھنا چاہیئے۔ ایسے دِل کا فیصلہ شاذ ہی غلط ہوتا ہے۔ اس لئے جب وہ کسی سمت چلنے کو کہے، تو سمجھ لو۔ کہ منزلِ مقصود کا راستہ یہی ہے۔ پھر کسی بدرقہ کا انتظار کرنے میں اپنی راہ کھوٹی مت کرو ؎

ہزار ہاتھ اسی جانب ہے منزلِ مقصود دلیلِ راہ کا کیا غم ملا ملا یا نہ ملا

اگر ہم ایسے دِل کے ساتھ تعاون کریں۔ تو وہ سلوک کی منزلیں جلد جلد طے کرکے خود اللہ تعالیٰ کے نزول کا مقام بن جائے گا۔ ایسے شخص کی قوتِ مدرکہ بھی غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہے ؎

عشق سے آئینۂ ادراک کے جوہر کُھلے خانۂ دل شاہدِ معنی کی منزل ہو گیا

لیکن شاہدِ حقیقی کے دیدار کے راستہ میں ایک کی جگہ دو دو رکاوٹیں ہیں۔ ایک تو خود خداوند تعالیٰ نے اپنے گرد کئی ایک حجابات کا حصار کھینچ رکھا ہے۔ دوسرے ہماری نظر دنیوی اسباب کے سبب ان حجابات کے اس طرف جمالِ ازلی کے نظارہ کی نعمت حاصل کرنیسے محروم رہتی ہے ؎

حضرتِ مجنوں کجا۔ نظارۂ لیلےٰ کجا ایک پردہ آنکھ کا ہے دوسرا محمل کا ہے

لیکن دراصل وہ پردے جو خدا کی طرف سے ہیں، وہ سب عارضی ہیں۔ خدا ان پردوں کے ذریعہ خود بولتا ہے یہ پردے ساز کے پردے ہیں۔ پردۂ محمل تو خود بخود اُٹھ جائے گا۔ بشرطیکہ ہم ان پردوں کو دور کر سکیں۔ جو ہماری غفلت اور ناعاقبت اندیشی کے ہاتھوں حائل ہو گئے ہیں۔ جب تک ہم اپنے آپ کو اس قابل نہیں بنالیتے کہ وہ ہمیں اپنے دیدار سے مسرور کرے۔ یہ دوسرے پردے بھی قائم رہیں گے ؎

چشم نامحرم سے غافل روئے لیلیٰ ہے نہاں ورنہ اک دھوکا ہی دھوکا پردۂ محمل کا ہے

ہماری غفلتوں کے پردے ہی وصالِ محبوب کے راستہ میں حائل ہیں۔ کسی جگہ ان پردوں نے تنعم و تعیش کی شکل اختیار کر رکھی ہے اور کسی جگہ افلاس اور فاقہ پرستی کی۔ لیکن دونوں صورتوں میں یہ سامانِ غفلت ثابت ہوتے ہیں۔ جہاں یہ سامانِ دنیوی کی شکل میں نمایاں ہیں۔ وہاں صاحبِ سامان اسی جہاں کو سب کچھ سمجھے ہوئے عاقبت سے غافل ہے۔ وہ اپنی طاقت کے زعم میں ظلم کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ سے جو سراسر محبت و رافت ہے، دُور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جہاں دوسری صورت ہے، وہاں یا تو کسبِ معیشت کی کشمکش اتنی سخت ہے کہ ہمیں پیٹ پالنے کے لئے سیکڑوں جتن اور دغا فریب کرنا پڑتے ہیں۔ یا ہم دوسروں کو عیش کرتے دیکھکر دہریت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ہم خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدائے عادل کی موجودگی میں ایک جگہ مارے فاقوں کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوں اور دوسری جگہ حیوانوں کے آگے بارہ بارہ پکوان رکھے ہوں۔ غرض آرام و آسائش ہو یا عسرت و کلفت۔ دونوں گمراہ کرنیوالی چیزیں ہیں ؎

پردۂ غفلت وہی ہے بس نظر کا فرق ہے خواب رنگا رنگ یا خوابِ پریشاں دیکھنا

آپ نے دیکھا کہ افلاس بذاتِ خود راستہ سے بھٹکانے والی چیز نہیں بلکہ جب وہ بہتات کے مقابلہ میں آتا ہے تو انسان اپنی حالت پر نظر کر کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ اس جہان میں فلک بوس محلات کے بنانے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم آخرت میں اپنے لئے مقام پیدا کریں۔ تو یہاں کی عارضی خوشیاں اپنی تمام دلکشی کھو دیتی ہیں۔ جب تک ہم اسی جہاں کو مقصدِ حیات سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم اپنے انجام سے غافل ہیں؛ جونہی ہماری آنکھ کھلے گی۔ یہ سب چیزیں جو اسوقت چکاچوند پیدا کر رہی ہیں۔ آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگینگی ؎

رنگ و بوئے عارضی سے دل بہلنے کا نہیں فکرِ فردا ہے نظر میں خارِ دامانِ بہار

اس جہاں میں جتنا حُسن ہے تقابل سے ہے۔ ہم ایک چیز کو کریہہ اور بدصورت کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کہ کسی خوبصورت اور دلکش چیز کا تصور ہمارے سامنے ہے ہم دنیا کی بہترین سے بہترین نعمت سے متمتع ہونا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ ہمارے نزدیک اس سے زیادہ دل پسند چیز اور کوئی نہیں۔ لیکن اگر ہم اس لذت سے واقف ہو جائیں جو وصالِ الٰہی اور معرفتِ حقیقی میں ہے تو ہم اسے ان تمام دنیوی نعمتوں پر ترجیح دینے لگیں۔ اس دُنیا کی

اعلیٰ سے اعلیٰ چیز حتیٰ کہ ہمارا قلبِ مصفیٰ بھی اس کے حُسن کا مقابلہ نہیں کرسکتا ؎

آئینۂ سکندری۔ جامِ جم اور قلبِ صاف　　آنکھوں سے آج گِر گئے روئے نگار دیکھکر

دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔ ایک چھلکا ہے دوسرا مغز۔ ایک اصل ہے دوسرا نقل۔ جن لوگوں نے اُسکا نظارہ کیا ہے۔ یہ دُنیا اُن کی نظروں میں نہیں جچ سکتی ؎

حُسنِ معنی کے جو شیدا ہیں اِدھر کیا دیکھیں　　صورت آباد جہاں کم نہیں ویرانے سے

اگر کوئی اس کے حسن کو لفظوں میں بیان کرنا چاہے۔ تو یہ ناممکن ہے۔ تُلسی داس ایک جگہ رام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اس زبان سے رام کے حُسن کا کیا بیان ہوسکے۔ کیونکہ جن آنکھوں نے اُسے دیکھا ہے۔ اُن کے زبان نہیں کہ جو کچھ دیکھا ہے، بیان کرسکیں۔ اور زبان جو بیان کرسکتی ہے، اُس نے کچھ دیکھا نہیں۔ واقعی دُنیا کی کوئی لذت اِس سرور کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جو اِنسان کو لقائے خداوندی سے حاصل ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو اس کا ذاتی تجربہ نہیں۔ انھیں اس کا یقین دلانا مشکل ہے، انھیں اس کا کسی طرح اعتبار نہیں آئیگا ؎

ناآشنائے حُسن کو کیا اعتبارِ عشق　　اندھوں کے آگے بیٹھ کے رویا نہ کیجئے

(۴)

انسانی روح کے متعلق عقائد میں اختلاف ہے۔ ہندو مذہب اُسے ازلی اور ابدی مانتا ہے۔ اور اس کی ہستی کو اسی وقت سے تسلیم کرتا ہے۔ جب سے خُدا اور مادہ ہیں۔ دوسرے مذاہب اس کے حدوث میں یقین رکھتے اور خدا کو اس کا آفرینندہ قرار دیتے ہیں۔ اس صورت میں بھی اس کی پیدائش کا کوئی وقت متعین نہیں ہوسکتا۔ اور اگر اُسے ازلی قرار نہ دیا جائے۔ تو بھی اس کی قدرت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

روح کا مختلف قالبوں میں پیدا ہونا بھی ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ ہندو تو آواگون کے قائل ہیں ہی۔ بعض اکابرِ اسلام بھی اِسی عقیدہ کے مؤید نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا رُوم علیہ الرحمۃ کا مشہور شعر ہے ؎

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام　　ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ روح بارہا عالمِ وجود میں آچکی ہے۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے مقصدِ حیات کو نہیں پہنچی۔ میرزا یگانہ بھی اسی اصول کے قائل نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں ؎

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر　　ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

روح اپنی فطرت میں آزاد ہے اور جتنی یہ اپنی اصل میں لطیف ہے۔ اتنا ہی یہ جہان مادی اور کثیف ہے۔ لیکن خدا کی شان کہ یہی روح اس جہان کی ظاہری دلکشی سے دھوکا کھاجاتی ہے اور اس پر کچھ اس طرح لٹو ہوتی ہے کہ اپنے مبداء اور مقصد کو بھی بھول جاتی ہے ؎

وحشت آبادِ جہاں کی دل فریبی دیکھئے — سیکڑوں آزاد پابند سلاسل ہوگیا

روح کی پیدائش کا مقصد تزکیہ کے ذریعہ حُسنِ حقیقی کی طرف صعود اور بالآخر اس سے اتصال ہے۔ جب یہ اس جہان کی آلائشوں میں پھنس کر گمراہ ہوجاتی ہے۔ تو وہ مقصد گویا اس کے سقوط پر حیران ہوتا اور تمسخر اُڑاتا ہے کہ یہ کس کام کیلئے پیدا ہوئی تھی اور کس طرح راہ سے بھٹک گئی ہے ؎

ہنستا ہے عشق مجھ کو گرانبار دیکھکر — زندانِ آب و گل میں گرفتار دیکھکر

اگر وہ دینوی امور میں بھی کامیاب ہوجاتی تو بھی ایک بات تھی۔ لیکن یہاں بھی وہ راہ بھولے ہوئے مسافر کی طرح بھٹکتی رہتی ہے۔ کیونکہ یہاں کے حالات اس کے موافق نہیں ہوتے ؎

عجیب بھول بھلیاں ہے منزلِ ہستی — بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کارواں اپنا

لیکن جب بھی یہ کسی نئی آلائش میں ملوث ہونے لگتی ہے، تو ضمیر اُسے چوکنا کرتا اور اسے اس کی گمراہی کا احساس کراتا ہے ؎

دلِ بیدار نے گھبرا کے مجھے چونکایا — نفس نے جب کسی مشکل میں پھنسانا چاہا

اصل مشکل اِس نفس کو زیر کرنا ہے۔ جب تک یہ ضمیر کے ماتحت نہیں ہوتا۔ روح کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔ لیکن نفس کے خلاف جنگ کرنیسے اِنسان کو کئی طرح کی جسمانی آسائشوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اسے اپنی خواہش سے محنت اور عُسرت کی زندگی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ بہرحال ایسا اِنسان اگر اس جہان میں کوئی ہے، ہر طرح سے داد کا مستحق ہے۔ اس کا مقصد بھی قابلِ تعریف ہے اور اس کی کوشش بھی قابلِ تعریف ؎

زہے مقصد جہادِ نفس کو تیار ہوجانا — خوشا ہمت خود اپنے درپئے آزار ہوجانا

جو شخص دُنیا کے سحر سے آزاد ہوجائے اور اپنی روح کو جسمانی لذتوں سے مستغنی کرنے میں کامیاب ہوجائے اُس نے گویا دوبارہ زندگی پائی۔ کیونکہ مقصدِ حیات تو روح کو منازلِ ترقی پر لے جانا ہے۔ اگر یہ مقصد ہی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ تو اِس انسان کا عدم اور وجود برابر ہے ؎

نگاہِ یاس میں گویا دوبارہ زندگی پائی — جو چونکا خوابِ غفلت کے مزے سے آشنا ہوکر

اِس بیداری کی حالت میں روح اُن اوقات کے ضائع ہونے پر سخت پشیمان ہوتی ہے جو اُس نے شیطان کی ماتحتی میں گذارے تھے۔ شیطان کی تقلید کا اس کے سوا اور نتیجہ بھی کیا ہوسکتا تھا۔ کیونکہ اُسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ روح کو معرفت کے کام میں مدد دے۔

نفس سے صلح کا انجام یہی ہونا تھا — اپنی ہر سانس پہ رہ رہ کے پشیماں ہونا

[illegible]

ہوتا ہے کہ میں جسے بیداری سمجھے بیٹھی تھی، وہ خوابِ غفلت سے بھی سوا تھی۔ اب وہ عمرِ رفتہ پر ہاتھ ملنے لگتی ہے۔ کہ میں نے کیوں قیمتی وقت ضائع کیا ؎

عمرِ بیداریٔ موہوم کے دھوکے میں کٹی   اب جو چونکے ہیں تو آپ اپنا گلا کرتے ہیں

جب تک انسان حیاتِ دنیوی ہی کو معراجِ زیست خیال کرتا ہے۔ وہ موت کے نام سے کانپ اٹھتا ہے لیکن جونہی اُسے اِس امر کا احساس ہوتا ہے کہ روح لافانی ہے اور جب تک یہ اِس جسدِ عنصری میں قید ہے، ترقی نہیں کرسکتی۔ تو وہ زندگی سے بیزار ہوجاتا ہے۔ اُسے ہر وقت ملاءِ اعلیٰ میں پرواز کی خواہش اپنی موجودہ حالت سے غیر مطمئن کئے رکھتی ہے۔ اب وہ اِس انتظار میں رہتا ہے کہ کب مجھے اس قیدِ جسم سے چھٹکارا ملے کہ میں اپنے خالق کے وصال سے مستفیض ہوں ؎

تصور سے کبھی خوابِ اجل کے کانپ اُٹھنا   کبھی تعبیر سُن کر جان سے بیزار ہوجانا

ہوسِ عالمِ بالا نے کیا ہے دِل تنگ   روح گھبرا گئی اب جسم کے کاشانے سے

اب وہی موت جو دوسروں کے لئے رنج و غم کا مقام ہے۔ ایسے شخص کیلئے مقامِ شکر بن جاتی ہے ؎

موت آئی، آنے دیجئے، پروا نہ کیجئے   منزل ہے ختم، سجدۂ شکرانہ کیجئے

روح اپنی خصوصیات میں اَمر اور لافانی ہے۔ اُسے بھلا جسمانی موت سے کیا ڈر۔ موت تو اُسے اِس دنیا کی مادّی آلائشوں سے پاک کرکے اپنے اصل کے قریب لے جانیوالی چیز ہے۔ وہ اس سے کیوں گھبرائے۔ گویا وہی موت جو ایک دُنیا کے کیڑے کیلئے فنا کا پیغام ہے۔ بیدار روح کے لئے حفاظت کی ضامن ہے۔ وہ اِس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ کیونکہ اِس دُنیا میں اس کی صلاحیتوں کو میدانِ ترقی نہیں ملتا اور اب اُسے عالمِ بالا میں پرواز کا موقعہ ملے گا ؎

اجل[1] سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا   خدا کی شان کہ دشمن نگاہباں نکلا

اب اپنی روح ہے اور سیرِ عالمِ بالا   کوئیں سے یوسفِ گم گشتہ کارواں نکلا

جہنم اور جنت تو ہماری اصطلاحیں ہیں۔ روح کے لئے یہ مقامات بے معنی ہیں۔ وہ خود لامکاں ہے، اور اِس جسم کی قید سے آزاد ہوکر اعلیٰ سے اعلیٰ ترقیوں کی طاقت رکھتی ہے ؎

جہنم ہو کہ جنت، طائرِ جاں تھم نہیں سکتا   کہیں پرواز کی حد مل سکے گی لامکاں ہوکر

اس کی ہستی کی معراج یہ ہے کہ وہ پھر مبداءِ حقیقی سے مل جائے اور مسافر جو بہت دِن باہر بھٹکتا رہا ہے۔ آخر اپنے مستقر میں پہنچ جائے۔ وہ اس کا ایک کٹا ہوا حصّہ تھی اور وہیں آخر پہنچ گئی۔ وہی روح جو جسم کی

---

[1] "اجلکَ حافظک" (قولِ حضرت علیؓ)

قید میں تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ اس نئی غلامی میں انتہائی مسرت محسوس کرنے لگتی ہے۔ وہ اور سب کچھ برداشت کرلے گی لیکن پھر ایک بار اس سے مفارقت اسے سخت شاق گذرتی ہے۔ دیکھئے یہ مفہوم کس والہانہ انداز سے ادا ہوا ہے ؎

ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا

نہ صرف روح ہی قدیم ہے۔ بلکہ مادہ بھی اتنا ہی قدیم ہے، جتنی روح اور نہیں معلوم کہ اسکا کیا انجام ہوگا ؎

خدا معلوم اِس آغاز کا انجام کیا ہوگا چھڑا ہے سازِ ہستی مبتدائے بے خبر ہوکر

دُنیا بھی عجیب کارخانہ ہے۔ روح تو لافانی ہے۔ لیکن ہم جسے جسمانی موت سمجھتے ہیں، وہ بھی ایسی نہیں اگر ایک جگہ موت آرہی ہے۔ تو دوسری جگہ آثارِ حیات پیدا ہو رہے ہیں۔ آج تک سیکڑوں ہزاروں شہر بسے اور اُجڑے اور پھر انھیں کے کھنڈرات پر نئے شہر آباد ہوئے۔ بعض اوقات بستیوں کی بستیاں دریا بُرد ہو جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی وسیع قطعاتِ زمین پانی سے باہر آجاتے ہیں۔ غرض بسنا اور اُجڑنا توام ہے ؎

کارگاہِ دُنیا کی نیستی بھی ہستی ہے اک طرف اُجڑتی ہے، ایک سمت بستی ہے

آج جو مادّہ ہمیں اِنسانی جسم کی شکل میں نظر آرہا ہے۔ کل وہی جسم اور روح کی مفارقت کے بعد راکھ اور مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور پھر گردباد کی شکل اختیار کرلے گا ؎

خاک کا پُتلا بگولا دشت کا ہو جائے گا مٹ کے بھی ایک پیکرِ نشو ونما ہو جائیگا

(۵)

خداوند تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ اِنسان اُسکا بندہ ہے۔ بندہ کا فرض بندگی کرنا ہے۔ اگر یہ بندگی اور خدمت مالک کے معیار پر پوری اتری اور تو وہ چاہیگا تو حسنِ خدمت میں اظہارِ خوشنودی کرے گا۔ لیکن ہم اِس معیار کے متعین کرنیوالے کون؟ یہ تو اسی کے اختیار کی بات ہے۔ بندہ کے دم مارنے کی مجال نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے اعمال کے بھروسہ پر اللہ تعالیٰ کی رضا بطور حق حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی اِس لئے انسان کو اعمال کے ساتھ دُعا پر بھی زور دینا چاہئے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی کوشش کرکے اللہ کریم کے آگے گر جائے۔ کہ اے غفور الرحیم! میں نے اپنی محدود صلاحیتوں کے مطابق حقِ بندگی ادا کرنے کی کوشش کی، اُسے شرفِ قبول بخشنا تیرے اختیار میں ہے۔ میرا حق نہیں کہ میں مانگوں کیونکہ یہ صلاحیتیں بھی تیری ہی عطا کردہ تھیں۔ لیکن تیرے غیر محدود فضل وکرم سے مجھے ایسی اُمید ہے۔ یہی فلسفہ بانیٔ اِسلام نے ع "بر توکل زانوئے اشتر بہ بند"۔ میں بیان فرمایا ہے۔ یگانہ لکھتے ہیں ؎

سعادتِ ابدی ہے مشیّتِ ازلی ہوس فضول بھروسے یہ حُسنِ خدمت کے

اس کے لئے سب سے پہلے گذشتہ گناہوں سے توبہ لازم ہے۔ توبہ کے یہ معنی ہیں کہ اِنسان اپنے اعمالِ سیّئہ پر اظہارِ ندامت کرے اور آیندہ اُن کے ارتکاب سے مجتنب رہے۔ یہ نہیں کہ آج توبہ کرلی اور کل پھر وہی فعل سرزد ہوا، اور پرسوں پھر توبہ کرلی۔ یہ توبہ خدا سے گستاخی ہے۔ توبہ یہ ہے کہ احساسِ گناہ کے بعد اس پر اظہار افسوس کیا جائے اور آیندہ اس فعل کا اعادہ نہ ہو۔ الیسا ہو تو کیا کہنا ؎

شکستِ نشہ و کیفِ ندامت' واہ کیا کہنا   بجائے مے ٹپکتا ہے زلالِ اشک دامن پر

توبہ واقعی سچے دِل سے ہونی چاہیئے۔ محض خشک توبہ سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر دِل پر خشیّت طاری ہوجائے تو اِنسان کے رویئں رویئں سے ظاہر ہونے لگتا ہے کہ یہ شخص واقعی پشیمان و نادم ہے۔ اور اُس کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے ؎

پسینہ تک نہیں آتا تو ایسی خشک توبہ کیا   ندامت وہ کہ دشمن کو ترس آجائے دشمن پر

اِنسان کو چاہیئے کہ گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے گذشتہ گناہوں کی معافی مانگے اور آیندہ کیلئے توبہ کرے ؎

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے   آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی

سچی توبہ کا اِنسان کی ظاہری زندگی پر بھی نمایاں اثر پڑتا ہے۔ وہی انسان جو اپنی طاقت کے نشہ میں کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور سب اس کے دستِ ظلم سے نالاں تھے، اب انکسار و تذلّل کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اسکا ہاتھ جب اُٹھتا ہے تو کسی کو کچھ دینے کیلئے یا خدا سے کچھ مانگنے کیلئے ؎

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس   گھٹتے گھٹتے ایک دِن دستِ دُعا ہوجائیگا

(۶)

دُنیا کی بے ثباتی کا مضمون شعرائے متقدمین و متاخرین کا پامال موضوع ہے۔ میرزا یگانہ نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔

دُنیا بظاہر ایسی خوبصورت ہے، جیسے وہ باغ جو بہار میں اپنی رنگینی اور دلکشی سے جنّت نگاہ ہوتا ہے۔ لیکن بہار کے ساتھ ہی خزاں کے ڈانڈے بھی ایسے ملے ہوتے ہیں کہ یہ امتیاز مشکل ہے کہ ایک کی حد کہاں ختم ہوئی اور دوسری کی کب شروع ہوئی۔ یہ دُنیا جو آج اپنی آسائشوں کی وجہ سے بہار کیطرح خوبصورت اور مہربان نظر آتی ہے، کل اپنی کلفتوں کی وجہ سے خزاں کی طرح کریہہ اور نامہرباں بن جانیوالی ہے۔ اس لئے اس کا اعتبار کرکے اگر اِنسان چندروزہ دولت پر نازاں ہو اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس سے زیادہ دھوکا اُسے اور کیا ہوسکتا ہے۔ اِسمیں شک نہیں کہ جسوقت اِنسان نشۂ حُسن و دولت سے مست ہوتا ہے۔ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ وہ اس گھڑی کا خیال بھی نہیں کرسکتا۔ جب یہ نشہ خمار میں تبدیل

ہو جانیوالا ہے۔ لیکن چشم دوربیں سے یہ مخفی نہیں ہوتا۔ کہ اِس شبِ عیش کے بعد جو صبحِ خمار طلوع ہونیوالی ہے، وہ کسقدر فتنہ ساماں ہے، یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کا ایک بار تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ دوبارہ ایسا کرنے کا خیال بھی نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک زندگی کے رنج وغم یا عیش و مُسرت ایسی چیزیں ہیں۔ جنکی کوئی حقیقت نہیں۔ آخر دُنیا کیا ہے؟ آب و گِل کا ایک کارخانہ، لیکن اتنا حسین اور دلفریب کہ حیرانی ہوتی ہے کہ اتنی بے حقیقت چیز کے نتائج کتنے شاندار اور عالمگیر ہیں۔ جو لوگ اس کی اصل پہچانتے ہیں۔ وہ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ اور چونکہ وہ سطح سے گذر کر تہ کی خبر رکھتے ہیں۔ اِس لئے وہ اس کے دھوکے میں نہیں آتے۔ انھیں دُنیا کی بے ثباتی سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ جہاں کہیں محفلِ نشاط گرم ہوتی ہے۔ وہ اس کے خمیازہ شکن انجام کا اندازہ کر کے افسردہ دل ہو جاتے ہیں۔ غرض ان کی روشن طبعی ان کے لئے مستقل آزار کا سامان بن جاتی ہے۔ لیکن وہ واقعات کی رفتار پر قابو نہیں رکھتے کہ انھیں حسب خواہش تبدیل کر سکیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی ژرف نگاہی سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اِس لئے وہ ذہنی اور روحانی کوفت سے بچنے کیلئے دُنیا ہی سے کنارہ کشی میں عافیت دیکھتے ہیں۔ تعجب تو اُن لوگوں پر ہوتا ہے جو اس دُنیا کا اعتبار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اس کی حقیقت ایک بگولہ سے زیادہ نہیں۔ اُن کی آنکھیں کھولنے کے لئے خود دُنیا میں کافی سامان موجود ہے۔ یہاں کسی چیز کو دوام نہیں۔ جتنی زیادہ کوئی چیز دلکش اور نازک ہے اتنی ہی زیادہ وہ کمزور اور ناپائیدار ہے۔

دیکھئے اِن حقائق کو شاعر نے کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے ؎

ہوشیار اے چشمِ نرگس، اے نگہبانِ بہار ۔۔۔ ہے زوالِ رنگ و بو دست و گریبانِ بہار

یا تس اس چرخِ زمانہ ساز کا کیا اعتبار ۔۔۔ مہرباں ہے آج، کل نامہرباں ہو جائیگا

تیور بجھے ہیں صبح کے آثار دیکھکر ۔۔۔ آنکھیں کھُلی ہیں فتنۂ بیدار دیکھکر

آگ برسائے فلک یا آبِ حیوانِ بہار ۔۔۔ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے پشیمانِ بہار

کس کل پہ ہے بنائے طلسمات آب و گل ۔۔۔ اہلِ نظر ہیں نقش بہ دیوار دیکھکر

عبرت سرائے دہر سے مُنہ موڑنا پڑا ۔۔۔ آنکھوں کو اپنے درپئے آزار دیکھکر

لیلیٰ کجا۔ کجا یہ طلسماتِ عنصری ۔۔۔ کیا ڈھونڈتا ہے پردۂ گرد و غبار میں

آنکھیں دکھاتے ہیں حباب چشم ہوس کو باربار ۔۔۔ محو طلسم بندیٔ نقش و نگار دیکھکر

دکھایا گورِ سکندر نے بڑھ کے آئینہ ۔۔۔ جو سر اُٹھا کے کوئی زیرِ آسماں نکلا

(۷)

انسان کے مختار و مجبور ہونے کا مسئلہ بہت پُرانا ہے۔ دونوں فریق اپنی تائید میں وزنی دلائل پیش

کرتے ہیں۔ لیکن دُنیا کے دوسرے متنازعہ فیہ مسائل کی طرح اِس کا بھی آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ میرزا صاحب کا رجحانِ طبع جبریہ عقاید کی طرف معلوم ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جسے آپ اختیار کہتے ہیں۔ وہ اس کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ کہ اِنسان عزم وارادہ میں مختارِ کُل ہے۔ اِس پہلو سے اُس کی آزادی غیر محدود ہے چاہے تو غیر ممکن اور محال امور کی تکمیل کا ارادہ کرلے، لیکن اگر اسی پر انسان کا مختار ہونا منحصر ہے تو اس دعویٰ کی صداقت میں کسے شک ہو سکتا ہے، لیکن کیا یہ ثبوت کافی ہے، طنزیہ انداز دیکھئے ؂

اللہ رے اختیار کہ آمادہ کرلیا فکرِ محال پر دلِ بے اختیار کو

چونکہ ارادہ کا تعلق اِنسان کے دل ودماغ سے ہے۔ اور یہ چیزیں اس کے اختیار میں ہیں، اِسلئے وہ مختار ہے کہ بے شک ہوائی قلعے تعمیر کرتا رہے۔ اِس کے عجز ومجبوری کا پردہ تو اُسوقت کھلتا ہے۔ جب وہ کسی ارادہ کو فعل میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ اس وقت اسکی تکمیل میں کئی خارجی اسباب سنگِ راہ ہوجاتے ہیں۔ اِس لئے اسے اپنے ارادوں کی ناکامی پر سخت کلفت اور حسرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت یہی جی چاہتا ہے کہ سینہ سے اِس دل کو چیر پھینکا جائے۔ جس نے ہمیں ایک ایسی اُمید موہوم لگاکر مضحکۂ روزگار بنایا ؂

ارادہ سے عمل تک کچھ تو اپنا دسترس ہوتا بغل میں پالتے کیوں پاس دل سے دشمنِ جاں کو

اِنسان کی مجبوری کا اندازہ اِس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُسے اپنے آپ پر بھی پورا اختیار نہیں۔ باہر کی دُنیا تو خیر کئی مخالف طاقتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگر بعض حالات میں اِنسان یہاں ناکام رہ جاتا ہے تو اس کی ایک توجیہ ہو سکتی ہے، لیکن اپنے جسم وجان کے معاملہ میں مجبور اور کسی غیبی طاقت کے رحم پر ہونا کسقدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دیکھئے کس دردناک لہجہ میں کہا ہے ؂

کہتے ہو اپنے فعل کا مختار ہے بشر اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں

اِنسان کے اصلی ماحول اور دوسرے ساز وسامان بھی اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، حالانکہ اِن چیزوں کو وہ اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کیلئے خود پیدا کرتا ہے۔ لیکن آخر میں اپنی کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ خارجی مجبوریوں کے ساتھ ان داخلی اور خود پیدا کردہ مجبوریوں کی موجودگی میں بھی اگر کسی شخص کے خیال میں اِنسان اپنے فعل کا مختار ہے، تو اُسے یہ آزادی مبارک ہو، جو ایک جال سے کم نہیں۔ ہم تو اِس سے باز آئے۔ لیکن خود کردہ را علاجے نیست ؂

مبارک نامِ آزادی۔ سلامت دامِ آزادی دُعائیں دوں کسے یارب اسیرِ بال وپر ہو کر

اِسس مسئلہ میں تنازعہ اِس لئے پیدا ہوا۔ کہ اِنسان کی طبیعت میں مادۂ ندامت ہے، خواہ کسی وجہ سے اُسے ناکامی ہو۔ وہ اس کیلئے اِنسان کو ذمہ دار گردانتا ہے۔ حالانکہ جب حالات پر اُسے قابو نہیں تو ان حالات سے

پیدا شدہ نتائج کیلئے بھی وہ ذمہ وار نہیں، پھر ندامت کیسی؟ لیکن ضمیر اس پر بھی کوسے جاتا ہے۔ بہرحال جب انسان کی مجبوری سے جرم سرزد ہوا تو اُس پر پشیمانی اور شرمندگی کی کیا ضرورت ہے؟

بندۂ فطرت مجبور ہوں مختار نہیں ہاں ندامت میں ہے شک جرم سے انکار نہیں

لیکن ستم یہ ہے کہ یہ قید اور پابندی بھی مکمل نہیں۔ بعض حدود کے اندر انسان آزاد بھی ہے۔ یوں سمجھئے کہ گلے میں ایک لمبی زنجیر ہے۔ جہاں تک زنجیر کی حد ہے۔ وہاں تک وہ بے روک ٹوک چل پھر سکتا ہے۔ اگرچہ اس دوران میں اُسے زنجیر کی موجودگی کا برابر احساس رہیگا۔ انسان کی زندگی کی اس سے صحیح تر تفسیر مشکل سے نظر آئے گی ؎

ہاں وسعت زنجیر تک آزاد بھی ہوں میں ہستی مری مجموعۂ اضداد رہے گی

درحقیقت انسان نہایت درجہ عاجز و مجبور ہے۔ بقول غالب ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اسی طرح یگانہ کے نزدیک ؎

عمر گھٹنے کیلئے ہے۔ وقت کٹنے کے لئے مُفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

―――(۸)―――

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا۔ گویا آیات وجدانی الٰہیات و مذہبیات کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے اس مختصر مجموعہ میں نفسیات و جذبات انسانی کے بھی ایسے مکمل مرقعے ہیں۔ جن پر بے اختیار احسنت و مرحبا کہنا پڑتا ہے۔

انسانی زندگی کا سہارا اُمید ہے۔ اگر آج ہمیں یقین ہوجائے کہ ہمارا مستقبل تاریک ہے اور ہم اسے کسی طرح روشن نہیں بنا سکتے، یا تو خودکشی کرلیں، یا زندہ درگور ہوجائیں مگر امید کی بدولت دماغ طرح طرح کی خیال آرائیاں کرتا رہتا ہے۔ یہ زمیں و آسماں اس کے طلسم خیال کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتے ؎

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا عجیب شے یہ طلسم خیال ہوتا ہے

حضرت اقبال فرماتے ہیں ؎

صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ما چو گل یک جہان و آں ہم از خونِ تمنا ساختی

واقعی شاید ہی کسی خوش قسمت انسان کی کوئی اُمید برآئی ہوگی، ورنہ دُنیا کا خمیر انسانی آرزوؤں کے خون سے تیار کیا گیا ہے۔ پھر بھی ہم ہمیشہ یہی امید رکھتے ہیں کہ آج سے کل زیادہ موافقِ حال ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اسے بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی ہمارا مستقبل ہمارے سامنے کھول کر رکھ دے۔ کیونکہ ہم

ڈر ہوتا ہے کہ مبادا یہ ہمارے حسب دِل خواہ نہ ہو۔ شاعر نے اِس جذبہ کو کیسے انداز میں بیان کیا ہے۔ اسے اُمید ہے کہ میری قسمت بہت اچھی ہے۔ اگر اسمیں کوئی بات ناخوشگوار ہے تو وہ اصل میں ہنیں بلکہ میری آنکھوں کا قصور ہے۔ اُمید کی اِس سے روشن مثال شاذ ہی کہیں ملے گی۔ ذرا وثوق ملاحظہ ہو ؎

شائد خدا نخواستہ آنکھیں دغا کریں — اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا

غالبؔ کا مشہور شعر ہے ؎

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اِس کی تہ میں بھی وہی جذبۂ امید کام کر رہا ہے۔ یگانہؔ نے اِسی مضمون کو ترقی دے کر یوں کہا ہے ؎

خدا کسی کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے — قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا

آشیاں آنکھوں کے سامنے جل رہا ہے۔ لیکن دِل اِس حقیقتِ ناخوشگوار کو ماننے پر تیار نہیں۔ اِسلئے بدنصیب زندانی اُسے خواب سمجھ رہا ہے۔ کسقدر حسرتناک اور دردناک نظارہ ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر غالبؔ کا شعر نہ ہوتا تو غالباً یگانہؔ بھی یہ شعر نہ لکھ سکتے، لیکن یگانہؔ کا شعر بلحاظ زبان اور طرزِ بیان اپنے پیشرو سے بڑھ گیا ہے۔ بہرحال فضیلت پہلے ہی شعر کو ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک اور شعر بھی سُن لیجئے، غالباً مولانا تاجور کا ہے ؎

یہ کیسا خواب دیکھا ہے قفس میں — الٰہی خیر میرے آشیاں کی

سچ یہ ہے کہ ہمیں دُنیا سے جو دلچسپی ہے۔ وہ اسی وجہ سے قائم ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ کل کیا ہونیوالا ہے یہ حالت بجائے خود کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔ لیکن اِس انتظار میں بھی وہ سرور ہے کہ ہم اس پر اصل واقعہ کی سَوْ لذتیں قربان کرنے کو تیار ہیں ؎

قسم ہے وعدۂ صبر آزمائے جاناں کی — کہ لذتِ ابدی ہے تو انتظار میں ہے

زمانہ کی بے ثباتی کی سب شکایت کرتے ہیں۔ ہم آتے دن دیکھتے ہیں کہ جو کل محلوں میں رہتے تھے آج نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ یگانہؔ کا یہ شعر ضرب المثل ہوگیا ہے ؎

یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانے میں — یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

وہ عیش و عشرت کی باتیں کہانیاں بن جاتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے شکمہ کے دِن کبھی دیکھے ہی نہ تھے ؎

کل کی ہے بات جوش پہ تھا عالمِ شباب — یادش بخیر آج اک افسانہ ہوگیا

خدا نہ کرے ایسے برگشتہ بختوں کے سامنے کوئی ایسی چیز آجائے۔ جو انھیں ان ایام رفتہ کی یاد دلائے۔ بعض اوقات لوگ انھیں خوش کرنے کو ایسی چیزیں مہیا کر دیتے ہیں لیکن یہ اُن کے زخموں پر اور نمک چھڑکتی ہیں، اور

خوشی کے بجائے کوفت کا موجب بن جاتی ہیں ؎

پھینکیںگے سرِ قفس پہ ہم پھولوں کے ہار دیکھکر
سیرِ بہار آخری پھر کہیں یاد آنہ جائے

محتاجی بُری بلا ہے۔ اگر ہاتھ پھیلانے سے ہمیں مرغن پلاؤ ملے۔ تو اس سے آزادی کی نانِ جویں کہیں زیادہ ملذیذ ہے آزادانہ زیست کیسی ہی صعوبتوں سے پُر اور آرام سے خالی کیوں نہ ہو۔ اس زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جسمیں ظاہری آسائشوں کے سامان کے باوجود ہزار پابندیاں ہیں۔ دیکھئے شاعر کس شوق اور حسرت سے اِس خیال کو ظاہر کرتا ہے ؎

دِل ڈھونڈتا ہے پھر اسی اُجڑے دیار کو
یاد آئی آشیانہٗ پرخار کی خلش

اگر اِنسان کو کوئی چیز اس مقدار میں میسر آجائے کہ وہ سیر ہوجائے۔ تو اُسے اور کی خواہش نہیں رہتی۔ تنک بختی سے ہوس اور بڑھتی ہے۔ کیونکہ اس سے اس کی خواہش کی تکمیل تو ہوتی نہیں مگر منہ کو خون لگ جاتا ہے۔ جو ہر وقت اس کے سمندِ شوق کے لئے تازیانہ کا کام دیتا رہتا ہے۔

ملتا بھی ہے اک جام تو بھر کر نہیں ملتا
کچھ دِل کی لگی اور بھڑک جاتی ہے

اور جب اِنسان کی اسی کیفیت میں بسر ہو کہ کبھی سیر ہو کر دلی خواہش پوری نہ ہوئی ہو۔ تو پھر اس کیلئے تھوڑی سے تھوڑی مقدار بھی "منّ وسلویٰ" سے کم نہیں ہوتی۔ دیکھئے اِس فلسفۂ حسرت کو کیسی سادگی سے بیان کردیا ہے ؎

کہ پاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دِل کا
پیالہ خالی اٹھاکر لگا لیا مُنہ سے

لیکن اِنسان کی زندگی خواہ کتنی عسیرالحالی میں بسر ہوئی ہو۔ دُنیا بھر اس کے خلاف اور سارا زمانہ دشمن ہو۔ پھر بھی اس کارخانۂ قدرت میں کچھ ایسے دِل بستگی کے سامان ہیں۔ کہ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا آپ سڑک کے کنارے ایک لولے لنگڑے فقیر کو بیٹھے دیکھتے ہیں۔ اُسے آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اور ہر آیند و روند کے آگے ہاتھ پھیلائے پڑا ہے۔ ان میں پیسہ دینے والے کم اور جھڑکی دینے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ ہماری نظر میں اس زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ لیکن اس سے پوچھئے، وہ مرنیکے نام پر کانوں پر ہاتھ رکھیگا۔ مریض بسترِ مرگ پر پڑا ہے۔ معالج نے زندگی سے نااُمیدی ظاہر کردی ہے، وہ اور اس کے لواحقین سب مصیبت میں مبتلا ہیں۔ کھانے پینے کی کوئی چیز حلق سے نہیں اُترتی۔ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل نہیں۔ لیکن اُس سے پوچھئے کہ تم مرنا چاہتے ہو؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا ؎

واللہ کیا کشش ہے اس اُجڑے دیار میں
دُنیا سے پاس جانے کو جی چاہتا نہیں

لیکن کیا آپ اس شخص کی بدنصیبی اور حسرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کی منزلِ مقصود اس کے سامنے ہو اور تھوڑی سی کوشش سے وہ اسے حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن قدرت کی طرف سے یہ تھوڑی سی کوشش کرنے کا سامان بھی مہیا نہ ہو ؎

کیا کہیں اڑ کے جا نہیں سکتے یہ چمن ہے۔ یہ آشیانہ ہے

اگر دل میں ولولہ و جوش ہو۔ تو دنیا کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس وقت تک اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ لیکن اگر دل ہی سرد ہو جائے۔ تو پھر نہ اُمید رہتی ہے نہ خوف۔ جب انسان اس مرحلہ پر پہنچ جاتے۔ تو سمجھ لیجئے کہ وہ ایک ایسا بُت ہے، جسمیں روح نہیں ؎

ذوق جبتک ہے جبھی تک ہے بہار رنگ و بو دل ہے جبتک دل جبھی تک ہے کھٹک بھی خار میں
اُمید و بیم نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا چراغ گل ہوا جب آستانۂ دِل کا

ایسے لوگوں کے لئے بہار اور خزاں۔ یُسرت اور عسرت بے معنی الفاظ ہیں ؎

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا، بہار کیا کنج قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

جس طرح کوئی دوا ایک مدت تک استعمال کی جائے، تو وہ دوا نہیں رہتی بلکہ خوراک بن جاتی ہے اسی طرح ایک دائمی مصیبت بھی مصیبت نہیں رہتی ع "مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں"۔ کا بھی یہی مطلب ہے۔ بھلا ایسے آدمی کو کوئی رنج پہنچانا چاہے۔ تو وہ کہاں کامیاب ہو سکتا ہے ؎

عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر

اگر اسے کسی وقت کہا جائے کہ اب تیرے دن پھرنے والے ہیں۔ تو اُسے اعتبار نہیں ہوتا۔ مایوسی اور نااُمیدی اس کی حیات کا جزو لازمی بن جاتے ہیں۔ اُسے یقین ہی نہیں آسکتا۔ کہ میرے لئے بھی اس مجوزہ رونگا کے پاس کوئی پہلوئے مسرت ہے ؎

آنکھ اُٹھا کر نہ کسی سمت قفس میں دیکھا موسمِ گل کی خبر سُنتے رہے کانوں سے

وہ زندگی کے ہاتھوں تنگ آجاتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح روح کو اس جسم کے کاشانے سے آزادی ملے ؎

آگ برسائے فلک یا آبِ حیوانِ بہار زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے پشیمانِ بہار

اگرچہ انھیں یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی چین نہیں۔ غالبؔ کہتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن کا شعر ہے ؎

چھوٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے

یعنی ان دونوں کو اُمید بلکہ یقین ہے کہ اِس حیاتِ چند روزہ کے بعد غم کا نام و نشان نہیں رہے گا۔ لیکن ذوقؔ کو اِسمیں شک ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اسے یہ خوف مارے جارہا ہے کہ اب تو اس اُمید پر جی رہے ہیں کہ موت کے ساتھ ان مصیبتوں کا خاتمہ ہے لیکن اگر خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہوا تو پھر ہم تو کہیں کے نہ رہے۔ لیکن یگانہؔ کو یقین ہے کہ یہ "بندِ غم" اس "قیدِ حیات" سے ہی وابستہ نہیں۔ کہ موت کے ساتھ ٹوٹ جائے گا۔ اسے "مرکے بھی" چین پانے کی کوئی اُمید نہیں اس کے نزدیک موت سے پہلے کی زندگی اور اُس سے بعد کا زمانہ ایک ورق کے دو صفحے ہیں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک صفحہ پر ایک مضمون ہو اور دوسرے پر اور۔ یہ موت تو ورق اُلٹنے کے مترادف ہے۔ یاسؔ کی انتہا ہے ؎

قصہ کتابِ عمر کا کیا مختصر ہوا؟ رُخ داستانِ غم کا اِدھر سے اُدھر ہوا

مضمون کافی لمبا ہوگیا ہے۔ حالانکہ کئی ایک موضوع ایسے ہیں۔ جن کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ یگانہؔ نے فلسفۂ خودی پر کئی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اُنھوں نے جزئیات تک کو بیان کیا ہے۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ دعوت و درسِ عمل پر بھی مشتمل ہے۔ جس کی ایک محکوم مُلک کیلئے اشد ضرورت ہے۔ اِسمیں اُنھوں نے ابنائے وطن کو نتائج سے لاپروا ہو کر منجدھار میں کود پڑنے کا مشورہ دیا ہے۔ یگانہؔ کی زبان اور طرزِ ادا کا تذکرہ خود ایک علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے۔ اُنھوں نے اُردو زبان میں کئی نئے الفاظ اور ترکیبوں کا اضافہ کیا ہے۔ غرض کس کس چیز کا ذکر کیا جائے۔ "داماں نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار"۔ البتہ ایک موضوع ایسا ہے۔ جس پر چند لفظ لکھنے کے بعد اِس مضمون کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

کسی نے کہا ہے ؎

گر عشق نہ بودے و غم عشق نہ بودے چندیں سُخنِ نغز کہ گفتی کہ شنودے؟

مندرجہ ذیل اشعار پڑھئے اور دیکھئے کہ یگانہؔ نے حُسن و عشق کی مختلف کیفیات کو کس عمدگی سے بیان کیا ہے ؎

جلوہ گر رہنے لگا چشمِ تصور میں کوئی حضرتِ دل بے سبب راتوں کی بیداری نہیں

چپ لگی مجھ کو گناہِ عشق ثابت ہوگیا رنگ چہرے کا اُڑا۔ رازِ دلِ مضطر کھُلا

آجائے تیرا نام زباں پر تو کیا عجب
اب اپنے اختیار میں دردِ جگر نہیں

کہاں تلک دلِ غمناک پردہ دار رہے
زبانِ حال پہ جب کچھ نہ اختیار رہے

پرائے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک
حقیقت کھُل نہ جائے اضطراب رازداں ہوکر

تابِ نگاہ کی نہیں آنکھوں سے چشم داشت
کیا لَو لگائیں وعدۂ دیدارِ یار سے

عشق کا حسنِ طلب اک معنیٔ بے لفظ ہے
ٹکٹکی بندھ جائے گی مطلب ادا ہو جائیگا

ہوش اُڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھ کر
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا

پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی
دِل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھکر

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے

وفا پر بدگمانی کا گماں ابتک نہیں ہوتا
ہنوز اک حسنِ ظن ہے اپنے دلکو حسنِ بدظن پر

خوشا نصیب جسے فیضِ عشق شورانگیز
بقدرِ ظرف ملا، ظرف سے سوا نہ ملا

اسی نے خاک کیا تھا، اسی نے پاک کیا
خوشا نصیب جو پالے پڑے محبت کے

(۵)

بہر نوع یگانہ فطرت کی طرف سے ایک شاعر کا دِل و دماغ لے کر آئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انھیں زبان پر بھی ایسی قدرت حاصل ہے کہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضامین کو اُردو میں وہ نہایت آسانی سے بیان کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری زبان کے مایۂ ناز شاعر ہیں، لیکن افسوس کہ ہم نے آج تک اپنے اِس جوہر کی قدر نہیں پہچانی۔ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کی طرف سے شعر الہند شائع ہوئی ہے۔ اسمیں دَورِ حاضر کے کئی معمولی شعراء کا ذکر موجود ہے۔ لیکن یاس یگانہ کا نام تک نہیں ملتا۔ حالانکہ یگانہ کے متعلق اسی دارالمصنفین کے صدر محترم مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے ہے:۔

"یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ میرزا یاس یگانہ اپنے وقت کے ایک کامل شاعر ہیں۔ ان کے خیالات بلند، زبان صاف ستھری، ترکیبیں چُست اور کلام حشو و زوائد سے پاک ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ لکھنؤ کے طرزِ شاعری میں اُن کے ہنگاموں کے باعث مفید انقلاب پیدا ہوا ہے"۔ (معارف اپریل ۱۹۲۴ء صفحہ ۳۱۴)

نگار لکھنؤ نے جنوری ۱۹۳۵ء میں "اردو شاعری" کے متعلق ایک خاص نمبر نکالا۔ جسمیں لکھنؤ اور بیرونِ لکھنؤ کے بیسیوں شاعروں کے نام گنوائے گئے۔ لیکن اگر کسی کو جگہ نہ ملی، تو وہ میرزا یاس یگانہ کو۔

لیکن کیا اس سے یگانہ کا نام مٹ جائے گا۔ بادشاہِ نحو مولانا محمد حسین آزاد مرحوم و مغفور [illegible]

کی پہلی اشاعت میں مومن کا ذکر تک نہیں کیا تھا اور غالب کا بھی کچھ یونہی سا ذکر کر کے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کیا مومن اور غالب جس تعریف کے مستحق تھے، اُس سے محروم رہ گئے؟ ذوق کا تو آج کوئی نام بھی نہیں لیتا ہے یگانہ میں لاکھ عیب ہوں گے اور ہم میں سے کون عیب سے پاک ہے۔ بے شک اُنھوں نے غالب کی نکتہ چینی میں ناروا سختی سے کام لیا ہے۔

عربی زبان کی مشہور مثل ہے۔ اُنظُر اِلیٰ مَا قَالَ وَ لا تَنظُر اِلیٰ مَن قَالَ۔ کہنے والے پر مت دیکھو۔ بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے اُس کے حسن و قبح پر غور کرو۔ ہم آج میر و درد۔ آتش و انیس۔ غالب و مومن کے سوا اور کسی کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم جہاں ان پچھلے اساتذہ کے کمال کے معترف ہیں، وہاں اپنے زمانہ کے باکمالوں کو بھی داد دیں۔ جس کے وہ جائز طور پر مستحق ہیں۔ غالب کو بھی یہی شکایت تھی میں نے اس مضمون کو غالب ہی کے ایک شعر سے شروع کیا تھا اور غالب کے ہی شعر پر اس کو ختم کرتا ہوں۔ جو اُنھوں نے اپنے معاصرین کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ اور جو آج یگانہ بھی اپنے معاصرین سے کہہ سکتے ہیں ؎

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

ہمارا وطن

ہر ذرہ ہے زمین وطن کا مہِ تمام
ہر ذرہ ہے زمین وطن کا فلک مقام
ہر ذرہ اس زمیں کا ہے جنت سے ہم کلام
اللہ رے وطن کی یہ صبح اور وطن کی شام

ہر سانس اس زمیں پہ بقائے دوام ہے
اس کے بہشت ہونے میں کس کو کلام ہے

کشمیر اس زمیں پہ ہے دُنیا میں انتخاب
پنجاب اور دکن کا نہیں دہر میں جواب
بنگال اور اودھ کا ہر اک ذرہ آفتاب
گنگ و جمن میں بہتا ہے شہد اور شیر ناب

اس کا ہمالہ میرے لئے رشک طور ہے
ہر سنگ اس کا غیرت صد کوہ نور ہے

محمد علی جوہر (ہمایوں)

دیکھ رہا ہوں

(از حضرت ظفر دہلوی بی اے)

گمراہ ہوں اور راہِ خضر دیکھ رہا ہوں — آغاز میں انجامِ سفر دیکھ رہا ہوں
ہیں آج ہوا میں تری آمد کے ترانے — گلشن کو بہ اندازِ دگر دیکھ رہا ہوں
پھر آج تقاضائے تسلی نہیں دل میں — ہر آہ کو میں زود اثر دیکھ رہا ہوں
منہ دھویا ہے پھر غنچۂ نورس نے دمِ صبح — پھر سلسلۂ سنبلِ تر دیکھ رہا ہوں
مشتاق چہکتی ہوئی شاخوں پہ ہیں طائر — پھر دیدۂ نرگس میں بصر دیکھ رہا ہوں
چکّر میں ہے پھر گردشِ گردوں زِ تحیّر — پھر سینۂ گیتی میں حذر دیکھ رہا ہوں
پھر جشن منایا تری آمد پہ گلوں نے — پھر سجدہ کناں شمس و قمر دیکھ رہا ہوں
پھر تیرا بیاں سنتا ہوں سوسن کی زباں سے — پھر وجد کے عالم میں شجر دیکھ رہا ہوں
پھر آ گئی روندے ہوئے گلزار میں رونق — پھر آج چمکتا ہوا گھر دیکھ رہا ہوں
پھر نقد زر و لعل بدامن ہے گلِ سرخ — پھر سبزہ کے ملتے ہوئے پر دیکھ رہا ہوں
پھر آج طرب خیز زمانہ ہے مرے ساتھ — تو مجھ سے ہے پھر شیر و شکر دیکھ رہا ہوں
پھر ساقیِ گلرنگ نے پیمانہ سنبھالا — پھر کالی گھٹاؤں کی نظر دیکھ رہا ہوں
پھر آج مغنّی نے اُسی ساز کو چھیڑا — دنیا ہے مری دست نگر دیکھ رہا ہوں
پھر کس نے کہا مجھ سے کہ وہ آئے وہ آئے — پھر آج میں کیوں جانبِ در دیکھ رہا ہوں
پھر بارگہِ حُسن سے دیکھا مجھے تو نے — پھر مبدلۂ عہدِ حجر دیکھ رہا ہوں
پھر دھوم مچی ہے کہ زمانے میں تو ہی ہے — پھر آج جہاں زیر و زبر دیکھ رہا ہوں
لا ہاتھ ذرا دیکھ دھڑکتے ہوئے دل کو — کب سے میں تری راہ گذر دیکھ رہا ہوں
آ میری طرف آ کہ کروں تجھ پہ نچھاور — دو حلقۂ دیدہ میں گہر دیکھ رہا ہوں
پھر کھیل رہا ہوں تری دزدیدہ نظر سے — پھر حوصلۂ قلب و جگر دیکھ رہا ہوں
کچھ کھو سا گیا ہوں کہ خبر تک نہیں مجھکو — میں دیکھ رہا ہوں تو کدھر دیکھ رہا ہوں

اللہ رے یہ بارشِ انوارِ تبسم
کچھ دیکھ نہیں سکتا مگر دیکھ رہا ہوں

ہاں ڈال دے پردے مری آنکھوں پہ مِرے اشک
انجام تمنائے نظر دیکھ رہا ہوں

اُکھڑی ہوئی سانسوں میں ہے ہستی کی کہانی
میں خوبیٔ اظہارِ بشر دیکھ رہا ہوں

دیکھے جو کوئی اور تو کیا جانیئے کیا ہو
جو کچھ کہ ظفر شام و سحر دیکھ رہا ہوں

شاعر اور خطیب

(از حضرت اسد ملتانی)

ذوق ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے

ڈھونڈتے رہتے ہیں لذت سخن آرائی میں
عملی کام کا چسکا نہ تجھے ہے نہ مجھے

ست رکھتا ہے ہمیں نشۂ صہبائے سخن
حاجتِ ساغر و مینا نہ تجھے ہے نہ مجھے

ہمہ تن قال ہی رہنا ہے کہاں کی دانش
مان لیتا ہوں کہ سودا نہ تجھے ہے نہ مجھے

نی اُن باتوں کو ہم چاہتے ہیں منوانا
جن پہ الہام کا دھوکا نہ تجھے ہے نہ مجھے

ہے وہ مسحور فقط سُن کے ہماری باتیں
قوم نے غور سے دیکھا نہ تجھے ہے نہ مجھے

یہ تو سوچیں کہ بھلا دین کی کیا خدمت کی
مَیں نے مانا غمِ دنیا نہ تجھے ہے نہ مجھے

فکر پر فخر مجھے، اور تجھے نطق پہ ناز
دست و بازو پہ بھروسا نہ تجھے ہے نہ مجھے

یرا چلتا ہے قلم، اور تری چلتی ہے زباں
حوصلہ جنبشِ پا کا نہ تجھے ہے نہ مجھے

جھکو تقریر سے مطلب، مجھے اشعار سے کام
حالتِ قوم کی پروا نہ تجھے ہے نہ مجھے

جاں نثاری کا سبق دیتے ہیں سب کو لیکن
اپنی تکلیف گوارا نہ تجھے ہے نہ مجھے

لاکھ اسد ہم کو دکھائے رہِ میدانِ عمل
اپنے کوچے سے نکلنا نہ تجھے ہے نہ مجھے

اُردو رسالوں کے سالانہ نمبر

رسالہ **دلگداز** لاہور کا سالنامہ بابت ۱۹۳۶ء بڑی تقطیع کے ۲۰۴ صفحات پر بہت آب و تاب کیساتھ شائع ہوا ہے۔ اسمیں ایکسو چھ مضامین نظم و نثر ہیں۔ جنمیں سے بعض مشہور شعراء و اہل قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ مضامین کی تقسیم (۱) اسلامیات (۲) ادبیات (۳) اقتصادیات اور (۴) نسائیات میں کی گئی ہے۔ جنمیں مولانا عبدالمجید صاحب سالک ایڈیٹر انقلاب کا "مسلمان عورت اور پردہ" پروفیسر علم الدین کا "شہباز خان کمبو" حاجی لق لق (رکن ادارۂ احسان لاہور) کا "میم کا کتا" وغیرہ نثر میں قابل مطالعہ مضامین ہیں۔ بعض بعض نظمیں اور غزلیں بھی قابلِ داد ہیں۔ بعض مضامین صرف چند سطری ہیں۔ رسالہ میں متعدد تصاویر اور کئی رنگین مناظر بھی شامل ہیں۔ ٹائیٹل پیج بہت خوبصورت اور سُنہرے رنگ کے دبیز دیدہ زیب کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ جس سے رسالہ کی رونق بہت بڑھ گئی ہے۔ قیمت ایکروپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر دلگداز کشمیری بازار لاہور۔

مولانا نیاز فتحپوری اپنے مشہور رسالہ **نگار** کا جنوری نمبر ہمیشہ خاص اہتمام سے شائع کیا کرتے ہیں۔ یہ نمبر عموماً ضخیم ہوتا ہے اور اسمیں کسی خاص اہم موضوع پر مضامین ہوتے ہیں۔ زیر نظر نمبر میں ۱۲۶ صفحات پر حملہ بابر سے قبل کی ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔ جسمیں قابل قدر تحقیق سے کام لیا گیا ہے اُس کے حواشی جو بڑی کثرت سے دئے گئے ہیں، خاص محنت سے لکھے گئے ہیں۔ دوسرا مضمون "مسئلہ خلافت و امامت" پر کسی "آزاد خیال شیعہ" صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ تیسرا مضمون "نغمۂ کارواں" کا ایک حصہ ہے۔ جس کا سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہے گا۔ شروع میں شاہزادہ والاشان معظم جاہ بہادر حیدر آباد کی ایک لپذیر نظم ہے جہاں تک تاریخی حصہ کا تعلق ہے، ہم مولانا نیاز کی کوششوں کو قابل قدر سمجھتے ہیں۔ رسالہ کا حجم ۱۰۸ صفحات ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ نگار لکھنؤ

سالنامہ "بیسویں صدی" لاہور

یہ سالنامہ اڑتالیس مضامین نظم و نثر اور چند طبی مقالات کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ جنمیں افسانوں کا حصہ زیادہ ہے۔ بعض بعض مضامین نثر اور بعض غزلیں اور نظمیں واقعی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ دو تین مقالات میں جو انگریزی مضامین کے ترجمے ہیں "حالات بعد المرگ" پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بعض افسانوں کی زبان میں اصلاح کی گنجائش ہے اور ہمیں یہ بھی تعجب ہے کہ بعض معمولی شاعروں کی پھسپھسی غزلوں پر اُن کے ناموں کے ساتھ ایسے ایسے خطابات دیدتے گئے ہیں، جن کے وہ ہرگز مستحق نہیں ہیں بہرحال سالنامہ کو دلچسپ بنانے کی خاص کوشش کی گئی ہے۔ غالباً عام طبقہ کے ناظرین کے تفنن طبع کے لئے ہندوستان کی مشہور ایکٹریسوں کی ایک درجن تصویرین دی گئی ہین۔ اور بعض نظمیں بھی اسی طبقہ کے متعلق درج رسالہ کی گئی ہیں۔ شاید انھیں تصاویر و مضامین کی بدولت پونے دو سو صفحات کا رسالہ صرف آٹھ آنے میں ملسکتا ہے۔ شایقین دفتر "بیسوین صدیٔ" پرانی میوہ منڈی لاہور سے طلب فرمائیں۔

سالنامہ "پیام تعلیم" دہلی

جامعہ ملیہ دہلی اردو ادب کی قابل قدر خدمت انجام دے رہاہے۔ اور کچھ عرصہ سے اُس نے بچّوں کے پڑھنے کا سامان بھی فراہم کرنے کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ چنانچہ کئی سال سے پیام تعلیم کے نام سے نوعمر بچّوں کیلئے ایک مفید و دلچسپ رسالہ بھی شائع ہو رہاہے۔ اس کے ہر نمبر میں سادہ و سلیس زبان میں دلچسپ و سبق آموز مضامین ہوتے ہیں۔ سال میں ایک خاص نمبر "سالگرہ نمبر" کے نام سے بھی شائع کیا جاتاہے۔ اِس دفعہ اس تقریب کے سلسلے میں جو پرچہ شائع ہواہے وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہماری تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ بچوں کی تدریجی تعلیم کا جو پیرایہ اِسمیں رکھاگیاہے وہ انتہادرجہ دلچسپ اور موثرہے۔ اس کے تمام مضامین سبق آموز اور سب نظمیں مصلح اخلاق اور دلچسپ ہیں۔ سب مضامیں ایسی سلیس اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں۔ کہ بچے استاد کی مدد کے بغیر انھیں سمجھ سکیں۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے جگہ جگہ معمے اور چیستانیں بھی درج کردی گئی ہیں اور ہر مضمون کے ساتھ مناسب موقعہ پر تصویریں دیدی گئی ہیں۔ جس سے بچوں کو مضمون سمجھنے میں بہت آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم جامعہ ملیہ کو اِس نمبر کی ترتیب اور اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں اُردو داں بچّوں کو اِس رسالہ کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ اسکی لکھائی، چھپائی، کاغذ وغیرہ سب نفیس ہیں۔ اِس نمبر کا حجم تقریباً سوا سو صفحات ہے۔ قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

"نیساں" الہ آباد (جوبلی نمبر)

الہ آباد یونیورسٹی اُردو ایسوسی ایشن کی طرف سے "نیساں" نامی ایک ادبی رسالہ ہر تیسرے یا چوتھے ماہ پروفیسر محمد ضامن علی صاحب ایم۔ اے، صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کے زیرادارت شائع ہوتاہے۔ جسمیں اکثر طلباء اور اساتذہ کے قابل قدر مضامین نظم و نثر شائع ہوا کرتے ہیں۔ زیر نظر پرچہ اسی رسالہ کا "جوبلی نمبر" ہے جو الہ آباد یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ "گولڈن جوبلی" کی تقریب پر خاص اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیاہے۔ اِس نمبر میں سینتالیس مضامین نظم و نثر شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں پروفیسر سیّد ضامن علی ایم۔ اے، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم اے

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی، سید وقار عظیم ایم۔اے جیسے مشہور شعراء داخل ہیں۔ اس کے بعض مضامین واقعی قابل قدر ہیں۔ اس نمبر میں الہ آباد یونیورسٹی کے اُردو ڈیپارٹمنٹ کے اساتذہ اور خاص خاص طلباء کی جنھیں اُردو سے خاص ذوق ہے۔ بہت سی مختلف تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں جن سے یونیورسٹی طلباء کیلئے یہ رسالہ خاص طور پر دلچسپ ہوگیا ہے۔ لکھائی، چھپائی نہایت روشن، کاغذ عمدہ، ضخامت ۲۷۸ صفحات، قیمت دو روپیہ۔ شایقین سید اعجاز حسین صاحب ایم۔اے لکچرار اُردو الہ آباد یونیورسٹی و جنرل سکریٹری اُردو ایسوسی ایشن سے طلب فرمائیں۔

ہمایوں لاہور (مشاعرہ نمبر)

گذشتہ نمائش لاہور کے موقعہ پر انجمن اُردو پنجاب کے زیر اہتمام ۱۹۳۷ء کی آخری تاریخوں میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا، جس کی پہلی نشست کی صدارت دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ نے، دوسری اور تیسری نشستوں کی آنریبل سر عبد القادر ممبر انڈیا کونسل نے فرمائی جس میں ہندوستان کے مشہور اور نامی گرامی شعرائنے شرکت فرمائی تھی جس مشاعرہ کا انتظام مسٹر بشیر احمد ایڈیٹر "ہمایوں" جیسے سرگرم پُرجوش خادم ادب کے سپرد ہوا اور جس میں حضرت جوش ملیح آبادی۔ روش صدیقی۔ احسان بن دانش۔ کیفی دہلوی اور تاجور نجیب آبادی جیسے نامور شعراء شریک ہوں اُسکی کامیابی میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ معزز معصر ہمایوں نے اپنا ایک پورا نمبر اِس یادگار مشاعرہ کے لیے وقف کر دیا ہے جس سے وہ لوگ بھی جنھیں شریک مشاعرہ ہونے کا موقعہ نہیں ملا لُطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ اِس مشاعرہ میں غزلوں کے علاوہ دلچسپ موضوعات پر نظمیں بھی پڑھی گیئں۔ چنانچہ ہمایوں میں منتخب غزلیات کے علاوہ بہت سی خاص خاص نظموں کو بھی شائع کر دیا ہے۔ اُنمیں سے تین نظمیں انعامی ہیں۔ مشاعرہ کی تاریخ جناب راحل ہوشیارپوری نے نہایت برجستہ لکھی ہے یعنی "مشاعرہ آل انڈیا نمائش لاہور" ۱۳۵۶ھ اور شعرائے مشاعرہ کا ایک گروپ فوٹو بھی اِس مجموعہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے جو اُردو شاعری کے قدر دانوں کے لئے خود ایک قابل قدر چیز ہے۔ بہرحال معزز ہمایوں نے اِس مجموعہ کو شائع کرکے جو ادبی خدمت انجام دی ہے اُس کے لئے ہم اپنے مکرم ایڈیٹر صاحب ہمایوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ نمبر آٹھ آنہ قیمت پر منیجر صاحب ہمایوں لاہور سے مل سکتا ہے۔

نیرنگ خیال (افغانستان نمبر)

حکیم محمد یوسف حسن صاحب ایڈیٹر "نیرنگ خیال" لاہور رسالہ زمانہ کے پُرانے مضمون نگاروں میں ہیں۔ چنانچہ آپکے کئی قابل قدر افسانے اِس رسالہ کی پُرانی جلدوں میں ہدیۂ ناظرین ہوچکے ہیں۔ اب آپ کے ذوق ادب، حُسن انتظام اور اولوالعزمی کی بدولت رسالہ نیرنگ خیال کو پنجاب کے اُردو رسائل میں ایک خاص ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی ہے آپکو رسالہ کے خاص نمبر نکالنے کا بے پناہ شوق عشق کے درجہ کو پہونچ گیا ہے چنانچہ اسی عشق کا ایک تازہ نمونہ یہ "افغانستان نمبر" ہے۔

جو کچھ ایسا لمبا چوڑا تو نہیں ہے، مگر جس موضوع پر یہ نمبر مرتب کیا گیا ہے، وہ بہت دلچسپ ہے۔ افغانستان ہمارے وطن عزیز کا قریبی ہمسایہ ہے۔ اس لئے اس کے حالات و واقعات ہمارے لئے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس تقریباً دو درجن مضامین ہیں جن سے افغانستان کے جغرافیائی حالات کے علاوہ اسکی زمانۂ حال کی تاریخ اور موجودہ ارباب حکومت کے حالات زندگی پر بخوبی روشنی ڈالی گئی ہے۔ موجودہ بادشاہ اور اُن کے امراء وسرداروں کے فو اور افغانستان کے پُرانے بادشاہوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ غرض اس نمبر کی کامیابی پر ہم ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیا کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ اسکی لکھائی، چھپائی اور کاغذ معمولی ہے۔ ٹائیٹل پر ہز مجسٹی ظاہر شاہ کی تصویر او طغرا درج ہے۔ قیمت چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر نیرنگ خیال لاہور۔

سب رس

یہ ماہوار رسالہ جو ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد دکن کا آرگن ہے۔ صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش کی ایڈیٹری میں جنوری ۱۹۳۸ء سے جاری ہوا ہے۔ اسکے نگراں سید محی الدین قادری زور ہیں جو زبان اُردو میں بہت قابل قدر کتابوں کے مُصنف ہیں۔ "سب رس" کا یہ پہلا نمبر تینتالیس دلچسپ اور قابل قدر مضامین نظم ونثر کا مجموعہ ہے۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کے مضمون نگاروں میں خواتین کی تعداد بھی کافی ہے۔ مضامین میں ہر مذا کی دلچسپی کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ جس کی بدولت یہ رسالہ ہر قابلیت کے مردوں، عورتوں اور بچّوں کے لئے مُفید ثابت ہوگا۔ جو کچھ کمی کہیں کہیں رہ گئی ہے، وہ اُمید ہے کہ ڈاکٹر زور کی آیندہ ہدایتوں سے بہت جلد پوری ہوجا ہم اپنے اس جدید ہمعصر کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس کی لکھائی، چھپائی بھی عمدہ ہے۔ ضخامت تقریباً سو صفحات۔ سالانہ چندہ ساڑھے چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ادارۂ ادبیات اُردو، رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن

سالنامۂ ساقی دہلی

رسالہ "ساقی" جو مسٹر شاہد احمد بی۔ اے دہلوی کی ایڈیٹری میں کئی سال سے شائع ہو رہا ہے۔ دہلی کا سب کامیاب اور قابل قدر رسالہ ہے۔ شاہد صاحب کو پرچہ مرتب کرنے کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساقی سالنامہ یا کوئی خاص نمبر درکنار اس کا معمولی پرچہ بھی اُترا ہوا نہیں ہوتا۔ آجکل خاص نمبر یا کم از کم سالنامہ نکالنے کی کچھ ایسی ہوا چل گئی ہے کہ اس سے بہت ہی کم پرچے بچے ہیں۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ ساقی کا سالنامہ صحیح معنی میں "سالنامہ" ہوتا ہے۔ جس کے لئے شاہد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ساقی کا زیر نظر نمبر جو ۱۹۳۸ء کا سالنامہ ہر مذاق کی دلچسپی کا سامان لئے ہوئے تریپن دلچسپ اور قابل قدر مضامین نظم ونثر کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے جسم سنجیدہ علمی وادبی مضامین، دلچسپ فسانوں، شگفتہ نظموں اور مزاحیہ مضامین کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ مضمون نگارو میں شمس العلماء، مولانا عبد الرحمن، مولانا عنایت اللہ دہلوی بی۔ اے سابق ناظم دار الترجمہ حیدرآباد دکن، مولانا صادق

ایم۔اے، مولانا لطیف الدین احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی، مرزا عظیم بیگ چغتائی وغیرہ جیسے مسلّمہ ادیب اور اہل قلم ہیں۔ مضامین نثر میں "اُردو کی کہاوتیں اور ان کی کہانیاں"، "میکبتھ"، "فن فسانہ"، "دورِ حاضرہ اور اُردو غزل گوئی" پڑھنے کے قابل ہیں۔ نظموں میں "اسرار و معارف"، "تجلیات"، "ساقی گلفام" وغیرہ بہت پیاری نظمیں ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ صفحہ ۲۳۴ سے شروع ہو کر خفی قلم سے لکھی ہوئی جس نظم نے "ہم اور سینما" کے نام سے تین صفحے سیاہ کئے ہیں، وہ کون سی زبان میں ہے۔ بایں ہمہ یہ سالنامہ اپنے طور پر بہت اچھا ہے۔ خصوصاً "میکبتھ" میں تو مولوی عنایت اللہ صاحب نے ترجمہ نگاری کا خوب کمال دکھایا ہے۔ شائقین ادب کو اس سالنامہ کی قدر کرنا چاہئیے۔ ضخامت تقریباً دو سو صفحات۔ قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "ساقی" دہلی۔

سالنامہ شاہکار گورکھپور

اس نام سے ایک اور رسالہ پروفیسر تاجور صاحب کی ایڈیٹری میں لاہور سے بھی بڑی تقطیع پر شائع ہوتا ہے لیکن اِسوقت جس "شاہکار" کا سالنامہ ہمارے سامنے ہے، وہ ۱۹۳۴ء سے حکیم عارف بلگرامی صاحب کے زیر اہتمام گورکھپور سے شائع ہوتا ہے۔ یہ سالنامہ ۴۳ مختلف مضامین نظم و نثر کا ایک دلچسپ گلدستہ ہے جس کا ہر غنچہ متبسم اور ہر پھول شگفتہ ہے۔ ان ۴۳ مضامین میں تقریباً بیس نظمیں یا غزلیں ہیں۔ مضامین نثر میں "جدید اُردو نثر کے رجحانات"۔ "ایک علمی حقیقت کا انکشاف"۔ "بغداد خاتون"۔ "ضمیات ہند" اور "فلسفۂ سیاسیات کا ایک رخ" قابل قدر مضامین ہیں۔ متعدد فوٹو بھی رسالہ کی شان میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ مگر سب سے اہم چیز اِس سالنامہ کا سرورق ہے۔ جس پر تقریباً چالیس مشہور ادیبوں اور نامی شاعروں کے انگشتی فوٹو دیدئے گئے ہیں۔ شاہکار کی یہ دلپذیر جدت قابل ستائش ہے کہ اُس نے ایک ہی ورق میں اتنے اہل قلم کے علیحدہ علیحدہ فوٹو قرینے سے جمع کر دئے ہیں۔ اسکا حجم ۱۶۰ صفحات۔ قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ شاہکار گورکھپور

"ایشیا" میرٹھ

ہمارے کرمفرما حضرت ساغر نظامی تقریباً تین سال سے "ایشیا" نام کا ایک ادبی رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ اب یہ رسالہ سہ ماہی کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جو نمبر اس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ اکتوبر۔نومبر و دسمبر ۱۹۳۷ء کا مجموعہ ہے۔ ہمیں کیا ہر صاحب ذوق اور قدر دان ادب کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ساغر صاحب کی نگرانی میں جو کتاب یا رسالہ شائع ہوتا ہے۔ وہ ادبی خوبیوں کے علاوہ محاسن ظاہری سے بھی ہر طرح آراستہ ہوتا ہے۔ یہی حال اِس نمبر کا بھی ہے جو متعدد علمی مضامین نثر اور گرانبایہ غزلوں اور نظموں کا دلپذیر مجموعہ ہے۔ مضامین نثر میں پروفیسر فاروقی ایم۔اے کا "کمال انگورہ"۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا دکیل کا "اُردو زبان کی تاریخ"۔ سید عسکری طباطبائی لکھنوی کا "اُردو شاعری میں فقدان جدت اور فارسی کے تتبع کا الزام"۔ اور سید محمد یحییٰ میرٹھی کا "لارڈ کلائیو کے سیاہ کارنامے" گرانقدر تحقیقی مضامین ہیں۔ اُس کی نظمیں ایک سے ایک بڑھکر ہیں۔ آخری حصہ میں مسائل حاضرہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت سوا روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ:۔ ادبی مرکز مکتبۂ ساغر میرٹھ

جذباتِ فراق

(حضرت فراق گورکھپوری، ایم اے)

حریفِ عشق اثرِ دورِ کائنات نہیں — غمِ حیات نہیں کاوشِ ممات نہیں
حیاتِ عشق کے ہاتھوں ابھی حیات نہیں — غم و خوشی کے لئے آدمی کی ذات نہیں
خطا کے بعد ندامت بھی عشق کو نہ ملی — نگاہِ ناز یہ کہتی ہے "کوئی بات نہیں"
بلائے قربتِ لیلےٰ و فرقتِ لیلےٰ — جو اپنی ضد نہ ہو وہ نظمِ کائنات نہیں
کسی کی شوخیٔ پنہاں ہے کارگر ناداں — مٹانے والے دلوں کے مقدرات نہیں
پیامِ عشق ہے اس زلفِ خم بہ خم سے یہی — ترے اسیر نہ کاٹیں جسے وہ رات نہیں
بچا بچا کے ہوئی کاوشِ نگاہ اس کی — مٹانے مٹنے کے اے دل یہ سانحات نہیں
ملے جُلے ہیں عذاب و ثواب کے مفہوم — رموزِ عشق ہیں اے شیخ دینیات نہیں
بہت بڑھا کے نہ کر شکوۂ تلوّنِ حسن — سنا ہے عمرِ محبّت کو بھی ثبات نہیں
نہ پوچھ، سوچ کے میں کیا اداس رہتا ہوں — جو غم نصیبِ محبّت تھے انکی بات نہیں
جہاں میں کوئی بھی تیرے سوا نہیں۔ لیکن — یہ تیری ذات نہیں یہ ترے صفات نہیں
ہزار رخ سے ملی ہے کسی کے حسن کو شہ — کہ مات گنجفۂ عاشقی میں مات نہیں
ہر ایک گردشِ جام و سبو ہے کیفِ دوام — رہینِ دورِ فلک میکدے کی رات نہیں
یہی ہوا کہ ترے بیکسوں پہ کچھ نہ ہوا — جو آئے لفظ و بیاں میں وہ واردات نہیں
میں یہ بھی کہہ نہیں سکتا بدل گئی وہ نگاہ — وہی ہیں لطف و کرم اب مگر وہ بات نہیں
یہ کیا مجاز و حقیقت کی بحث چھیڑی ہے — صفات کون ہیں تیرے جو عینِ ذات نہیں
نشاطِ حسنِ ازل کو بھی وجد آ جاتا — دکھی ہوئی مگر اتنی رگِ حیات نہیں
رموزِ عذرِ جفا تک خیال جا نہ سکا — میں چپ رہا تو برا ماننے کی بات نہیں

فراق عہدِ وفا برطرف۔ یہ کیا کم ہے
کہ وہ نظر، وہ عنایت، وہ التفات نہیں

رفتارِ زمانہ

یورپ کی سیاسی حالت

جو لوگ یورپین واقعات کی رفتار پر نظر رکھتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ جب سے اٹلی نے ملک حبش پر حملہ کیا ہے یورپ کے بین الاقوامی تعلقات میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اسوقت دُنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے دو جتھے ہیں۔ ایک جہاں ڈکٹیٹری یا مطلق العنان حکمرانی کا دور دورہ ہے۔ جیسے اٹلی، جرمنی اور جاپان۔ دوسرے جمہوریت پسند، جیسے برطانیہ، فرانس اور امریکہ۔ دونوں گروہ امپیریلیسٹ ہیں۔ لیکن دونوں کے طرزِ عمل میں نمایاں فرق ہے۔ جمہوری سلطنتیں بین الاقوامی تنازعات کو باہمی سمجھوتہ سے طے کرنا چاہتی ہیں، لیکن اپنے پلّہ سے کچھ کھونا نہیں چاہتیں۔ دوسری طرف فسطائی سلطنتیں یعنی اٹلی، جرمنی اور جاپان اپنے اغراض و مقاصد کو لڑ بھڑ کر اور جبر و اکراہ سے کام لے کر حاصل کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ یہ سلطنتیں دوسری ہمسایہ سلطنتوں پر اپنا قبضہ و تسلط جمانا چاہتی ہیں۔ مثلاً جاپان چین پر، اٹلی اسپین اور البانیہ پر اور جرمنی زیکوسلاویکیہ و روس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اِس لئے ان تینوں سلطنتوں نے کمیونزم کے خلاف جہاد کرنے کا بہانہ تراش رکھا ہے۔

ابھی تک یورپ کی اندرونی سیاسیات کی صورت مبہم سی تھی، لیکن جب سے آسٹریا کے چانسلر اور ہر ہٹلر کی ملاقات ہوئی ہے اور ہٹلر نے جرمن پارلیمنٹ میں اپنے ملک کی خارجی سیاسیات کی وضاحت کی اور اٹلی و برطانیہ کے معاملہ پر برطانوی وزیر خارجہ مسٹر ایڈن اور اُن کے نائب لارڈ برانبورن مستعفی ہوگئے ہیں۔ یورپ کی حالت کافی روشنی میں آگئی ہے۔ چنانچہ آج ہم یورپین قوموں کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔

اٹلی و برطانیہ اٹلی و برطانیہ کے تعلقات میں اُسوقت سے کشیدگی شروع ہوئی ہے جب اٹلی نے لیگ اقوام اور خصوصاً دولت برطانیہ کی مخالفت کے باوجود لیگ کے ایک ممبر ملک حبش پر حملہ کر کے اُسے فتح کرلیا۔ ان دنوں برطانیہ میں مسٹر (اب لارڈ) بالڈون وزیر اعظم تھے۔ جنکی رہنمائی میں حکومت برطانیہ نے اٹلی کے خلاف شور و شر تو بہت کیا لیکن واقعی طاقت کا کوئی زور نہیں ڈال سکی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جن لوگوں کے سر پر فتوحات اور جہانگیری کا جنون سوار ہوتا ہے۔ وہ باتوں سے نہیں مانتے، اور جبتک اُنکے خلاف طاقت سے کام نہ لیا جائے، کسی کی بات سُننے کو تیار نہیں ہوتے ہیں۔ برطانیہ نے زبانی جمع خرچ تو بہت کیا لیکن قرار واقعی طاقت کا کوئی دباؤ نہ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی حبش پر قابض ہوگیا۔ اور اُس نے اُلٹے برطانیہ کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کردیں۔ بدقسمتی سے پارسال اسپین میں بھی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ایسا عمدہ موقعہ اٹلی کب ہاتھ سے جانے دیسکتا تھا۔ اُس نے فوراً باغیوں سے خفیہ معاہدہ

کرکے اُن کو فوج، اسلحہ، سامان جنگ اور رسد سے مدد دینا شروع کر دیا۔ اُدھر برطانیہ اور فرانس کو اسپین کی جمہوری سلطنت سے ہمدردی تھی۔ چنانچہ اس سے بھی اٹلی، فرانس اور برطانیہ میں مزید کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اسی اثنا میں اٹلی نے شمالی افریقہ کی بندرگاہ سیوط پر جو جبرالٹر کے عین مقابل ہے۔ اژدر دم قوہیں چڑھا دیں جس سے بحیرۂ روم میں برطانوی راستہ کو خطرہ پیدا ہوگیا۔ غرض برطانوی و فرانسیسی اور روسی جہازوں پر حملے ہونے لگے، برطانوی جہازوں کو خاص نقصان پہونچایا گیا۔ اور اسطرح رفتہ رفتہ اٹلی نے بحیرۂ روم میں برطانوی اقتدار کو زک پہونچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے۔ چونکہ بحیرۂ روم ہی میں ہوکر برطانیہ کے مشرقی مقبوضات خصوصاً ہندوستان کا قریب ترین راستہ ہے اور تقریباً دو تہائی برطانوی تجارت بھی اسی سمندر سے گذرتی ہے، اس لئے برطانوی مفاد کو اٹلی سے سخت اندیشہ پیدا ہوگیا۔ اٹلی نے افریقہ اور عربی ممالک میں بھی ریڈیو سے برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کردیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو برطانیہ کی طرف سے بدظن کر دیا جائے۔ ان سب باتوں پر بھی بالڈون گورنمنٹ کو ہوش نہ آیا۔ اور وزراء برطانیہ زبانی پروٹسٹ کرنیکے سوائے کچھ نہ کرسکے جس سے برطانوی اقتدار کی ہوا خیزی ہوگئی اور جاپان بھی برطانیہ کا موجودہ رُخ دیکھکر بیخوف ہوگیا۔ اور چین پر اعلانِ جنگ کے بغیر حملہ کر دیا۔ بالڈون صاحب کی کنارہ کشی پر مسٹر چیمبرلین وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے بھی اُسی بزدلی کی پالیسی پر عمل کیا اور زبانی احتجاج کے سوائے اٹلی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی بلکہ اُلٹے اٹلی کی تالیف قلب کے موقعہ کی تلاش میں رہے۔

مسٹر ایڈن وزیر خارجہ اس پالیسی کے خلاف تھے، اُن کی رائے تھی کہ جب تک اسپین کا معاملہ سیدھا نہ ہوجائے اٹلی سے کسی قسم کی گفتگو شروع نہ کی جائے مگر مسٹر چیمبرلین اٹلی سے ڈرے ہوئے ہیں اور اٹلی کیساتھ جلد سے جلد مصالحت کرنے کی طرف ہیں۔ اسوقت واقعہ یہ ہے کہ اٹلی کی اندرونی حالت کچھ قابل اطمینان نہیں ہے اور اُسے مالی امداد کی سخت ضرورت ہے لیکن بقول مسٹر لائیڈ جارج مسولینی کو دھمکیاں دینا خوب آتا ہے۔ وہ دھمکیوں ہی میں برطانیہ سے کام نکالنا چاہتا ہے۔ انگلستان کا متمول طبقہ اور لندن کے مالدار تجار کسی حالت میں انگلستان کو کسی لڑائی میں پھنسانا نہیں چاہتے ہیں اور اُن کو خوف ہے کہ لڑائی سے ذاتی طور پر وہ بالکل تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ چنانچہ چاہے انگلستان کے سیاسی وقار کو کچھ دھکا لگ جائے لیکن وہ اپنے طبقے کی خوشحالی برقرار رکھنا چاہتے ہیں بہرحال اس طبقہ کا موجودہ وزراء برطانیہ پر اسقدر اثر ہے کہ مسٹر ایڈن وزیر خارجہ کو مستعفی ہونا پڑا۔ پارلیمنٹ میں اس استعفاء پر خوب لے دے ہوئی۔ موجودہ گورنمنٹ کے خلاف ملامتی ووٹ کی تحریک تو کامیاب نہیں ہوسکی اور جہاں ۱۶۸ ممبروں نے مسٹر ایڈن کی پالیسی کی تائید کی، اس کے برعکس ۳۳۰ ممبران نے وزیر اعظم کا ساتھ دیا موجودہ پارلیمنٹ میں منجملہ ۶۱۵ ممبران کے ۴۲۵ ممبران گورنمنٹ کے طرفدار ہیں۔ اسمیں سے کم سے کم پچاس ممبران نے اٹلی سے فوری معاملہ کرنے کی پالیسی کی مخالفت کی۔ سلطنت، دوسرے ملکوں اور ہندوستان میں

عام رائے موجودہ وزارت کے خلاف ہے۔ انگلستان میں بھی اتنا اثر توضرور محسوس ہو رہا ہے کہ شاید بحالت موجودہ اٹلی کو برطانیہ سے کوئی بھاری قرضہ نہ مل سکے خیر کچھ ہو اس وقت تو اٹلی و جرمنی کے گھر گھی کے چراغ جل گئے کیونکہ دونوں مسٹر ایڈن کو اپنے پہلو میں خار سمجھتے تھے۔ لیکن تمام دُنیا کی نگاہ میں مسٹر ایڈن کا استعفار جمہوریت کے سر پر مطلق انسانی کی ایک ضرب کاری ہے۔

ہم تو یہی اُمید کرتے ہیں کہ عنقریب ہی برطانیہ عظمیٰ کی وزارت میں کوئی سیاسی انقلاب آنے والا ہے، اور جلد یا دیر میں رائے عامہ کو متمول تاجروں کی خود غرضانہ اور کوتاہ اندیشانہ پالیسی پر فتح حاصل ہوگی۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ مسٹر چیمبرلین کی کمزور پالیسی کا خود اٹلی میں مضحکہ اڑایا جارہا ہے۔ چنانچہ مسولینی کے معتمد علیہ فارینا سیاٹی نے اطالوی اخبار "ریجیمہ فاشسٹا" (Regime Fascista) میں ایک مضمون میں اٹلی کے ساتھ برطانیہ کے موجودہ میلان کو ایک شاطرانہ چال قرار دیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:۔

"پہلے تو برطانوی دفتر خارجہ برلن سے اظہار ناز و نیاز کر رہا تھا، لیکن جیسے ہی جرمنی کی خارجی پالیسی کی باگ ڈور ہر فان ربن ٹراپ کے ہاتھ میں آئی، جو اٹلی اور جرمنی کے دوستانہ تعلقات کا زبردست حامی ہے، ویسے ہی گورنمنٹ برطانیہ نے سمجھ لیا کہ اب جرمنی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے وہ روم کی طرف مائل ہوئی ہے۔ لیکن برطانیہ کو اپنی غلط فہمی جلد معلوم ہو جائے گی۔ کیونکہ اٹلی اور برطانیہ کے درمیان سب سے بڑا مسئلہ اسپین کا حائل ہے۔ جہاں روس، فرانس اور برطانیہ کے بہم پہونچائے ہوئے سامان جنگ سے ہزاروں اطالوی سپاہی کھیت رہے ہیں۔ چنانچہ محض زبانی نیازمندی سے اس نقصان عظیم کی تلافی نہیں ہوسکتی ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اٹلی اپنی دوستی کا زبردست معاوضہ مانگتا ہے اور وہ بقول ایک فرانسیسی اخبار یہ ہے کہ:۔

(۱) بحیرۂ روم میں اٹلی و برطانیہ کے جنگی بیڑوں کی مساوات کا اصول تسلیم کیا جائے۔
(۲) اٹلی کو نہر سویز کی نگرانی کا حق دیا جائے۔
(۳) اٹلی کو جزائر بلیا آرِیق میں بھی قدم رکھنے کی جگہ دیجائے اور اس کے ساتھ ہی دوسری سلطنتوں کیساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔
اٹلی کو تین کروڑ پاونڈ کا قرضہ دیا جائے۔
حبش کی فتح اور اٹلی سے اس کا الحاق تسلیم کر لیا جائے۔

ظاہر ہے کہ انہیں سے پہلی چار شرطوں کا پورا کرنا برطانیہ کے لئے محال ہے۔ البتہ آخر مطالبہ ضرور ایسا ہے، جسکو

برطانیہ اپنی سیاسی رسوائی سے قطع نظر آسانی سے تسلیم کر سکتا ہے مگر پچھلے چار مطالبات کا پورا کرنا موجودہ وزراء برطانیہ کے اختیار سے باہر معلوم ہوتا ہے، اور اگر چیمبرلین گورنمنٹ نے انھیں تسلیم کر لیا تو سمجھ لینا چاہئے کہ سلطنت برطانیہ کا زوال شروع ہو گیا۔ کیونکہ جس روز نہر سویز پر کسی غیر ملک کا دخل ہو گیا تو وہ جب چاہے انگریزی جہازوں کو روک سکیگا۔ جزائر بلیارک میں بھی اطالوی مستقر قائم ہونیسے جبرالٹر کی اہمیت جاتی رہیگی اور آبنائے جبرالٹر کا راستہ مخدوش ہو جائیگا۔ رہا قرضہ کا معاملہ تو وہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر دیا نہیں جا سکتا۔ اور ہمارا خیال ہے کہ پارلیمنٹ اِس کو منظور نہ کرے گی۔ اسکا کیا اطمینان ہے کہ اِس رقم سے جو سامانِ جنگ تیار ہوگا وہ کسی وقت خود برطانیہ کے خلاف استعمال نہ کیا جائے گا۔ غرض اِسوقت معاملہ اُلجھن میں پڑا ہوا ہے۔ آگے دیکھئے برطانیہ کا سیاسی اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے

جرمنی و برطانیہ | جب سے جرمنی کی عنانِ حکومت ہرہٹلر کے ہاتھ میں آئی ہے، اُس نے رفتہ رفتہ اپنی طاقت اِسقدر بڑھالی ہے کہ ہمسایہ قوموں کو اس سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگرچہ برطانیہ کی جغرافیائی حالت اور اُسکا محلِ وقوع ایسا ہے، جس کی وجہ سے یورپ کی دیگر قومیں آسانی سے اُس پر حملہ آور نہیں ہو سکتیں، مگر ہوائی جہاز ایک بے پناہ چیز ہے۔ جس کے حملوں سے بچنا دشوار ہے اور جرمنی کے پاس اب فوجی طیاروں کی اِسقدر کثرت ہو گئی ہے۔ کہ وہ اسپین میں جنرل فرانکو کو بھی طیارے بہم پہونچا رہا ہے غرض برطانیہ پر ہوائی تاخت کے سوا حملہ کا خطرہ نہیں ہے۔ اِس لئے جرمنی کی مخالفت یورپ اور دیگر ممالک میں برطانیہ کے لئے تشویش انگیز ثابت ہو سکتی ہے۔

جرمنی کو فرانس و برطانیہ سے اس کے سوا اور کوئی شکایت نہیں ہے کہ جنگ عظیم کے بعد اس کی تمام افریقی نوآبادیاں فرانس و برطانیہ ہی کے قبضہ میں آ گئی ہیں، جنھیں اب وہ واپس لینا چاہتا ہے۔ فرانس اور جرمنی کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ اس لئے فرانس کو وہ ہر وقت پریشان کر سکتا ہے اور اگر جرمنی فرانس پر حملہ کر بیٹھے تو برطانیہ کو مجبوراً فرانس کا ساتھ دینا پڑے گا۔ کیونکہ دونوں ملک ایک دوسرے سے اِسقدر قریب ہیں کہ ایک پر حملہ دوسرے کیلئے خطرۂ عظیم کے مرادف ہے۔ بہرحال جرمنی نے برطانیہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ شاطرانہ چال کھیلی ہے کہ اُس نے اٹلی اور جاپان سے اتحاد کر لیا ہے تاکہ اگر اٹلی برطانیہ کو یورپ خصوصاً بحیرۂ روم میں پریشان کرے تو جاپان برطانیہ کے مفاد کو چین میں نقصان پہونچائے۔ جرمنی کا یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو رہا ہے۔ اب اگر فرانس و برطانیہ چاہتے ہیں کہ جرمنی سے صلح رہے تو اس کی صورت افریقہ کی جرمن نوآبادیوں کی واپسی ہے۔ لیکن باوجود بار بار کے تقاضہ کے فرانس و برطانیہ جرمن نوآبادیاں واپس کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

جاپان کی طرح جرمنی کی آبادی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اِس لئے اُسے نوآبادکاری اور اپنی صنعت و حرفت کیلئے خام اجناس حاصل کرنے کے لئے مزید علاقہ کی ضرورت ہے اور جرمنی کی یہ ضرورت دو صورتوں سے پوری ہو سکتی ہے

یعنی یا تو اُس کی سابق نو آبادیاں واپس کردی جائیں یا اُسے یورپ کے مشرق میں پھیلنے دیا جائے۔ پہلی صورت میں تو فرانس و برطانیہ ابھی تک رضامند نہیں ہوئے، اور نہ غالباً ہوں گے۔ لیکن دوسری صورت میں اُن کے ہاتھ سے کوئی علاقہ نہیں جاتا۔ مگر اس صورت میں سب سے اہم اور زیادہ خطرناک بات یہ ہوگی کہ تمام وسطی اور مشرقی یورپ پر جرمنی کا فوجی اقتدار قائم ہوجائے گا۔ جس سے نہ صرف یورپ کا توازنِ قوت درہم برہم ہوجائیگا، بلکہ فرانس اور بلجیم کو اپنی جان کے لالے پڑجائینگے۔ لیکن جرمنی کے دِل میں ابھی تک اپنی جرمن نوآبادیوں کا ارمان باقی ہے۔ چنانچہ ۲۰ر فروری کو ریشٹاغ میں تقریر کرتے ہوئے ہرہٹلر نے جرمنی کی سیاست خارجیہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"جرمنی بالشویزم کی توسیع و ترقی کا سخت مخالف ہے اِس لئے وہ جاپان کا ساتھ دے رہا ہے کیونکہ چین وجاپان کی موجودہ جنگ میں اگر جاپان کو شکست ہوگئی تو اس سے یورپ وامریکہ کو کوئی فائدہ نہ پہنچیگا بلکہ جو کچھ نفع ہوگا وہ بالشویزم کو ہوگا۔ مگر چین میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ عرصہ تک جاپان کی مزاحمت کرسکے جرمنی مشرق اقصیٰ کی طرف غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے خیال میں جاپان کی فتح بالشویکوں سے کم خطرناک ہوگی۔ اسواسطے اٹلی اور جاپان سے جرمنی اپنے تعلقات زیادہ مستحکم کرے گا۔ اور ریاست مانچوکؤ کو تسلیم کرے گا۔ جرمنی کو اسپین میں کسی علاقہ کی تمنا نہیں ہے، لیکن اگر وہاں بالشویک پارٹی کی فتح ہوئی تو جرمنی کے نزدیک یورپ کا توازنِ قوت متزلزل ہوجائیگا جسے جرمنی گوارا نہیں کرسکتا۔ اٹلی اور جرمنی دونوں کے مقاصد اسپین میں یکساں ہیں۔ علاقہ سار کی واپسی کے بعد جرمنی فرانس سے کسی علاقہ کا طلبگار نہیں نہ اُسے نوآبادیات کے علاوہ برطانیہ سے کوئی مخالفت ہے"۔

اِس بیان کے آخری فقرہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہٹلر کے دلمیں جرمن نوآبادیوں کی، جن پر برطانیہ قابض ہے بہت زیادہ خلش ہے اور وہ یہ خلش مٹا کر رہیگا۔ اگر برطانیہ نے فی الحال جرمن نوآبادیاں واپس کرنیکے بجائے جرمنی کو مشرق میں پاؤں پھیلانے دیا، تو ممکن ہے کہ نوآبادیوں کا تقاضا کچھ عرصہ کیلئے رُک جائے لیکن جب مشرقی یورپ میں فتحمند ہوکر جرمنی زیادہ طاقت کے ساتھ اُبھریگا تو برطانیہ کو نئی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اور اُسوقت نوآبادیاں واپس کئے بغیر کچھ بن نہ پڑے گا۔ اِس طرح موجودہ سیاسی صورت حال دولتِ برطانیہ کے لئے تشویش انگیز ہے۔ اور یہ صورت محض فرانس کی غدّاری سے پیش آئی ہے جس نے جنگ حبش کے زمانہ میں برطانیہ کا ساتھ نہ دیا۔ اور جو اٹلی کے ہاتھوں اب بھی پریشان ہے۔

جرمنی و آسٹریا جرمنی اور آسٹریا دونوں ہمسایہ ملک ہیں۔ آسٹریا جرمنی کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ جرمنی و آسٹریا میں تعلقات ہمسائگی کے علاوہ سب سے بڑا تعلق نسلی ہے یعنی مغربی آسٹریا کی آبادی میں جرمن عنصر سب سے زیادہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ جرمنی کی طرف زیادہ جھکتے ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے بھی جرمنی و آسٹریا کی

خارجی پالیسی ایک ہی تھی۔ اور اسی وجہ سے دونوں اتحادی ملکوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ لیکن جنگ کے بعد جب سلطنت آسٹریا کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ اور جرمنی بھی جنگ میں خستہ وخراب ہوکر اپنا گھر درست کرنے میں مصروف ہوگیا۔ تو کچھ عرصہ کے لئے دونوں ایک دوسرے سے غافل ہوگئے۔ لیکن جب جرمنی از سرِ نو طاقتور ہوگیا۔ تو اُسکی توجہ پھر آسٹریا کی طرف مبذول ہوئی۔ چنانچہ سابق چانسلر آسٹریا ڈولفس مقتول کے زمانہ میں جرمنی نے آسٹریا کو اپنے زیر اثر لانا چاہا اور آسٹریا کے نازیوں نے ملک میں اودھم مچایا تو خونریزی تک نوبت پہونچ گئی اور اٹلی نے بھی جرمنی کے خلاف اپنی فوجیں آسٹروی سرحد کی طرف بھیجدی تھیں۔ لیکن جب سے اٹلی اور جرمنی کا دوستانہ ہوگیا ہے، اٹلی اپنا پہلا رویہ چھوڑکر جرمنی کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہے۔ جرمنی کی قدرتاً یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے تمام مشرقی ہمسایوں کو زیر اثر لے آئے۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ اس کیلئے ناظرین کو یورپ کا نقشہ اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

آجکل مسولینی اور ہر ہٹلر فرانس و برطانیہ کو دھمکیاں دے رہے ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی اتنا طاقتور نہیں ہے، جو فرانس و برطانیہ کا جنگ میں مقابلہ کرسکے، جرمنی کو اس بات سے مایوسی ہے کہ برطانیہ یا فرانس سے اس کی افریقی نوآبادیاں واپس مل سکیں۔ مگر اپنی بڑھتی ہوئی آبادی بسانے اور اپنی صنعت وحرفت کے لئے خام اجناس بہم پہونچانے کیلئے جرمنی کو مزید علاقہ کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ مغربی یورپ میں اُسے قدم رکھنے کی کہیں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی علاقہ ملسکتا ہے تو مشرقی یورپ کی طرف ملسکتا ہے۔ جہاں کی سلطنتیں چھوٹی چھوٹی اور کمزور ہیں۔ اسی لئے جرمنی نے بالشویزم کے خلاف جہاد کرنے کا بہانہ ڈھونڈا ہے، تاکہ جنوبی روس کا علاقہ یوکرینیہ فتح کرلیا۔

لیکن یوکرینیہ اور جرمنی کے درمیان تین سلطنتیں یعنی آسٹریا، زیکوسلاویکیہ اور رومانیہ حائل ہیں۔ رومانیہ میں تو فسطی گورنمنٹ قائم ہوگئی ہے جس کے معنی ہیں کہ رومانیہ اٹلی اور جرمنی سے ملگیا ہے۔ اب صرف آسٹریا اور زیکوسلاویکیہ کو زیر اثر لانا باقی ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں آسٹریا کے موجودہ چانسلر شوشنیگ سے ہر ہٹلر نے ملاقات کرکے اپنے مطالبات پیش کروائے اور مزید زور ڈالنے کی غرض سے مصنوعی جنگ کے بہانے سے سرحد آسٹریا پر جرمن فوجیں جمع بھی کردیں۔

اس کارروائی کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ کمزور آسٹریا کے چانسلر کو سرِتسلیم خم کرنا پڑا۔ گو یہ ایک ماہ پہلے نازیوں کی مخالفت میں بہت بلند آہنگ تھا۔ مگر اب اُس کو دل پر جبر کرکے اُن تمام نازیوں کو چھوڑنا پڑا جنھوں نے آسٹروی گورنمنٹ کا تختہ اُلٹنے کی سازش کی تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شمڈٹ کو جو جرمنی کا حد درجہ طرفدار ہے۔ وزیرخارجہ اور ہر سیسن کوارٹ کو جو خود نازی لیڈر ہے، وزیر داخلیہ مقرر کرنا پڑا۔ محکمہ پولس بھی اب اسی کے قبضہ میں ہے۔ اس طرح ایک ادنیٰ ظاہرۂ طاقت سے گویا ہٹلر نے آسٹریا کی تمام سیاسیات خارجیہ و داخلیہ پر قبضہ کرلیا ہے۔ فرانس کو جرمنی کی اس کارروائی سے پریشانی اور اٹلی کو خوشی ہوئی۔ اب گویا روس و جرمنی کے درمیان؟

تین بڑی رکاوٹیں موجود تھیں اُن میں سے دو بالکل دُور ہوگئی ہیں البتہ تیسری رکاوٹ زیکوسلاویکیہ کی ہنوز باقی ہے، شاید چند روز میں وہ بھی دُور جائے۔ فی الحال ہرہٹلر نے آسٹریا کی آزادی و خودمختاری برقرار رکھنے کا وعدہ کیا ہے لیکن یہ آزادی برائے نام ہوگی۔ کیونکہ آسٹریا کی خارجی و داخلی سیاست جرمنی کے قبضہ اقتدار میں آگئی ہے۔ اور اِس طرح ہٹلر کا پورا تسلط قائم ہوگیا ہے۔

جرمنی و روس اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ جرمنی کو اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے بسانے اور اپنی صنعت وحرفت کے لئے خام اجناس بہم پہونچانے کیلئے مزید علاقہ کی ضرورت ہے۔ اور جب سے جرمنی کو فرانس و برطانیہ کی طرف سے نوآبادیوں کے متعلق مایوسی ہوچکی ہے۔ اُس نے اطالیہ سے دوستی کے پینگ بڑھانے شروع کردئے ہیں۔ اسمیں دو مصلحتیں اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ اٹلی اور فرانس ہمسایہ سلطنتیں ہیں۔ اِس لئے اٹلی سے دوستی ہونیسے فرانس پر اور زیادہ دباؤ پڑے گا۔ جرمنی نے جنگ حبش میں اٹلی کی حمایت کی اور اسپین کی خانہ جنگی میں بھی اُس کا ساتھ دیا۔ جس کا صلہ یہ ملا کہ پچھلے دنوں جب ہٹلر نے آسٹریا کو اپنے مطالبات منظور کرنے پر مجبور کیا تو اٹلی نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ مغربی یورپ کا علاقہ بہت محدود ہے جو جرمنی کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہے۔ دوسرے اس طرف اگر جرمنی پاؤں پھیلاتا ہے تو فرانس و برطانیہ اور شاید امریکہ سے مڈبھیڑ ہونے کا خدشہ ہے۔ اِس لئے جرمنی اب روس کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ اِسی غرض سے اُسنے بالشویزم کے خلاف جہاد کا اعلان کیا ہے۔

لیکن جرمنی یہ بھی جانتا ہے کہ فرانس و برطانیہ کا رُخ روس سے اتحاد کرنے کی طرف ہے، اِس لئے اگر روس کے مغربی حصے پر حملہ کیا تو ممکن ہے کہ فرانس اِس کو گوارا نہ کرے اور وہ روس کی امداد میں جرمنی پر حملہ کردے۔ اِسکے توڑ کے لئے جرمنی نے اٹلی سے یارانہ گانٹھ لیا ہے۔ اور دونوں کا معاہدہ ہوگیا ہے کہ اگر فرانس نے جرمنی و روس کی لڑائی کے وقت جرمنی پر حملہ کیا تو اٹلی بھی دوسری طرف سے فرانس پر حملہ کردے گا۔

یہ بات بھی غورطلب ہے کہ روس کا علاقہ مغرب میں بحیرۂ بالٹک سے لیکر مشرق اقصیٰ میں بحر الکاہل تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرق اقصیٰ میں جاپان و روس کے مفاد میں تصادم ہے اور جاپان شمالی چین میں اندرونی منگولیا پر قبضہ کرنیکے بعد بیرونی منگولیا پر بھی جو روس کی زیر حمایت ہے قبضہ کرنیکا خواہشمند ہے۔ جرمنی اور جاپان دونوں روس کے مخالف ہیں۔ اِس لئے جرمنی اور اٹلی نے جاپان سے دوستانہ معاہدہ کرلیا ہے تاکہ اگر کبھی جرمنی روس پر مغرب کی طرف سے حملہ آور ہو تو جاپان بھی مشرق سے روس پر حملہ کردے اور روس کو دوطرفہ مدافعت کرنا پڑے۔

حال ہی میں برطانیہ نے اٹلی سے مصالحت کی گفتگو شروع کردی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ برطانیہ بحیرۂ روم کے اقتدار میں اٹلی کو بھی شریک کرنیکے لئے آمادہ ہے۔ غالباً اسی سلسلے میں برطانیہ حبش پر اٹلی کی فتح بھی تسلیم کرلیگا اور اُس کے ساتھ ہی ممکن ہے جرمن نوآبادیوں یا روس پر جرمنی حملہ کا معاملہ بھی غیر رسمی طور پر طے ہوجائے۔ روس

پر حملہ سے برطانیہ کا کوئی ذاتی نقصان نہیں ہے اور نہ حبش میں اطالوی قبضہ تسلیم کرنے یا نہ تسلیم کرنے کا اُس پر کوئی خاص اثر پڑے گا۔ لیکن اس سے لیگ اقوام کا رہا سہا وجود ضرور باضابطہ طور پر ختم ہو جائے گا۔ دوسرے اِن سب باتوں کا لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ اگر برطانیہ آسٹریا زیکوسلاویکیہ وغیرہ وسطی یوروپ سے دست بردار ہو کر جرمنی کو وہاں آزاد چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا تو - اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ برطانیہ کو روس کیطرف زیادہ رجوع ہونا پڑے گا اور یوروپ اُسی حالت پر پہونچ جائے گا۔ جہاں پر وہ ۱۹۱۴ء میں تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اٹلی کے بارے میں اب زیادہ یقین کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آیندہ جنگ میں وہ جرمنی کا ساتھ دیگا۔ اور ۱۹۱۶ء کی طرح برطانیہ اس کو جرمنی سے جدا نہ رکھ سکیگا۔ اِسوقت برطانیہ نے اٹلی سے جو سلسلہ جنبانی شروع کی ہے اُسکی تہ میں یہی خواہش ہے کہ اٹلی جرمنی سے بے نیاز ہو جائے۔ لیکن ہم کو اِسکا بہت کم امکان نظر آتا ہے کہ اٹلی جرمنی کا ساتھ چھوڑ دے۔ برطانیہ کے لئے بھی اٹلی کے مطالبات پورا کرنا دشوار ہے۔ حالانکہ نہر سوئیز کے متعلق مسٹر چیمبرلین وزیراعظم برطانیہ نے دارالعوام میں اس بات سے انکار کیا ہے کہ اٹلی نے اسکا کوئی مطالبہ کیا ہے۔

موجودہ وزارت کے علاوہ عموماً مدبرین برطانیہ اٹلی کے جا و بیجا مطالبات پورے کرنیکی پالیسی کے قائل نہیں ہیں۔ فرانس بھی انگلستان کے ساتھ ہر حالت میں وابستہ رہنا چاہتا ہے اور اٹلی و برطانیہ کے درمیان سمجھوتہ کے خلاف نہیں ہے اور یوروپ میں صلح قائم رکھنے کا حامی ہے لیکن اُس نے صاف کہدیا ہے کہ امن کی خواہش کے باوجود وہ صلح کیلئے صرف مناسب قیمت ہی ادا کرنے کو تیار ہے۔ بہر حال اِسوقت یوروپ کا سیاسی مطلع بہت غبار آلود ہے معاملات پیچیدہ صورت اختیار کر رہے ہیں۔ آخری نتیجہ کیا ہوگا؟ اِسکی پیشگوئی کرنا مشکل ہے۔

ہمارا نیا سرورق

زمانہ کی نئی جلد جنوری اور جولائی سے شروع ہوتی ہے لیکن اِسکا پہلا نمبر فروری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا اسلئے فروری ہی اِسکی سالگرہ کا مہینہ ہے جس سے اسکی زندگی کا نیا سال شروع ہوتا ہے، چنانچہ اس ماہ سے ہم زمانہ کے سرورق میں ایک اہم تبدیلی کر رہے ہیں۔ جس معیار کو سامنے رکھ کر زمانہ پینتیس سال سے ملک کی ادبی خدمت کر رہا ہے اسکی ایک دھندلی سی تصویر اِس سرورق میں پیش کرنیکی کوشش کی گئی ہے۔ وقت گذرتا جاتا ہے۔ کال کا چکر گھوم رہا ہے۔ زمانہ کی گردش جاری ہے۔ وقت کا پہیہ برابر چل رہا ہے اسکی مستعدی میں نہ کوئی فرق آیا ہے اور نہ آئے گا۔ دُنیا کی سچائیاں بھی لافانی ہیں۔ گلہائے رنگ رنگ سے اس چمن کی زینت ہے۔ ہندو مسلم۔ عیسائی۔ جین۔ سکھ۔ بودھ سبھی ہمارے ملکی بھائی ہیں۔ اور سب کے تعاون باہمی پر ہماری ملکی ترقی کا دار مدار ہے۔

ہندوستانی تہذیب و اخلاق پر سبھی مذاہب کا اثر پڑا ہے اور ہمارا مستقبل انھیں تمام اجزا کے اتفاق و اتحاد سے وابستہ ہے ہمارا کلچر بھی انھیں مختلف اجزا کی تہذیب و روایات کا بہترین مجموعہ ہے۔ اسی کو ترقی دینا ہمارا ملکی فرض ہے، جس کو اس ناچیز رسالہ نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ [illegible] مسجد۔ مندر۔ گرجا۔ گوردوارہ سبھی ہمارے نئے سرورق میں جلوہ افروز ہیں۔ انھیں

کے سایۂ عاطفت میں ملک کو امن و صلح کیساتھ زندگی بسر کر کے اپنا شاندار مستقبل بنانا ہے۔ خدا ہمارے عزم میں برکت دے اور نیا سرورق ہمارے مطالب و مقاصد کو واضح کرتا رہے۔

علمی خبریں اور نوٹ

۱۹۳۷ء میں انگلستان میں سترہ ہزار سے زائد نئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس سے پہلے برطانیہ میں اسقدر تصانیف کبھی شائع نہ ہوئی تھیں۔ ہر صنف کی کتابوں میں اضافہ ہوا، لیکن افسانوں کی تعداد میں نسبتاً کم اضافہ ہوا۔ اس پر بھی ہر ہفتہ اوسطاً ۴۶ ناول شائع ہوئے۔ بقول ایک ریویو نگار ان کثیر التعداد کتابوں کی اشاعت سے یہی ثابت ہوتا ہے انسانی دلچسپی کے سامان میں خاصی ترقی ہو رہی ہے اور انگلستان میں کتابوں کی اشاعت کا کام نفع بخش ہے۔ ورنہ اس قدر اولوالعزمی و سرگرمی سے کام نہ ہوتا۔

اس کے برعکس ہمارے یہاں کی عام قدردانی کا حال بھی سن لیجئے۔ حضرت جگر مراد آبادی کا بہترین اُردو شاعروں میں شمار ہے۔ وہ تغزل کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں۔ اُنکا مجموعہ کلام پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں طبع ہوا تھا۔ اب کامل چھ سال کے بعد اُس کا دوسرا ایڈیشن جامعہ ملیہ دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ پہلے ایڈیشن کی ٹھیک تعداد تو ہمیں معلوم نہیں، لیکن دو ہزار سے زائد نہ چھپا ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گو مشاعروں میں جگر کا کلام سنکر ہزارہا سامعین سر دھننے لگتے ہیں اور واہ واہ کے شور سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں لیکن اُن کے مجموعہ کلام کو قیمت دیکر خریدنے والے ہزاروں میں دو ہی ایک ہیں۔

ہمارے دوست حضرت سحر ہتگامی نے منشی پریم چند کے آخری ناول "گئودان" کے اُردو ترجمے کی خدمت اپنے ذمہ لی تھی لہٰذا آپ نے اس کا مکمل ترجمہ کر کے پبلشر کے سپرد کر دیا ہے اور اب "گئودان" کا اُردو ایڈیشن جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوگا۔ سحر صاحب نے عمر خیام کی رباعیات کا بھی ہندی میں ترجمہ کیا ہے جسے حال ہی میں انڈین پریس الہ آباد نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

حال میں مسرز لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور نے "سولہ سنگار" کے نام سے اُردو ہندی کے مشہور افسانہ نگار مکرمی سُدرشن صاحب کے سولہ مختصر افسانوں کا ایک دلکش مجموعہ شائع کیا ہے۔ پریم چند صاحب کے بعد سُدرشن صاحب ہی ایسے مصنف ہیں جنکو اُردو ہندی دونوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ آپ نے پریم چند کی طرز تحریر کو بھی بہت کچھ اپنایا ہے اس معنی سے ہم آپ کو اُن کا جانشین سمجھ سکتے ہیں۔

۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ۔ راولپنڈی ۔ حیدر آباد ۔ میسور و مدراس وغیرہ ملک کے خاص خاص مقامات میں قدر دانان ادب نے "اقبال ڈے" مناکر ملک کے شاعر اعظم کے ساتھ اپنی عقیدت و قدردانی کا اظہار کیا ۔ جابجا دھوم دھام کے جلسے ہوئے اور ہر جگہ کلام اقبال کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی اور بڑے بڑے نکتہ شناس حضرات نے داد سخن دی ۔ لاہور میں ایک قدردان نے علامہ ممدوح کے صاحبزادے کو چار مربعہ اراضی کے بھی نذر کرکے ملک کے بڑے بڑے رئیسوں کے سامنے ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے ۔

ہم زمانہ کے آیندہ نمبر میں ممدوح کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل مضمون شائع کر رہے ہیں

لیتھو چھپائی میں کتابت کی غلطیوں کا رونا کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ مگر اس نقص کی سب سے بڑی بلکہ اصلی وجہ اُردو پریس کی بے بضاعتی ہے ۔ مطابع میں عموماً تصحیح کا کوئی خاص انتظام نہیں رہتا ۔ اور لیتھو چھپائی میں ہر قدم پر نئی غلطیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں ۔ زمانہ کا پریم چند نمبر بھی اِس نقص سے محفوظ نہیں رہ سکا ۔ بلکہ کتابت کی جسقدر غلطیاں رہ گئی ہیں اُنھیں دیکھکر طبیعت نڈھال ہو جاتی ہے ۔ "حالات" کی جگہ "حالت" ۔ "لیکن" کی جگہ "کہیں" وغیرہ وغیرہ بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں ۔ اکثر الفاظ کا اِملا بھی غلط ہوگیا ہے ، جو اس نمبر کے روئے زیبا پر ایک نہ مٹنے والا داغ ہے ۔ مگر جب تک پریس اور اُردو رسالوں کی مالی حالت بہتر نہیں ہوتی ہے ۔ ان نقایص سے مفر نہیں ۔ ایک پریم چند نمبر اور زمانہ کے پرچے ہی نہیں بلکہ اُردو کی ہر کتاب اِس نقص کا شکار ہوتی ہے

ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مضمون نگار صاحب اپنے مضامین ایک سے زیادہ جگہ بھیجنے کے عادی ہیں حالانکہ کسی ایک رسالہ کے پاس مضمون بھیجنے کے بعد اُسے دوسری جگہ بھیجنے سے پہلے مضمون نگار کا اخلاقی فرض ہے ۔ کہ اسکی اطلاع پہلے رسالہ کو دیدے ۔ زمانہ میں مضامین کا کچھ ایسا سلسلہ ہے کہ اکثر مضمون نگار صاحبان کو کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے ۔ اور بعض مضامین خاص موقعوں کے لئے قصداً روک لئے جاتے ہیں ۔ اِس لئے اُن کا دیر میں شائع ہونا باعث شکایت نہ ہونا چاہئے ۔ بہر حال ہم اپنے معاونین سے باادب یہی گذارش کرتے ہیں کہ زمانہ کے ساتھ ان کا سلوک نیکی کن بہ دریا انداز کے اصول پر ہونا چاہئے ۔ اور جو مضامین ہمارے پاس اشاعت کیلئے بھیجے جائیں وہ ہماری اطلاع کے بغیر کسی دوسری جگہ ہرگز نہ بھیجے جائیں تاکہ رسالہ کو پریشانی نہ ہو اور انھیں بھی خفت اُٹھانا نہ پڑے ۔

کویراج سرس سین صاحب وید مالک گیتا پرچار وبھاگ سنیاسی فارمیسی ، گاندھی اسکوائر لاہور ناظرین زمانہ کو شریمد گیتا کا ہندی ترجمہ مفت نذر کرنے کو تیار ہیں ۔ جن اصحاب کو شوق ہو کویراج موصوف سے طلب فرمائیں

The ZAMANA, April 193



جلد ۷۰ نمبر ۴ | مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے۔ | اپریل ۱۹۳۸ء

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ | دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا | فی پرچہ سات آنہ

اِطلاعنامہ بغرض اعلان و اشاعت حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ (ایکٹ ۲۵ ۱۹۳۴ء)

بعدالت اسپیشل جج صاحب بہادر ضلع کھیری درجہ دویم، مقام لکھیم پور

انکمبرڈ دیوانی مقدمہ نمبری نمبر ۶ ۱۹۳۶ء

گنگا دھر ولد باجی لال قوم برہمن ساکن موضع بھڑسریا پرگنہ وضلع کھیری، قرضدار سائل

بنام مہابیر پرشاد وغیرہ قرضخواہ فریق ثانی

چونکہ گنگا دھر ولد باجی لال برہمن ساکن موضع بھڑسریا ضلع کھیری نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے لہذا حسب دفعہ ۱۱ ضمن (۱) ایکٹ مذکور اطلاع دیجاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل فہرست ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا فریق ثانی نے حسب دفعہ ۱۰ گنگا دھر سائل مذکور کی جائداد ظاہر کی ہے

اگر کوئی شخص جائداد مذکور کے متعلق کوئی دعویٰ رکھتا ہو تو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونیکی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں عدالت ہذا میں اپنی درخواست پیش کرے۔

میرے دستخط اور عدالت کی مہر سے آج بتاریخ ۲۶ اپریل ۱۹۳۶ء جاری ہوا۔

مہر عدالت دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دویم ضلع کھیری

تنبیہہ:۔ فہرست ہائے (الف) و (ب) اودھ جوڈیشل فارم نمبری ۲۹ پارٹ ۶ (الف) پر اس اطلاعنامہ کیساتھ بھیجی جاویگی۔
اوقات حاضری عدالت دس بجے دن سے ۴ بجے شام تک۔

فہرست ہائے جائداد پیش کردہ قرضدار حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۸ و پیش کردہ قرضخواہ حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۱۰ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

فہرست (الف) قرضدار کے حقوق مالکانہ متعلقہ اراضی

نمبر شمار	ضلع	نام جائداد	موضع مع نمبر بندوبست و محال	درخواست دہندہ کی مستقل قابل وراثت و قابل انتقال حقیقت کی تصریح	وسعت حقیقت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع	درخواست دہندہ کی حقیقت پر موجودہ تشخیص مالگذاری	کیفیت
۱	کھیری	زمینداری	محال ککرہا موضع کیرت پور پرگنہ کھیری	قابل وراثت و قابل انتقال	حقیت اعلیٰ مندرجہ کھیوٹ رجسٹر نمبر ۳ تعدادی ۹۲ ایکڑ ۹۲ ڈسمل دحصہ منجملہ محال ککرہا موضع کیرت پور پرگنہ کھیری	۵ مالگذاری عہ ابواب	
۲	″	باغ	موضع بھڑسریا پرگنہ کھیری	″	درختان باغ بلا اراضی ۵ قطعہ کا حصہ	بلا لگان	
۳	″	مکان مسکونہ	″	″	یک قطعہ مکان مسکونہ پختہ و خام کا حصہ	بلا لگان	

فہرست (ب) اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

فہرست (ب)

قرضدار کی جائداد جو بہ استثنا رحقوق مالکانہ متعلقہ اراضی دفعہ ۶ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہو سکتی ہے

نمبر سلسلہ وار	نوعیت جائداد	وسعت حقیت درخواست دہندہ	کیفیت
۱	گائیں	دو راس	
۲	تخت چوبی شکستہ	یک عدد	
۳	ڈگریات بقایا لگان خلاف سمیان جیکرن سنگھ و جھاؤ و گھیسٹے و گیارد وغیرہ	۴ قطعہ	

تفصیل جائداد مندرجہ بیان تحریری مہاجنان (ندارد)

(مہر عدالت) دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دویم ضلع کھیری

اطلاعنامہ بغرض اعلان واشاعت حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ (ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء)

بعدالت جناب پنڈت برجناتھ ذوتشی اسپیشل جج صاحب بہادر کھیری درجہ دوم مقام لکھیم پور

مقدمہ نمبری ۱۵۶ سنہ ۱۹۳۶ء پیشی ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۳۷ء

(۱) رام چرن لال ولد شنکر لال
(۲) سوامی دیال ولد رام چرن لال } قوم کایستھ ساکن پسگوان پرگنہ پسگوان ضلع کھیری قرضدار سائل

بنام

(۱) بہادر لال
(۲) بچو لال } پسران لال جی } قوم کایستھ
(۳) مادھو رام ولد شادی لال
(۴) بابو رام
(۵) کلکٹر
(۶) سوامی دیال } پسران شیو چرن لال قوم کایستھ
(۷) گوکل ساہ ولد سوبھا رام قوم کلوار

ساکن پسگوان پرگنہ پسگوان ضلع کھیری قرضخواہ فریق ثانی

چونکہ رامچرن لال ولد شنکر لال و سوامی دیال ولد رامچرن لال قوم کایستھ ساکن پسگوان ضلع کھیری نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ پیش کی ہے لہذا حسب دفعہ ۱۱ ضمن (۱) ایکٹ مذکور اطلاع دیجاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل فہرست ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا فریق ثانی نے حسب دفعہ ۱۰ رامچرن لال وغیرہ مذکور کی جائداد ظاہر کی ہے۔

اگر کوئی شخص جائداد مذکور کے متعلق کوئی دعویٰ رکھتا ہو تو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں عدالت ہذا میں اپنی

درخواست پیش کرے۔

میرے دستخط اور عدالت کی مہر سے آج بتاریخ ۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء جاری ہوا۔

(مہر عدالت) دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دوم ضلع کھیری

تنبیہہ:۔ فہرست ہائے (الف) و (ب) او دھ جوڈیشل فارم نمبری ۲۹ پارٹ ۲ (الف) پراس اطلاعنامہ کیساتھ بھیجی جاویگی۔
اوقات حاضری عدالت ۱۰ بجے دن سے ۴ بجے شام تک۔

فہرست ہائے جائداد پیش کردہ قرضدار حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۸ و پیش کردہ قرضخواہ حسب تفصیل مندرجہ دفعہ ۱۰ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ۔

فہرست (الف)

قرضدار کے حقوق مالکانہ متعلقہ اراضی

نمبر سلسلہ وار	ضلع	[illegible]	موضع مع نمبر بندوبست و محال	درخواست دہندہ کی مستقل وراثت و قابل انتقال حقیت کی تصریح	وسعت حقیت درخواست دہندہ مندرجہ رجسٹر دفتر صاحب کلکٹر ضلع	درخواست دہندہ کی حقیت پر موجودہ تشخیص مالگذاری	کیفیت
۱	کھیری	زمینداری	موضع ابہاپور محال شنکر لال پرگنہ پسگوان	حق اعلیٰ	۵ بسوہ	۵ للعہ ۱۰ر ۹ پائی	
۲	"	"	موضع بیرم پور محال مصری لال پرگنہ پسگوان	"	۲ ¼ بسوہ	۹ عسہ ۶ر ۲ پائی	
۳	"	"	موضع انتر بازی محال دیبی پرشاد پرگنہ پسگوان	"	۱ ¼ بسوہ	سے ۱۲ر	
۴	"	"	موضع پسگوان خاص	"	۱۲ ½ بسوانسہ	۹ للعہ ۹ر ۵ پائی	
۵	"	"	موضع کلا پور پٹی شنکر لال پرگنہ پسگوان	"	۱/۱۶ حصہ مسلم پٹی	سے ۴ر ۴ پائی	

فہرست (ب)

قرضدار کی جائداد جو باستثنا حقوق مالکانہ متعلقہ اراضی حسب دفعہ ۶ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہوسکتی ہے۔

نمبر سلسلہ وار	نوعیت جائداد	وسعت حقیت درخواست دہندہ	کیفیت
۱	مکانات مسکونہ واقع پسگوان	نصف حصہ	
۲	باغ واقع موضع محدودہ پرگنہ پسگوان ضلع کھیری	۱/۱۶ حصہ	
۳	مادہ گاوان	لے راس	
۴	بچھیا	سے راس	
۵	بچھڑا	دو راس	
۶	بکری و بکرا	دو راس	

(مہر عدالت) دستخط اسپیشل جج (بخط انگریزی) درجہ دوم ضلع کھیری

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا ترجمہ، نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کیطرح زورِ بیان، ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ نوجوانوں کے قائد اعظم نے ہماری تحریکوں اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے کتاب کی ضخامت تقریباً گیارہ سو صفحات ہے، لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ، بہت سی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت مجلد صرف چار روپیہ (للعہ)

ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

میدانِ عمل

منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اسمیں ملک کے موجودہ بیدار و بے چین روح کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ اور دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے۔ بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے۔ صفحات پانسو۔ کتابت اعلیٰ، کاغذ نفیس، روشن طباعت و خوبصورت اور مضبوط جلد۔ دیدہ زیب مصور ڈسٹ کور۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

شعلہ و شبنم

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی پُرجوش اور پرکیف نظموں کا بہترین مجموعہ ہے جو آپ کو بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلبانگ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا۔

شاعرِ اعظم کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے۔ کتاب مجلد، نہایت خوشنما گرد پوش سے آراستہ۔ قیمت صرف تین روپیہ (سے)

ملنے کا پتہ

زمانہ بک ایجنسی کانپور

یادگار حالی

مشہور رسالہ زمانہ کا دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر شمس العلماء مولانا حالی کی صدسالہ سالگرہ کی یادگار میں خاص حالی نمبر کی حیثیت سے شائع کیا گیا ہے۔ جس میں مولانا مرحوم کے سوانحی حالات کے علاوہ اُنکی نثر اور نظم پر متعدد تنقیدی مضامین درج ہیں۔ موجودہ زمانہ کے کئی نامور شاعروں اور انشاپردازوں نے اس نمبر کیلئے خاص مضامین لکھے ہیں۔ جشن پانی پت کا بھی مفصل تذکرہ ہے۔ کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے یہ پرچہ قابل قدر یادگار حالی کہلانیکا مستحق ہے۔ حجم ۱۰۴ صفحات قیمت ۱۲؍ علاوہ محصول

ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

زمانہ

جلد ۷۰ — اپریل ۱۹۳۸ء — نمبر ۴

اُردو ہندی ہندوستانی

(از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی، بی۔ اے)

افسوس کا مقام ہے کہ اِس زمانہ میں آکر ایک کثیر التعداد جماعت میں اُردو کا وہ مفہوم ہوگیا ہے جس سے ہندوؤں کا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ اُردو کا یہی مفہوم اِس مخالفت کی بنا ہے جس نے اُردو ہندی کا قضیہ پیدا کر رکھا ہے۔ اُردو کا یہ مفہوم کیوں پیدا ہوا؟ اِس کے اسباب تشریح طلب ہیں۔[1]

اُردو زبان کا خمیر جس طرح تیار ہوا اُس کی بحث یہاں کسی محققانہ صراحت کی محتاج نہیں۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ اس زبان کے عناصر کی ابتدا فارسی، عربی اور دیسی بھاشاؤں کے میل جول سے ہوئی، اس کے ابتدائی نمونے لفظاً و معنیً ظاہر کرتے ہیں کہ اس زبان کے بھیس میں ہندو مسلم، ہندوستان کی دو بڑی قوموں کی زندگیوں کا میل جول ہو رہا تھا، ایک مدت تک اُردو کی یہی صورت رہی البتہ تھوڑی بہت ارتقائی اصلاح کے ساتھ۔ ابتدائی مصنفین کے یہاں سے بہت سی شہادتیں اِس قسم کی پیش کی جاسکتی ہیں جن سے دونوں قوموں کی باہمی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور عربی فارسی کے ساتھ ہندی الفاظ بھی بکثرت مستعمل پائے جاتے ہیں اِس لئے کہ ہندوؤں کی معاشرت و مذہب کے اظہار کے لئے ہندی یا بعض اوقات مقامی

---

[1] اگر کوئی صاحب اِس مضمون کا جواب تحریر فرمائیں تو اسی رسالہ میں اشاعت کے لئے بھیجیں تاکہ میں اُن کے خیالات سے اپنی معلومات کی جانچ کرسکوں، اور اگر کسی دوسرے پرچہ میں اشاعت ہو تو اسکے ایڈیٹر براہ کرم اسکی ایک کاپی میرے پاس بھیجکر ممنون فرمائیں۔ جگر بریلوی

بھاشاؤں سے امداد لینا ناگزیر ہے۔ سودا۔ میر اور انشا کے زمانہ تک اُردو نے اپنی یہ خصوصیت قائم رکھی۔ اِن بزرگوں کے یہاں ایسے اشعار کثیر تعداد میں موجود ہیں جو براہ راست نیز ضمنی طور پر ہندوانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں، اس خصوص میں نظیر اکبر آبادی سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ اِس نے اس زبان سے وہ کام لیا ہے جو ایک شاعر کو بہ حیثیت ایک بڑی قوم کے فرد کے انجام دینا چاہیئے۔ اُس نے ہندو اور مسلمان دونوں کے رسم و رواج میلوں، ٹھیلوں، تقریبوں اور تیوہاروں، نبیوں اور اوتاروں، مذہبی عقیدوں، غرض بے شمار حالات کو اپنی نظموں کا جامہ پہنا کر اور اُنھیں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر کے ایک تاریخی حیثیت عطا کر دی ہے، اور اُردو زبان کو صحیح معنی میں ہندوستانی شاعری سے مالا مال کیا ہے۔ اُس کے قلم نے اس زبان سے تمام لسانی فرائض ادا کرائے ہیں، یعنی اُس کا کلیات ہندو مسلم معاشرت کا مشترکہ طور پر آئینہ دار ہے۔

زبان اور ادب کے یہی معنیٰ ہیں کہ وہ اپنی قوم کے ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ جسمانی دماغی اور روحانی کیفیتوں کے امین اور اُن کی تدریجی نشو و نما کے ضامن و معاون ہوں۔ اُردو اِس کُلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ اُس کو بھی ہندوستان جیسے وسیع ملک کی زبان بننے کے لئے دونوں قوموں کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنا ہوگا۔ جب اس اصول کے پیش نظر اُردو کا جائزہ لیا جاتا ہے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ انشا کے بعد اُردو کی اصلاح کچھ اس طریقہ پر شروع ہوئی کہ ہندو عناصر اُس سے خارج ہوتے گئے۔ مستقل طور پر اور براہ راست اِس طرف کس کو توجہ ہوتی کہ ہندو زندگی کے کسی پہلو کو مطمح نظر بنایا جائے۔ ہندی الفاظ کے ذریعہ ضمنی طور پر اس معاشرت کی جو بو باس بھی کہیں آ جاتی تھی وہ بھی ترک و اخراج کی زد میں آگئی۔

علامہ کیفی اپنی کتاب منشورات کے صفحہ ۱۳۵ پر لکھتے ہیں:-

"اب تک ہم یہی سنتے آئے ہیں کہ فلاں لفظ فلاں ترکیب فصحا یا اکثر فصحا نے ترک کر دی۔ کوئی پوچھے کہ حضرت آخر اس ترک کی وجہ؟ تو جواب ندارد۔ یہ کبھی ظاہر نہ ہوا کہ فصاحت و فصیح کی تعریف کیا قرار دی گئی ہے؟ اس کا معیار کیا ہے؟ اس کے موازنہ کے کیا اصول ہیں؟ مزاج کی سودائیت نے ایک حساسی کیفیت پیدا کر کے قوت ممیزہ کو ماؤف کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہر تجیہ میں "آدم بو" کا مضمون صورت پذیر ہوگیا۔ نہ لفظ کی صرفی ماہیت پر نظر کی گئی نہ اُس کی معنوی اہمیت کا لحاظ ہوا اور خرج بخرج "ترک" تیر کسی گردان شروع ہوگئی۔"

ہندی الفاظ بہت زیادہ اس گردان کا نشانہ بنے، مولانا حالی اپنے مقدمہ "شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں:۔

"ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام شعرا لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیم نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی تو اُسی وقت نیچرل طور پر اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق اور فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان میں فوقیت حاصل کرنے کے لئے ضرور تھا کہ اپنی دلی کی زبان میں کوئی ما بہ الامتیاز پیدا کرتے۔۔۔۔۔۔۔
خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور اُن کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے۔ اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا"

مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند حصہ اول کے صفحہ ۱۹ پر "متوسطین کا پہلا دور" کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک ممکن ہوا فارسی اور عربی زبان کے الفاظ استعمال کئے اور ہندی اور بھاکا کے الفاظ کو چھوڑ دیا۔"

ایک طرف تو یہ کوشش رہی، دوسری طرف یہ ہوا کہ ہندوؤں نے اُردو کی داغ بیل ڈالنے اُس کو پروان چڑھانے اور ملک کے اطراف و جوانب میں پھیلانے کے لئے جو خدمتیں انجام دیں اُن کا کسی نے اعتراف نہیں کیا۔ اور جو تصانیف اُن کے قلم سے نکلیں اور عظیم الشان مذہبی کتابوں کے جو ترجمے اُنھوں نے کئے جن کی بدولت اُردو کی غیر متوقع طور پر اشاعت ہوئی وہ سب دریا برد ہوگئے۔

اِن تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو ادب کلیتہً ہندوؤں کی قومی خصوصیات سے خالی ہوگیا ایک زمانہ سے اُردو ادب جس چیز سے عبارت ہے وہ چند ناموں پر ختم ہو جاتا ہے نظم میں میر۔ سودا غالب۔ ذوق۔ مومن۔ آتش۔ ناسخ۔ امیر۔ داغ۔ انیس۔ دبیر۔ اور نثر میں شرر۔ حالی۔ آزاد۔ نذیر احمد سر سید وغیرہ۔ اب بتایا جائے اِن حضرات کی کونسی تصنیف سے ہندوؤں کی خصوصیاتِ زندگی کے کسی پہلو پر کوئی روشنی پڑتی ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اُردو کا وہی مفہوم صحیح ہے جس کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا یہ جواب کوئی معقول پسند آدمی تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہندوؤں میں اس پایہ کے مصنف نہیں ہوئے جن کا شمار اِن حضرات کے ساتھ کیا جائے۔ ہندوؤں میں بھی ہر دور میں صفِ اول کے اور نہایت بلند پایہ شعرا اور انشا پرداز ہوئے ہیں، اور اس وقت بھی

موجود ہیں، لیکن وہ سب برادرانِ وطن کی بے اعتنائیوں اور تعصبات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اِس گئے گذرے زمانہ میں بھی ایک ہندو شاعر ربیندر ناتھ ٹگور کالیداس کی طرح مشہورِ آفاق ہے، اور دنیا کے چند بہترین شعرا میں ممتاز خصوصیت رکھتا ہے، کیا اُردو میں آکر (جس کو بعض مقامات میں اُنھیں اپنی مادری زبان کہنے کا حق حاصل ہے) ہندوؤں کی فطری ذہانت و ذکاوت اس قدر ضعیف ہوسکتی ہے کہ وہ ہمیشہ پست اور ناقابلِ توجہ حیثیت اختیار کئے رہیں۔ ہندوؤں نے جب فارسی اور انگریزی میں جو اِن کی زبانیں نہیں ہیں عظیم المرتبت مشاہیر پیدا کئے تو اُردو میں قدرت و کمال حاصل کرنے کے لئے کون سے اُمور مانع ہوسکتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ یہ اپنے طرز میں لکھتے ہیں جس میں ہندویت کا اثر زائل نہیں ہوسکتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کس مپرسی اور بے اتفاقی کا شکار ہوکر بے نام و نشان ہو جاتے ہیں۔

اِدھر ہندوؤں کی تصانیف کو دائرۂ ادب سے خارج کر دیا گیا، اُدھر تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں سے ہندو مصنفوں کو نظر انداز کر دیا۔ ابتداءً جو تذکرے لکھے گئے اُن میں کہیں کہیں ہندوؤں کی خدمات کا ذکر بھی ہے، اگرچہ اجمالاً، مثلاً "گلشنِ بے خار" میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے صدہا مسلم شعرا کے ساتھ پچیس تیس ہندوؤں کو بھی نام نیک سے یاد کیا ہے لیکن اِن کتابوں کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے اُس میں اُردو کو واحد موحد و مدوّن مان کر تمام بحث کی گئی ہے۔ اس معاملہ میں محمد حسین آزاد صاحب "آبِ حیات" نے جو بے انصافی کا طریقہ اختیار کیا وہی بعد کے بہت سے تذکرہ نویسوں کے لئے شمعِ ہدایت بن گیا۔ نسیم کا نام جو آبِ حیات میں آگیا ہے وہ اس نقطۂ نظر سے بالکل بے موقعہ ہے جو آزاد کا مقصود تھا۔ اِسی لئے ابتدا میں اِسے متروک کر دیا گیا تھا[۱] لیکن بعدہٗ کچھ سوچ سمجھ کر داخل کر لیا گیا۔ آبحیات اپنی دلکش تحریر کے باعث بہت مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت کے ساتھ یہ خیال بھی پھیلتا گیا کہ اُردو میں بجز اُن چند شعرا کے جن کا ذکر اس کتاب میں ہے اور کوئی صفِ اول میں آنے کے قابل نہیں۔ "گلِ رعنا" بھی اسی قسم کا تذکرہ ہے۔ اس میں بجائے ایک کے تین چار ہندوؤں کے نام آگئے ہیں، مگر محض ضمنی اور سرسری طور پر۔ مولانا عبد السلام ندوی مؤلف "شعر الہند" نے بھی دو چار ہندوؤں کا ذکر کر دیا ہے، وہ اس طرح کہ تخلص ہے تو نام ندارد، لیکن اُنھوں نے جو کچھ تمہیدِ کتاب میں لکھا ہے اُس سے ایک حد تک اُن کے سر سے الزام جاتا رہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:۔

[۱] ملاحظہ ہو آبحیات مطبوعہ وکٹوریہ پریس ۱۸۸۱ء اس میں تسنیم کا ذکر نہیں ہے۔

"قومی شاعری کے ضمن میں مسلمانوں کے تمام مشہور مذہبی، ملکی اور علمی کارنامے آگئے، اس طرح اجمالی طور پر تاریخ اسلام کے تمام نمایاں ابواب اُردو شاعری میں آگئے۔"

حقیقت یہ ہے کہ عبدالسلام صاحب نے وہ بات صاف صاف کہہ دی جو آزاد اور ایسے ہی دیگر تذکرہ نویس دل میں رکھتے ہیں، مگر جانب داری کے الزام سے بچنے کے لئے کسی ایک آدھ ہندو مصنف کے متعلق سرسری طور پر چند جملے یا دو چار سطریں لکھکر یہ گمان پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ مثالیں مستثنیات سے ہیں۔ گویا عام طور پر ہندوؤں کو اُردو سے کوئی واسطہ نہیں رہا، اُس میں کوئی خاص فضیلت حاصل کرنا تو کجا۔

مسٹر عبدالقادر سروری کی کتاب جدید اُردو شاعری میں نسیم کو بھی نظرانداز کردیا گیا ہے ڈاکٹر عبداللطیف اپنی کتاب "انفلوئنس آف انگلش لٹریچر آن اُردو لٹریچر" میں فرماتے ہیں" اُردو ادب خالصتہً مسلم سرمایہ ہے"۔ ایسی ہی کتابوں سے ڈاکٹر بیلی نے اپنی کتاب ہسٹری آف اُردو لٹریچر مرتب کی اور ہندوؤں کی حق تلفی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ یہ تو چند کتابوں کا سرسری طور پر ذکر کردیا گیا ورنہ یہ کس مپرسی کی داستان بہت طولانی ہے۔

ایک طرف زبان اُردو کے تذکرہ نویسوں اور ادب کے علم برداروں کا ہندوؤں کے ساتھ یہ سلوک ہے۔ دوسری جانب ہندوؤں میں اپنے دعوؤں کے پیش کرنے اور منوانے کا نہ مادّہ ہے اور نہ ہمت۔ اور اگر کسی نے ایسی جرأت کی بھی تو اُس کا حشر وہی ہوتا ہے جس کی افسوسناک شہادت مباحثہ گلزار نسیم ہے۔ بدقسمتی سے جب کبھی ہندو مسلم مشاہیر کے مقابلہ کی بحث چھڑ جاتی ہے اور ایسی بحث چھڑ جانا تنقیدی شعبہ میں اکثر ناگزیر ہے تو جو حالت پیش آتی ہے وہ ناگفتہ بہ ہے سب وشتم سے قطع نظر مختصر یہ کہ کھُلے الفاظ میں کہدیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کو اُردو لکھنا آتی ہی نہیں جیسا کہ چند سال ہوئے نیاز فتحپوری نے ہندستانی اکیڈمی کی مطبوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا تھا۔

ادھر اُردو ادب نے ہندوؤں سے زبردستی قطع تعلق کرلیا۔ اُدھر سیاسی بیداری کے ساتھ ہر فرقہ میں اپنی انفرادی اجتماعیت قائم رکھنے کے خیالات و جذبات موجیں مارنے لگے

The influence of English Literature on Urdu Literature by Dr. Syed Abdul Latif. 1924.
Urdu Literature is essentially a Mohammadan Contribution
History of Urdu Literature by T. Grahamme Bailey.

ہندو مسلمان دونوں کو جدا جدا اور بجا طور پر یہ احساس ہونے لگا کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو اپنی زبان، تمدن اور مذہب کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ مسلمانوں نے جب اردو کو اس نظر سے دیکھا تو بڑے اطمینان کی سانس لی۔ اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ معاشرتی اور مذہبی راہوں پر اس کی ترقی میں منہمک ہوگئے جس کو اُس طبقہ کی سرگرمیوں نے دوبالا کر دیا جو مسلم انڈیا اور پان اسلامک تحریکوں کا موید و حامی ہے، اور جو اقبال کی طرح مولانا عبدالحق کے الفاظ میں ہنود سیرت مسلمان کو مسلمان نہیں سمجھتا۔ "ہنود سیرت" بہت معنی خیز لفظ ہے جس میں تمام ہندوانی عناصر معہ زبان کے شامل ہیں۔ اسی معنی میں آجکل "بندے ماترم" کے خلاف شورش پیدا ہو رہی ہے۔ انھیں رجحانات نے ایک گروہ کو اُردو میں عربی فارسی کے سنگین الفاظ لکھنے پر مستعد و مصروف کیا ہے یہ لوگ بھوک ہڑتال کی جگہ "مقاطعہ جوعی" تھرما میٹر کی جگہ "مقیاس الحرارت" وھائٹ پیپر کی جگہ "قرطاس ابیض" اخبار کی جگہ "جریدہ" رسالہ کی جگہ "مجلہ" وغیرہ وغیرہ لکھنے اور بولنے کو اپنا دین و ایمان سمجھنے لگے۔ اسی تعلق سے اخباروں کے نام بھی تجویز کئے جانے لگے، مثلاً الہلال۔ الخلیل البشیر۔ البرید۔ الامان۔ الناظر۔ الواحد وغیرہ وغیرہ۔

ہندوؤں نے جب اُردو ادب کو اپنے معاشرتی خصوصیات کے اعتبار سے جانچا تو میدان صاف نظر آیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی علم ہوا کہ اُن کے اسلاف کی ساری کمائی خاک میں ملا دی گئی تو ایک طرف رنج اور دوسری طرف غصہ سے بیتاب ہو گئے۔ اتنی توفیق اور ہمت تو ان کو ہوئی نہیں کہ جن بزرگوں نے اپنی ساری عمر صرف کرکے اُردو کو رواج دیا، اُس کے شعر و ادب کی ترقی میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش اور صف بہ صف منہمک کار رہیں، اُن کے ادبی کارناموں کو زندہ کریں اور اُن کے مراتب و حقوق دنیائے ادب میں تسلیم کرائیں۔ اب جو غم و غصہ کا غلبہ ہوا تو فرمانے لگے "بی اُردو ہم نے تم سے قطع تعلق کیا تم اب دوسرے کی ہوگئیں" اس بھولے پن کے قربان اور اس رقابت کے تصدق! لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا! اس جوشِ غضب میں ہندی کے ساتھ آپ کی محبت کے پینگ بڑھنے لگے۔ ہندی اپنی رنگینی و لطافت سے اپنے پریمیوں کو لبھانے میں محو تھی، اب جو آپ کی نظرِ التفات ادھر منعطف ہوئی تو چند ہی دن میں اُس کی خوش قامتی بدقامتی سے بدل گئی اور اس کے جسم پر موتیوں اور پھولوں کے ہار کی جگہ سونے کے ڈھیلے لٹکتے نظر آنے لگے جب دونوں طرف سے افراتفری شروع ہوئی اور ہندی اور اُردو ایسے قالب میں ڈھالی جانے لگی جس میں ڈھلکر دونوں میں سے کسی ایک میں بھی یہ صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ اتنے وسیع ملک

کی واحد زبان بن سکے تو مدبّرین سیاست نے ایک ایسی زبان کی طرح ڈالنے کی تجویز نکالی جو ہندوستان سے مختلف الحالات خطہ کی زبان ہو سکے۔ اگر وہ اس کو اُردو کا نام دیتے ہیں تو اُردو کے ہاتھوں ستم رسیدہ ہندوؤں کے زخم پر نمک چھڑکتے ہیں، اور اگر اسے ہندی کہتے ہیں تو مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ لہذا اس کا ایک تیسرا نام یعنی "ہندوستانی" تجویز کیا گیا ہے اس تجویز سے اُردو ہندی کا قضیہ تو مٹ سکتا ہے لیکن کیا اس سے وہ اسباب بھی مٹ جائینگے جن کے ذریعہ اُردو ادب سے ہندوؤں کا اخراج ہوا۔ اور جن کو اب فرقہ دارانہ بقائے حیات کی جدوجہد سے تقویت پہونچ رہی ہے۔ بہرحال اگر ہندو اُردو سے اپنا تعلق قطع کرنا چاہتے ہیں تو وہ سمجھ لیں کہ اپنے بزرگوں کی بہت بڑی کمائی کو دریا میں ڈال رہے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، حالانکہ ابھی تک بعض حضرات یہی دلخراش کن راگ الاپے جاتے ہیں کہ

"یہ ہماری زبان ہے پیارے"

اُردو زبان پر ہندوؤں کا اُتنا ہی حق اور دعویٰ ہے جتنا مسلمانوں کا اور انصاف پسند اہل اسلام اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت احمد علی شوق مرحوم مباحثۂ گلزار نسیم میں لکھتے ہیں:-

"اُردو زبان جہاں رواج پائے ہوئے ہے وہاں فطرتاً ہندو اور مسلمانوں میں مشترکہ ہے۔ ہندو اس کے مقلد نہیں ہیں بلکہ جس طرح مسلمانوں کو اس پر دعوے کا حق حاصل ہے اسی طرح ہندوؤں کو بھی حاصل ہے۔ فارسی جو مسلمانوں کی زبان تھی اور ہنود جس کے مقلد تھے اس میں بھی ٹیک چند صاحب بہار عجم، رائے رایان آنند رام مخلص، عوض رائے عشرت، چندر بھان برہمن، بھوپت رائے بیغم، نیز اور ارباب کمال نے کیسی کیسی بلند نامیاں حاصل کی ہیں۔ آخر کس کس کے کمال پر پردہ ڈالا جائیگا۔"

اِس حقیقت کو ماننے والے کم ہیں، اور علانیہ اس کا اظہار کرنے والے تو الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں ورنہ آج کوئی یہ نہ کہتا کہ اُردو میں ملکی زبان ہونے کی صلاحیت نہیں اور اُس کو ملک کی عام زبان نہ بنایا جائے۔

مجھے ادبی ذوق آبا و اجداد سے ورثہ میں ملا اور کم و بیش بیس پچیس سال سے اُردو تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ قدرتی طور پر میں اُردو زبان کا حامی ہوں اور رہونگا۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ خود ہندو اُسے دریا میں ڈال دینے کو تیار ہو گئے ہیں تو بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ میرا

له مباحثہ گلزار نسیم صفحہ ۱۰۰ مطبوعہ نولکشور پریس

عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہندو مشاہیر ادب کے ساتھ مساویانہ اور منصفانہ سلوک کیا جاتا، اور اُن کے حقوق و مراتب کشادہ دلی کے ساتھ تسلیم کئے جاتے رہے ہوتے اور اُردو ادب اُن کی معاشرت تمدن اور مذہب کا بھی سرمایہ دار ہوتا تو آج اُردو کی جگہ کسی دوسری زبان کی ضرورت لاحق نہ ہوتی اور یقیناً یہ وہ زبان ہوتی جس کے ذریعہ دونوں قوموں کے باہمی میل جول، خلوص اور یگانگت کو تقویت پہونچتی اور قدرتی طور پر ایک طرف "عربیرانی" کے غلبہ سے یہ محفوظ رہتی اور دوسری طرف سنسکرت کی سنگین بھرمار سے۔ اس کے اصول و قواعد بھی اس قدر تنگ نہ ہوتے جتنے کہ اُردو کے ہیں۔ اُس وقت اُردو وہی اُردو ہوتی جس کا ہیولا اس کے بانیوں نے تیار کیا تھا اور اگر میری سمجھ غلطی نہیں کرتی تو یہی اُس زبان سے مراد ہے جس کو "ہندوستانی" نام دیا جا رہا ہے۔

یہاں تک تو وہ واقعات بیان کئے گئے جن کے باعث اُردو نے ہندوؤں سے اپنا رشتہ ہی کمزور نہیں کر لیا بلکہ اُن کے حقوق تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر ہندوؤں کو کسی دوسری زبان کا دامن پکڑنے کی مجبوری پیش آ گئی۔ ادھر یہ مجبوری اُدھر روز افزوں اقتصادی اور سیاسی سرگرمیوں نے اُس زبان کو جس سے اُردو ادب عبارت ہے بہت تنگ و کوتاہ پایا۔ آزادی کی تحریک، خود مختارانہ حکومت کا احساس، ہندوستان کی بین الاقوامی حیثیت سائنس کے انکشافات، صحافت کی توسیع، تجارتی جدوجہد، ریڈیو اور ٹاکیز کی دلچسپیاں وغیرہ وغیرہ یہ تمام باتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بحیثیت قوم ہندوستانیوں کا ایک متحدہ مفاد قائم ہو، جس کی تشکیل و ترقی سارے ملک کی ایک زبان مقرر ہوئے بغیر بالکل ناممکن ہے۔ یہ ضروریات ایسی زبان چاہتی ہیں جو ہر صوبہ میں بولی اور لکھی جا سکے۔ اور جو بڑھتی ہوئی جمہوری بیداری کی ہر قسم کی ترقی کا آسان ذریعہ بن سکے۔ یعنی ملکی ترقی کی جو راہیں آئندہ کھلیں اُن کو ہر گوشے کے لوگ ایک ہی زبان میں بیک وقت سمجھ لیں اور محسوس کر لیں۔ ایسی زبان کو مقامی بھاشاؤں سے بھی بہناپا نباہنا شرط ہے اور انگریزی کو بھی چھوت نہ ماننا ہوگا۔ اس لئے کہ موجودہ دنیا کی ہنگامہ آرائی کی جو کچھ خفیف سی لہر بھی ہمارے یہاں آئی ہے وہ اسی زبان کا صدقہ ہے۔ جس کے بہت سے الفاظ اور تراکیب یا تو اُردو یا ہندی میں ترجمہ ہو ہی نہیں سکتے۔ اور اگر ہو جاتے ہیں تو عام فہم نہیں رہتے۔ جس روپ میں اُردو ہمارے سامنے اب تک آتی رہی ہے ظاہر ہے کہ اُس روپ میں وہ تمام وطنی مطالبات پورے نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ارباب حل و عقد نے روز افزوں قومی ارتقا کے تقاضے سے مجبور ہو کر ایک ایسی زبان تجویز کی جو اُن تمام مطالبات کو

پورا کرسکے اور اس کا نام ہندوستانی رکھ دیا۔ اب رہا رسم الخط کا سوال اس کا مفصل جواب تو ایک جداگانہ مضمون کا محتاج ہے۔ لیکن اُردو سے متعلق بحث کے سلسلہ میں یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ فارسی رسم الخط سے ہندی رسم الخط زیادہ آسان ہے اور آسانی سے سیکھا جاسکتا ہے لیکن میں فارسی طریقہ کا بھی حامی ہوں کہ وہ بھی ایک چیز ہے۔

یہاں تک تو اُردو کے متعلق تھا، اب ہندوستانی کے متعلق بھی چند معروضات ہیں، جو ارباب حل وعقد کے روبرو پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر ہندوستانی کو ہندو مسلم رہنمایانِ ملک کے اتفاق رائے سے ملک کی عام زبان بنایا جانا طے کردیا جائے۔ تو چند اُمور فوری غور و توجہ کے محتاج ہیں۔

اول یہ کہ ہندوستانی کے ساتھ ساتھ اُردو بھی ملک میں رائج رہیگی۔ مسلم برادران وطن کی ایک جماعت اُنھیں راہوں پر اس کی ترقی میں سرگرم رہیگی جن کا ذکر "مقیاس الحرارت" وغیرہ الفاظ کے ساتھ کیا گیا۔ یہ طبقہ کبھی ہندوستانی کو رواج دینے کا حامی نہ ہوگا۔ بلکہ اُن کی مساعی "ہندوستانی" کے خلاف ہونگی، اُن کی جد و جہد یہ ہوگی کہ رفتہ رفتہ ہندوستانی کو بھی اُردو نما عربی یا عربی نما اُردو میں جذب کردیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی ملک کے لئے کوئی نئی زبان تجویز کردینا بہت آسان ہے لیکن اُس کے ضوابط و قواعد مرتب کرنا اور رواج دینا مشکل ہے۔ اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی کوئی نئی زبان نہیں، یہ وہ زبان ہے جو اُردو اپنے ابتدائی عہد میں تھی اور کہلاتی بھی تھی اور جس کو ہندی اور اُردو جاننے والے دونوں عام طور پر بولتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن جن ضروریات نے مدبرین سیاست کو آج اسے اُردو سے جداگانہ نام اور نوعیت دینے پر مجبور کیا ہے وہی اس بات کی بھی مقتضی ہیں کہ اس کے ضوابط و قواعد بھی از سرِنو مرتب کئے جائیں، ورنہ اس میں ادب کیونکر پیدا ہوسکے گا۔ اور اگر اس میں علم ادب نہ ہوگا تو یہ زبان کس مصرف کی ہوگی۔ محض کونسل اور اسمبلی یا پلیٹ فارموں کی تقریروں تک اس کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس کا ادب بھی مدون ہوگا جیسا کہ لازمی ہے تو یقیناً اُردو کی صرف ونحو اور فنِ شعر کی یہ کلیتہً ماتحت نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے بعض صورتوں میں خصوصاً شعر میں اُردو کے اصول ہندوستانی کے لئے بہت تنگ اور مانعِ ترقی ثابت ہونگے۔

تیسری بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندو ادیب اور شعراء بھی

اہل زبان کی حیثیت سے اپنی تصنیفات کا اعتماد کریں اور اس کی درجہ بدرجہ ترقی کی تاریخ سے اپنی خدمات کو محو نہ ہونے دیں، جیسا کہ اُردو کی تاریخ میں اب تک ہوتا رہا ہے۔ اس کی سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ اسکول اور کالجوں کے لئے جو نصاب مرتب ہوں وہ دونوں قوموں کی مشترکہ خصوصیات کے اعتبار سے مرتب ہوں اور ہندو و مسلم دونوں مصنفوں کے مضامین اُن میں برابر شامل ہوں۔ جو ادارے اور انجمنیں اس زبان کی ترویج و ترقی کے لئے حکومت کی جانب سے قائم ہوں اُن کی پہلی غرض و غایت متحدہ قومیت کا مفاد ہو اور مشترکہ مقصد اُن کا مطمح نظر۔ دونوں قوموں کے ادیبوں اور مصنّفوں کی نمایندگی اُس میں پُورے طور پر ہو، اگر یہ نہ ہوا تو چند ہی دَور گزر جانے کے بعد ہندوستانی بھی اُسی راہ پر چلتی نظر آئیگی جس پر اُردو چل کر ہندوؤں سے بالکل غیر ہو گئی، اور کارکنانِ سیاست کو پھر کسی تیسری زبان کی فکر دامنگیر ہو گی۔

رندِ لا اُبالی

(شاعرِ اعظم حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

(حال میں ہماری خوش نصیبی حضرت جوشؔ کو دو روز کے لئے کانپور کھینچ لائی تھی، یہ چند اشعار اسی کرم فرمائی کی یادگار ہیں۔ ایڈیٹر)

تجھے کیا فصلِ گل ہے یا زمانِ خار ہے ساقی
تو خود اپنی جگہ اِک دولتِ بیدار ہے ساقی

تری خدمتگذاری کا شرف حاصل نہو جب تک
یہ سُنتا ہوں کہ بیداری بہت دشوار ہے ساقی

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

خدارا انتہائی لطف و نرمی سے مداوا کر
کہ عقلِ انسان کی اِک عمر سے بیمار ہے ساقی

مرا ایمان ہے اِک لرزہ براندامِ بے دینی
مرا اقرار اِک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوشؔ پر اپنے کہ اتنی بیخودی پر بھی
یہ رندِ لا اُبالی کس قدر ہشیار ہے ساقی

داغِ دل

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی اے ایل ایل بی، وکیل)

داغِ دل دیوانہ ہے — یا خمارِ بادۂ مستانہ ہے
میکدے کی ہے صدائے بازگشت — یادگارِ شورشِ رندانہ ہے
عیشِ رفتہ کا کوئی پیغام ہے — یا غم و اندوہ کا پروانہ ہے
زیست ہے ناکامیوں کی داستاں — داغ سوزاں سُرخیِ افسانہ ہے
آہ اے داغِ دلِ حسرت نصیب — تو خزف ہے یا دُرِ یک دانہ ہے
اِک گُلِ عشرت ہے مرجھایا ہوا — یا شرابِ عشق کا پیمانہ ہے
دوست ہے یا دشمنِ جانِ حزیں — آشنائے دل ہے یا بیگانہ ہے
گو کیا ہے تو نے خونِ آرزو — دل نشیں تو صورتِ جانانہ ہے

جلوہ گر ہے یوں دلِ بیمار میں
پھول ہو جیسے کوئی گلزار میں

اے شبیہِ لطفِ ایّامِ نشاط — ابتدائے رنج و انجامِ نشاط
یاد آجاتی ہے تجھکو دیکھ کر — لذّتِ صہبائے گلفامِ نشاط
جی میں آتا ہے کہ صحنِ باغ میں — باندھیئے پھر چل کے احرامِ نشاط
حسرت آبادِ جہاں میں کس قدر — دل رُبا ہے حلقۂ دامِ نشاط
ہے یہی بہتر کہ بزمِ دہر میں — گوش ہوں مہجورِ پیغامِ نشاط
مستیِ رنج و الم کے سامنے — ہیچ ہے صہبائے گلفامِ نشاط
شادزی! اے داغِ سوزاں، شادزی! — دل نہیں اب طالبِ جامِ نشاط

تیرے ساغر کو دُعا دیتا ہوں میں

دیکھنے میں گرچہ داغِ دل ہے تو
درحقیقت زیست کا حاصل ہے تو

سہل کر دیں جس نے سب دشواریاں
وادیِ ہستی میں وہ مشکل ہے تو

سوزشِ غم سے ہے گو تیری سرشت
عشرتِ جاوید کا حامل ہے تو

رہروِ راہِ محبت کے لئے
اِک چراغِ جادۂ منزل ہے تو

غرقۂ بحرِ غم و آلام کو
اِک نویدِ راحتِ ساحل ہے تو

لیلیِ پردہ نشیں کے واسطے
دل ہے محمل، پردۂ محمل ہے تو

مہرِ اُلفت ہے، نشانِ عشق ہے
سوزِ دل پر شاہدِ عادل ہے تو

محفلِ جاناں کے قابل ہو گیا
دل ترے الطاف سے دل ہو گیا

اعجازِ کلام

(از مولانا محمد یعقوب خاں کلام بی۔اے)

خوش نقابی کی اِتنی خو نہ کریں
آپ توہینِ رنگ و بُو نہ کریں

انکھڑیاں خود ہیں مے فروش ان کی
خوگرِ ساغر و سبو نہ کریں

عشق ہے اِک نمازِ صدق و خلوص
رند اندیشۂ وضو نہ کریں

اُن کا در ہے مقامِ محویّت
کوئی آئیں تو ہا و ہو نہ کریں

وصل ہو یا فراق کچھ بھی ہو
چاہنے والے آرزو نہ کریں

مے کشی سے ممانعت، توبہ!
شیخ جی ایسی گفتگو نہ کریں

خامشی بھی ہے ایک خلوتِ راز
نہ کریں، مجھ سے گفتگو نہ کریں

مر مٹیں، جان دیں، مگر عاشق
کچھ کریں، شرحِ آرزو نہ کریں

مَیں وہاں ہوں، جہاں کہ مَیں بھی نہیں
ڈھونڈھنے والے جستجو نہ کریں

روئے رنگیں جو دیکھ لیں اُن کا
گل تمنائے رنگ و بُو نہ کریں

آپ ہوں یا کلام یا کوئی اور
آج قضیہ ہی ایک سُو نہ کریں

ہندوستان کے بنک[1]

(۴) مشترک سرمایہ دار بنک

(از مسٹر عبدالرحیم شبلی، بی۔ کام)

ہندوستان کی تجارت وصنعت ترقی پذیر ہے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بنکوں کا فروغ بھی ضروری ہے۔ لیکن گذشتہ اقساط میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ پریسیڈنسی اور تبادلہ بنکوں پر بعض ایسی بندشیں لگائی گئی ہیں جو انھیں ہندوستان کی کاروباری ضروریات کو پورا کرنے کے ناقابل بنا دیتی ہیں۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ مشترک سرمایہ داری کے اصول پر بنک قائم کئے جائیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ حصوں کی شکل میں عوام کے ہاتھ فروخت کیا جائے، اور تمام کاروبار اُن کے مشورہ سے سرانجام پائے۔

تاریخ اس قسم کا سب سے پہلا بنک ۱۸۶۳ء میں قائم ہوا، جس کا نام بنک آف اپر انڈیا تھا اس کے بعد ۱۸۶۵ء میں الہ آباد بنک اور دیگر کئی بنک جاری کئے گئے۔ جن میں ۱۸۷۴ء کا الائنس بنک آف شملہ جو ۱۹۲۳ء میں دیوالیہ ہوگیا قابل ذکر ہے۔ ۱۸۷۰ء میں اِس قسم کے سات بنک موجود تھے، ۱۸۹۴ء میں اِن کی تعداد چودہ ہوگئی، ان میں سے اکثر یورپین الوالعزمی کا نتیجہ تھے۔

اِس طرز پر سب سے پہلا ہندوستانی بنک ۱۸۸۱ء میں جاری ہوا جس کا نام اودھ کمرشیل بنک تھا۔ ۱۸۹۴ء میں لالہ ہرکشن لعل مرحوم نے پنجاب نیشنل بنک اور ۱۹۰۱ء میں پیپل بنک آف انڈیا (اب دیوالیہ) جاری کئے۔

۱۹۰۵ء میں سودیشی کی تحریک شروع ہوئی جس کی بدولت بہت سے ہندوستانی مشترک سرمایہ دار بنک قائم کئے گئے، اِن میں سے بنک آف برہما، انڈین اسپیشی بنک، سنٹرل بنک آف انڈیا، انڈین بنک (مدراس)، پنجاب اینڈ سندھ بنک، بنک آف میسور،

---

[1] اس سلسلے کے اول تین مضمون زمانہ جنوری، فروری و مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

بنک آف بڑودہ اور بمبئی بنکنگ کمپنی قابل ذکر ہیں۔

ابتدائی چند سالوں میں یہ بنک خوب پھلے پھولے، لیکن ان میں سے اکثر کا کاروبار اس قدر غیر محفوظ اور قیاسی تھا، اور ان کے پاس موجبات کے مقابلہ میں زرِ نقد اس قدر قلیل تھا کہ وہ تباہی و بربادی کے گڑھے سے نہ بچ سکے۔

۲۰۔ ستمبر ۱۹۱۳ء کو پیپل بنک آف انڈیا کا دیوالہ نکلا، اس کے بعد کئی بنک یکے بعد دیگرے فیل ہوئے۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۳-۱۴ء کے دوران میں قریب پچپن بنکوں کا خاتمہ ہوگیا۔

جنگ اور مابعد جنگ کی گرانی کی وجہ سے لوگوں نے زیادہ تعداد میں بنک جاری کیے لیکن اس کے بعد بحران آیا تو اکثر ناکامیاں ہوئیں۔ ۱۹۱۵ء میں گیارہ، ۱۹۱۶ء میں تیرہ اور ۱۹۱۸ء میں سولہ بنک فیل ہوئے۔

غرض ۱۹۱۳ء سے لیکر ۱۹۲۴ء تک کا عرصہ بنکوں کے لئے نہایت نازک تھا۔ اس دوران میں ایکسو اکسٹھ ۱۶۱ بنک دیوالیہ ہوئے، جن کا ادا شدہ سرمایہ ۶ ۳/۴ کروڑ روپے تھا۔

بعد از جنگ کی ناکامیوں میں الائینس بنک اور پیپل بنک کی ناکامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ پیپل بنک کے منتظموں پر مختلف الزامات عائد کئے گئے ہیں جن کی تحقیقات ابھی تک لاہور ہائی کورٹ میں جاری ہے۔

اِن ناکامیوں کی وجہ سے روپیہ جمع کرانے والوں کو نقصان کے علاوہ عوام کے اعتبار اور ساکھ کو بھی دھکا پہونچا، نیز لوگوں کی پس انداز کرنے کی عادت اور ان کی صنعتی و تجارتی ترقی پر بھی اس کا بہت ہولناک اثر پڑا۔

ناکامیاں مشترک سرمایہ دار بنکوں کی ناکامی کے متعدد وجوہ ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ بنک اپنے موجبات کے مقابلہ میں زرِ نقد بہت کم رکھتے ہیں۔ کافی زرِ محفوظ رکھنا مستحکم بنکوں کے لئے امر لازمی ہے، اور تجربہ بتاتا ہے کہ اِس اُصول سے غفلت کا نتیجہ بسا اوقات تباہی و بربادی ہوتا ہے۔

ہندوستانی بنکوں نے ہمیشہ اس احتیاط کو بالائے طاق رکھا، جس کی وجہ سے انھیں ہولناک نتائج بھگتنے پڑے۔ مندرجہ ذیل نقشے میں ہندوستان کے تین اقسام کے بنکوں کی ذمہ داریوں کے مقابلہ میں ان کے زرِ محفوظ کا تناسب دکھایا گیا ہے۔

ذمہ داریوں کے مقابلہ میں ہندوستانی بنکوں کے زرِ نقد کا تناسب

۳۱- دسمبر ۱۹۳۳ء

قسم بنک	۱۹۰۴ء	۱۹۰۸ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۳ء	۱۹۱۷ء	۱۹۲۰ء	۱۹۲۳ء	۱۹۲۵ء	۱۹۲۶ء	۱۹۲۹ء	۱۹۳۱ء	۱۹۳۳ء
I - امپیریل بنک آف انڈیا[۱]	۴۰	۳۳	۳۱	۳۶	۴۵	۳۰	۱۸	۲۱	۲۶	۱۸	۱۵	۲۳
II (ا) تبادلہ بنک[۲]	۲۹	۱۷	۱۶	۱۹	۴۰	۳۰	۱۹	۱۳	۱۴	۱۵	۱۵	۱۲
(ب) تبادلہ بنک[۳]	۳۴	۲۷	۲۱	۱۷	۱۲۰	۵۸	۲۷	۱۵	۱۷	۱۰	۹	۶
III (ا) مشترک سرمایہ دار بنک[۴]	۱۲	۱۵	۱۱	۱۸	۲۵	۲۳	۱۷	۱۹	۱۵	۱۴	۱۲	۱۵
(ب) مشترک سرمایہ دار بنک[۵]	..	..	..	۱۶	۲۱	۱۸	۱۹	۲۰	۲۴	۱۳	۱۲	۱۷

اِن اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ جنگ سے پیشتر زمانہ میں زرِ محفوظ کے متعلق پریسیڈنسی بنکوں کی پوزیشن کیا تھی۔

۱۹۱۳ء ۔ ۱۴ کی ناکامیاں عبرت انگیز تھیں، اس لئے زرِ محفوظ کے متعلق اکثر بنکوں کی حالت بہتر رہی، لیکن ابھی اس باب میں بہت کچھ ترقی کی گنجائش ہے۔

بمبئی بنکنگ انکوائری کمیٹی نے تجویز پیش کی تھی کہ ہر بنک کو قانونی طور پر ایک قلیل ترین رقم بطور زرِ محفوظ رکھنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ لیکن سنٹرل بنک انکوائری کمیٹی نے اس تجویز کو اس وجہ سے رد کر دیا کہ بنک اس قلیل ترین معیار کو زیادہ سے زیادہ معیار تصور کرنے لگیں گے۔ مزید برآں قانون سے بچاؤ کے اور بھی کئی طریق ہو سکتے ہیں۔ کمیٹی نے اس مسئلہ کو بنکوں کی مرضی اور خوش معاملگی پر چھوڑ دیا۔ (بنکوں کی مجلس تحقیقات کی رپورٹ صفحہ ۱۰۶)

مشترک سرمایہ دار بنکوں کی ناکامی کی اور بھی کئی وجوہات ہیں جن کو مختصر طور پر درج ذیل کیا جاتا ہے :-

(۱) امانتیں کھینچنے کے لئے سود کی شرح غیر معمولی طور پر بلند ہوتی ہے، جس سے بنک

---

۱ ۱۹۲۱ء سے پہلے پریسیڈنسی بنک۔
۲ جو بیشتر کاروبار ہندوستان میں کرتے ہیں۔
۳ ایشیا میں کاروبار کرنے والے بڑے بنکوں کی ایجنسیاں۔
۴ جن کا سرمایہ اور زرِ محفوظ ۵ لاکھ یا اس سے زیادہ ہے۔
۵ جن کا سرمایہ پانچ لاکھ اور ایک لاکھ کے درمیان ہے۔
یہ اعداد و شمار ہندوستانی بنکوں کے ۱۹۳۳ء کے اعداد و شمار میں سے مقتبس ہیں

کی اندرونی حالت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ روپیہ جمع کرانے والے شرح سود سے دھوکا کھاجاتے ہیں، اور بعد کو اُنھیں زک اُٹھانی پڑتی ہے۔

(۲) انتظام و انصرام کے لئے قابل منتظمین اور کارکن میسّر نہیں آتے۔ عام طور پر وہی لوگ ساہوکاری شروع کردیتے ہیں جن کے پاس کافی روپیہ ہوتا ہے، یا جن کا کاروباری لوگوں میں اثر و رسوخ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کام کے لئے بنکوں کے طرزِ عمل کا علم اور تجربہ بھی بنہایت ہونا چاہیئے۔ فنڈلے شیراز کے الفاظ میں "بغیر علم اور تجربہ کے بنکوں کا کام شروع کردینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی فوج جنرل اسٹاف کی ہدایات اور ماہر افسران کی رہنمائی کے بغیر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوجائیے۔" (ہندوستانی زر اور مالیات ص۲۲۵)

(۳) بعض ڈائرکٹروں اور منیجروں کی دھوکہ دہی اور جعلسازی۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بعض منتظمین اپنی ذاتی ضروریات کے لئے ایک کثیر رقم نکلوا لیتے ہیں، جس کو وہ بعد ازاں ادا نہیں کرسکتے یا بنک کا روپیہ ایسے کاروبار میں لگا دیتے ہیں جس کی کامیابی محض ظنّی اور قیاسی ہوتی ہے۔

پیپل بنک آف انڈیا کے مقدمہ میں حیرت انگیز انکشافات ہورہے ہیں۔ لالہ ہرکشن لال پر تین کروڑ روپیہ کے غبن کا الزام ہے، اور بعض دیگر کارکن بھی اسی قسم کے الزامات کے نیچے ہیں۔

(۴) بعض بنک گوشوارہ میں سرمایہ کو جعلی طور پر بڑھا کر دکھانے کے عادی ہیں۔ اس سے منافع خواہ مخواہ زیادہ معلوم ہوتا ہے اور عوام دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اِس طرزِ عمل کو انگریزی میں Watering the Capital. کہتے ہیں' یعنی سرمایہ میں پانی ملا لینا، یہ اس طرح ہوتا ہے کہ فرض کیجئے کسی بنک کا ادا شدہ سرمایہ ایک لاکھ روپیہ ہے، اس پر پانچ فیصدی نفع ہوا ہے' اب نفع زیادہ دکھانے کے لئے یہ کیا جاتا ہے کہ حصہ داروں کے نام فرضی حصّے جاری کردیئے جاتے ہیں۔ اُن کے بدلہ میں کوئی رقم وصول نہیں ہوتی۔ لیکن رجسٹروں میں یہ رقم وصول شدہ دکھائی جاتی ہے۔ فرض کیجئے یہ بغیر اثاثہ کے سرمایہ چار لاکھ روپیہ کی مالیت کا جاری کیا گیا ہے۔ تو گوشوارہ میں سرمایہ پانچ لاکھ درج کیا جائیگا، اور اُسی نسبت سے نفع بھی بڑھا کر پچیس فیصدی دکھایا جائے گا۔ اس سے عام لوگ سمجھیں گے کہ بنک کی حالت نہایت مستحکم ہے اور وہ کافی منافع حاصل کررہا ہے، حالانکہ اندرونی حالت نہایت کمزور اور واقعی منافع صرف پانچ فیصدی ہے۔

یہ دھوکہ غور و خوض اور جانچ پڑتال سے دُور ہوسکتا ہے۔

(۵) سرکاری یا نیم سرکاری اداروں نے فیل شدہ بنکوں کی امداد نہ کی۔ یوروپین بنکوں نے اکثر

تعصب کا برتاؤ کیا، اور ہندوستانی بنکوں کی امداد کرنے سے گریز کیا۔ مثلاً بنک آف بنگال نے پیپل بنک کو سرکاری تمسکات پر بھی روپیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

علاوہ بریں پہلے ریزرو بنک بھی موجود نہ تھا اور ہندوستانی بنکوں کے آپس میں اتحاد واتفاق نہ تھا۔

بعض نکتہ چیں نادانی سے کہہ دیتے ہیں کہ ان ناکامیوں سے بنک چلانے کے متعلق ہندوستانیوں کی نااہلیت ظاہر ہوتی ہے، حالانکہ مشترکہ سرمایہ دار بنکوں کی ناکامیاں محض ہندوستان ہی میں نہیں ہوئیں بلکہ ان کی مثالیں امریکہ اور انگلستان کی تاریخ بنکنگ میں بھی ملتی ہیں۔ جیسا کہ مسٹر ڈوراسوامی رقمطراز ہیں "ہندوستانی بنکوں کی ناکامی کا راستہ یورپینوں کے منظمہ اداروں کی تباہی وبربادی سے اٹا پڑا ہے۔" اور وہ اس کے ثبوت میں بنک آف بمبئی ۱۸۶۶ء اور ارتھنات بنک کی ناکامی کو پیش کرتے ہیں۔ ہم اس کے علاوہ الائینس بنک آف شملہ کی مثال بھی دے سکتے ہیں۔ یہ سب بنک یورپین انتظام کے ماتحت تھے۔ لیکن بالآخر ٹوٹ گئے۔

پس بنکوں کی ناکامی کو ہندوستانیوں کی نااہلیت سے منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ اگرچہ بعض بنکوں کے معاملہ میں دھوکہ دہی اور جعل سازی بھی ناکامی کا سبب معلوم ہوئی ہے لیکن زیادہ تر اس کی وجہ تجربہ اور علم کا فقدان ہے۔ پس بنکوں کو بہتر بنانے کے لئے قابل منتظمین اور ماہر کارکنان کا انتخاب ضروری ہے۔

جہاں ہندوستان میں بنکوں کی ناکامی سے بہت سے نقصان ہوئے ہیں وہاں اُن سے ایک فائدہ بھی پہونچا ہے اور وہ یہ کہ ہندوستانی بنکوں کی کمزوریاں واضح ہوگئی ہیں، جن کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

ترقی گزشتہ ساٹھ سال سے مشترک سرمایہ دار بنکوں میں خاطرخواہ ترقی ہوئی ہے، اس ضمن میں اعداد وشمار مندرجہ ذیل ہیں:-

ہندوستان کے مشترک سرمایہ دار بنکوں کے سرمایہ، زر محفوظ امانتوں اور نقد کے متعلق شمار واعداد

قسم اول:- وہ بنک جن کا سرمایہ اور زر محفوظ پانچ لاکھ یا اس سے زائد ہے۔

۵۷ ہندوستانی مالیات، زر اور بینکاری۔ ایس۔ وی۔ ڈوراسوامی ص۱۹۳

۳۱ - دسمبر سنہ ع	بنکوں کی تعداد	سرمایہ اداشدہ لاکھ روپے	زرِ محفوظ لاکھ روپے	امانتیں لاکھ روپے	نقد لاکھ روپے
۱۸۷۰	۲	۸٫۹	۱٫۸	۱۳	۵
۱۸۸۰	۳	۱۸	۳	۶۳	۱۶
۱۸۹۰	۵	۳۳	۱۷	۲۷۰	۵۵
۱۹۰۰	۹	۸۲	۴۵	۸۰۷	۱۱۹
۱۹۱۰	۱۶	۲۷۵	۱۰۰	۲۵۶۵	۲۶۰
۱۹۱۳	۱۸	۲۳۱	۱۳۲	۲۲۵۹	۴۰۰
۱۹۱۴	۱۷	۲۵۱	۱۴۱	۱۷۱۰	۳۵۳
۱۹۱۵	۲۰	۲۸۱	۱۵۶	۱۷۸۷	۳۹۹
۱۹۱۸	۱۹	۴۳۶	۱۶۵	۴۰۵۹	۹۴۸
۱۹۲۰	۲۵	۸۳۷	۲۵۵	۷۱۱۴	۱۶۳۰
۱۹۲۱	۲۷	۹۳۸	۳۰۰	۷۶۸۹	۱۵۶۵
۱۹۲۲	۲۷	۸۰۲	۲۶۱	۶۱۶۳	۱۲۰۳
۱۹۲۳	۲۶	۶۸۹	۲۸۴	۴۴۵۲	۷۳۷
۱۹۲۴	۲۹	۶۹۰	۳۸۰	۵۲۵۰	۱۱۲۹
۱۹۲۵	۲۸	۶۷۳	۳۸۶	۵۴۴۹	۱۰۰۹
۱۹۲۶	۲۹	۶۸۸	۴۱۹	۶۰۸۴	۷۶۹
۱۹۲۹	۳۳	۷۸۷	۳۶۷	۶۲۷۲	۹۰۵
۱۹۳۱	۳۳	۷۷۷	۴۲۶	۶۲۲۳	۷۷۰
۱۹۳۲	۳۴	۷۸۲	۴۴۰	۷۲۳۴	۹۷۶
۱۹۳۳	۳۴	۷۷۸	۴۵۵	۷۱۶۸	۱۰۹۲

قسم دوم

وہ بنک جن کا سرمایہ اور زرِ محفوظ ایک لاکھ روپیہ سے پانچ لاکھ روپیہ کے درمیان ہے۔

۳۱۔ دسمبر سنہ ء	بنکوں کی تعداد	سرمایہ اداشدہ لاکھ روپے	زرِ محفوظ لاکھ روپے	امانتیں لاکھ روپے	نقد لاکھ روپے
۱۹۱۳	۲۳	۳۹	۱۱	۱۵۱	۲۴
۱۹۱۴	۲۵	۴۲	۱۳	۱۲۶	۲۷
۱۹۱۵	۲۵	۴۵	۹	۹۱	۲۰
۱۹۱۸	۲۹	۴۸	۱۴	۱۵۵	۳۶
۱۹۲۰	۳۳	۶۱	۱۹	۲۳۳	۴۱
۱۹۲۱	۳۸	۷۷	۲۳	۳۲۶	۴۳
۱۹۲۲	۴۱	۸۳	۲۷	۳۳۷	۵۶
۱۹۲۳	۴۳	۸۰	۳۰	۳۲۶	۶۱
۱۹۲۴	۴۰	۷۲	۳۴	۲۶۶	۳۴
۱۹۲۵	۴۶	۸۰	۳۷	۳۴۱	۶۷
۱۹۲۶	۴۸	۸۴	۳۷	۳۴۵	۵۲
۱۹۲۹	۴۵	۷۵	۴۰	۳۵۸	۴۵
۱۹۳۱	۵۱	۸۳	۴۱	۳۸۴	۴۷
۱۹۳۲	۴۹	۸۰	۴۱	۳۸۲	۶۵
۱۹۳۳	۵۰	۸۲	۴۰	۴۶۴	۷۹

۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ہندوستان میں کل چوراسی مشترکہ سرمایہ دار بنک تھے جن کا سرمایہ ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھا۔ ان کا مجموعی اداشدہ سرمایہ آٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ روپے، زرِ محفوظ چار کروڑ پچانوے لاکھ روپے، امانتیں چھتر کروڑ تبیس لاکھ روپے، اور نقد گیارہ کروڑ اکھتّر لاکھ روپے تھے۔

ان میں سے چھ بنکوں کی امانتیں سب سے زیادہ تھیں، بنک آف میسور اور بنک آف بڑودہ کو چھوڑ کر، جن کو ریاست کی سرپرستی حاصل ہے، باقی چار بنک ہندوستان کے مالی نظام میں سب سے اہم ہیں، ان کے نام یہ ہیں (۱) بنک آف انڈیا (۲) سنٹرل بنک آف انڈیا (۳) پنجاب نیشنل بنک (۴) الہ آباد بنک۔ ان میں سے صرف پنجاب نیشنل بنک اور

سنٹرل بنک آف انڈیا ہندوستانی انتظام کے ماتحت ہیں۔

اوپر کے نقشہ سے ظاہر ہے کہ ۱۴-۱۹۱۳ء کی ناکامیوں کی وجہ سے بنکوں کو ایک صدمہ پہونچا لیکن ۱۹۱۵ء سے وہ ترقی کی طرف مائل ہوئے حتیٰ کہ ۱۹۲۱ء میں امانتوں کی رقم اسّی کروڑ تک پہونچ گئی، ترقی زیادہ تر جنگی حالات کی وجہ سے ہوئی۔ ۱۹۲۱ء کے بعد پھر انحطاط شروع ہوا علی الخصوص ۱۹۲۳ء بنکوں کے لئے ایک ہولناک سال تھا۔ ۱۹۲۳ء کے بعد ترقی محسوس ہوئی ہے، اور عالمگیر کساد بازاری کا بنکوں پر کوئی غیر معمولی بُرا اثر نہیں ہوا۔

اِن باتوں کے باوجود مشترک سرمایہ دار بنکوں کی حالت چنداں تسلی بخش نہیں ہے، حال ہی میں امپیریل بنک اور اُس کی شاخوں، تبادلہ بنکوں اور اُن کی شاخوں، امداد باہمی بنکوں اور پوسٹل سیونگ بنکوں وغیرہ کی وجہ سے مقابلہ بڑھ گیا ہے۔ مزید برآں اِن بنکوں کی سرکار کی طرف سے بھی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔

تاہم یہ مقابلہ مشترک سرمایہ دار بنکوں کو اپنی حالت بہتر بنانے کے لئے موقع بہم پہونچا رہا ہے اور اگر ریزرو بنک آف انڈیا کی ہدایت کے ماتحت ایمانداری سے کام کریں تو ترقی کی بہت کچھ گنجایش ہوسکتی ہے۔

قانونی انضباط مشترک سرمایہ دار بنکوں کی پے در پے ناکامیوں کو دیکھ کر اکثر ماہرین کی تجویز ہے کہ بنکوں کا ایک باقاعدہ ضابطہ مقرر کیا جائے۔ آجکل بنک انڈین کمپنی ایکٹ ۱۹۱۳ء کے ماتحت ہیں، اور اس ایکٹ کی صرف چند دفعات کا بنکوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ حالانکہ بنکوں کے مخصوص طرز عمل کے پیش نظر اُن کے لئے ایک علیحدہ قانون بنانے کی ضرورت ہے۔

بنکوں کی مرکزی مجلس تحقیقات نے سفارش کی تھی کہ ایک بنک ایکٹ پاس کیا جائے جس میں بنکوں کے لئے علیحدہ ضابطہ تجویز ہو۔ مثلاً اُن کی رائے میں قانون مندرجہ ذیل شقوں پر حاوی ہو:-

(۱) تنظیم (۲) نظامت (۳) پڑتال اور معائنہ (۴) دیوالہ اور ادغام

تنظیم:- جو ادارے یا کمپنیاں اپنے آپ کو "بنک" کی حیثیت سے رجسٹر کروائیں وہ مندرجہ ذیل اُمور بھی اپنے قواعد و ضوابط میں درج کریں:-

(ا) بنکنگ کے سوائے وہ اور کوئی کام نہ کریں گے۔

(ب) وہ بنک کے ذاتی اثاثہ کی ضمانت پر قرض نہ دیں گے۔

(ج) ڈائرکٹروں منیجروں اور اسٹاف کے ممبروں کو صرف محدود قرضہ دیا جائیگا۔
(د) ڈائرکٹروں اور بنک کے دیگر افسروں کے محاسن، تقرر، استعفیٰ اور حق رائے دہندگی کے متعلق تفصیلی شرائط درج کریں گے۔
تبادلہ بنکوں کے سوا ہندوستان میں کام کرنے والے تمام بنکوں کے ڈائرکٹران ہندوستانی ہونا چاہیئے۔
تبادلہ بنکوں کے سوا جب تک حصہ داروں میں اکثریت ہندوستانیوں کی نہ ہو اور بنک ہندوستانی قانون کے ماتحت رجسٹرڈ نہ کرایا جائے کسی بنک کو ہندوستان میں کام کرنے کی اجازت نہ ہو
"منیجنگ ایجنسی سسٹم" کے اصول پر کسی بنک کی تنظیم نہ کی جائے، کیونکہ بنکنگ میں اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔
کوئی مشترک سرمایہ دار بنک جب تک کہ اس کے ادا شدہ سرمایہ کی رقم پچاس ہزار روپیہ نہ ہو جائے کاروبار شروع نہ کرنے پائے۔ منظور شدہ سرمایہ سرمایۂ حصص کے دُگنے سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے اور ادا شدہ سرمایہ سرمایۂ حصص کے پچاس فیصدی سے کم نہ ہو۔

نظامت:۔

(ا) زرِ محفوظ:۔ جب تک "زرِ محفوظ" ادا شدہ سرمایہ کے برابر نہ ہو، ادا شدہ سرمایہ کا کم از کم ۲½ فیصدی حصہ منافع تقسیم کرنے سے پہلے "زرِ محفوظ" میں منتقل کر دینا چاہیئے۔
(ب) زرِ نقد۔ جب ریزرو بنک قائم ہو جائے تو ممبر بنکوں کو "زرِ بدست" Cash in hand کے علاوہ اپنے "عند الطلب" اور "وقتی" "موجبات" یعنی Demand & Time Liabilities کا کچھ حصہ اُس میں جمع کرانا ہوگا۔
(ج) انضباطِ مقروضات ۔ آڈیٹروں کی کمپنی یا کسی واحد آڈیٹر کو قرضہ دینا ممنوع قرار دیا جائے۔

پڑتال اور معائنہ:۔ اگر بنک کے افسر یا ڈائرکٹران کسی ضروری معلومات کے بہم پہونچانے میں غفلت برتیں تو اس کے لئے انھیں موردِ الزام ٹھہرایا جائے۔

دیوالہ اور ادغام:۔ مشکلات کے وقت ریزرو بنک کی سفارش پر بنک کو اپنے موجبات کی ادائی سے عارضی طور پر بری قرار دیا جائے تاکہ بنک بے وقت اور مجبوراً دیوالیہ ہونے سے

محفوظ رہ سکے۔

رضاکارانہ دیوالہ کے موقع پر لکویڈیٹر ریزرو بنک کے ڈائرکٹران کی طرف سے مقرر ہو۔ اگر بنک کسی اور بنک کے ساتھ الحاق کرنا چاہے تو ریزرو بنک کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اُسے مناسب مشورہ اور امداد دے۔

ظاہر ہے کہ قانون بنکنگ کی ضرورت نہ صرف اس لئے ہے کہ ہم امانت رکھنے والوں اور حصہ داروں کو بنکوں کے منتظمین کی بدنظمی سے بچانا چاہتے ہیں، بلکہ ہماری غرض یہ بھی ہے کہ بنک خود بھی اپنے استحکام پر کلہاڑی نہ چلائیں۔ ان حالات میں محسوس کیا گیا ہے کہ جب تک علٰحدہ بنک ایکٹ نہ بن جائے موجودہ کمپنی ایکٹ ہی کی ضروری ترمیم کردی جائے گورنمنٹ کے خیال میں ابھی علٰحدہ قانونِ بنک بنانے کا وقت نہیں آیا، اس لئے موجودہ قانون ہی میں ترمیم مناسب ہوگی، چنانچہ ۱۹۳۶ء میں اس سلسلے میں وزیر قانون گورنمنٹ ہند کی طرف سے مرکزی اسمبلی میں بعض ترمیمات پیش بھی ہوئی تھیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) "بنک" وہ قرار دیا جائے جس کا اوّلین فرض امانتیں جمع کرنا ہو، خواہ وہ قرض دینے سے ہنڈیوں پر بٹّہ کاٹنے، مراسلاتِ قرض جاری کرنے یا قیمتی اشیاء بغرض امانت وصول کرنے وغیرہ کے فرائض بھی انجام دے۔

(۲) اُسے بنکنگ کے علاوہ اور کوئی کام نہ کرنے دیا جائے

(۳) مینجنگ ایجنٹ مقرر نہ ہوں،

(۴) کام شروع کرنے سے پیشتر کافی سرمایہ (مثلاً پچاس ہزار) جمع ہو جائے، اور اس مطلب کا ایک سرٹیفکٹ حاصل کرلیا جائے۔

(۵) زرِ محفوظ علٰحدہ کرنا ضروری قرار دیا جائے، اور جب تک وہ ادا شدہ سرمایہ کے برابر نہ ہو مؤخرالذکر کا ½ ۲ فیصدی حصہ "زر محفوظ" میں منتقل کیا جائے۔

(۶) وقتی موجبات" کا ½ ۱ فیصدی اور عند الطلب" موجبات" کا ۵ فیصدی حصہ بطور "زر نقد" رکھا جائے۔ اور اس کے ماہواری تخمینے رجسٹرار کو پہونچائے جائیں۔

(۷) عارضی مشکلات کو پاٹنے کے لئے ایک جبری اعلان برائے التوائے ادائی شائع کیا جائے، یہ ترمیمات زیادہ تر سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ہیں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

بچے

(از مہاشہ جیمنی سرشار خیر پور سادات ضلع مظفر گڑھ)

یہ مسرور و خنداں یہ دلشاد بچے   مسرت کی دنیا میں آباد بچے
یہ روشن جبینیں یہ مسرور چہرے   وفورِ مسرت سے پُرنور چہرے
یہ دنیائے دوں کے گناہوں سے غافل   زمانے کی ٹیڑھی نگاہوں سے غافل
نہ رنج والم ہے نہ افکار دل میں   تردد نہیں کوئی زنہار دل میں
نہ کچھ فرق ماو شما اُن کے دل میں   نہ کچھ خوف جور و جفا اُنکے دل میں
نہ جھگڑا کوئی کفر و ایمان کا ہے   نہ کچھ فرق ہندو مسلمان کا ہے
نہ ہے رنج افلاس و زعمِ امارت   غلامی کا احساس، رُعبِ حکومت
نہ پابند مذہب کے اور ذات کے ہیں   مکمل نمونے مساوات کے ہیں

انھیں ناسمجھ اور ناداں سمجھیں
کہ پہلے زمانے کے انساں سمجھیں

اے ننھے فرشتو! اے معصوم بچو!   نہیں آہ! تم کو یہ معلوم بچو!
تمھارا وطن یہ جو ہندوستاں ہے   بہت مضطرب، خستہ و نیم جاں ہے
زمانے کے ہاتھوں ستایا ہوا ہے   مصیبت کے چکر میں آیا ہوا ہے
نہ وہ شان و شوکت نہ حشمت ہے باقی   نہ عزت ہے باقی نہ حرمت ہے باقی
اسے کھاگئے کفر و ایماں کے جھگڑے   کہ جاری ہیں ہندو مسلماں کے جھگڑے
نہ خوفِ خدا ہے نہ ہے نورِ ایماں   فقط نام کے ہیں یہ ہندو مسلماں
نہیں پاسباں کوئی اپنے وطن کا   نہیں باغباں کوئی اُجڑے چمن کا
ہیں مسدود مہر و محبت کی راہیں   تمھیں تک رہی ہیں وطن کی نگاہیں

خدا تم کو توفیق دے نونہالو!
تباہی سے اپنے وطن کو بچالو

برہمیندر سوامی

(از جناب مائل نقوی، صدر انجمن اُردو بھوپال)

اُن قوموں کی سیاسی تاریخ میں جنھوں نے معرکۂ عمل میں داخل ہو کر دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں بعض اوقات ایسے مقدس لوگوں کے نام بھی نظر آجاتے ہیں جو مسندِ رُشد و ہدایت پر بیٹھکر اپنی قوم کی روحانی پیشوائی کے ساتھ ساتھ شاہراہِ سیاست میں بھی اُن کی رہنمائی کرتے رہے ہیں یہ ہستیاں اگرچہ خود شمشیر بکف ہو کر میدانِ عمل میں نہیں آتیں، لیکن سیاسی شطرنج کی بساط کے مُہرے انھیں کے اشاروں سے نقل و حرکت کرتے ہیں۔ اور اِن کے مشوروں سے وہ کام انجام پا جاتے ہیں جن کے سامنے کُہن سال مُدبر اور طاقتور جنرلوں کو اپنی تدبیر و فراست کی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

مرہٹہ قوم کی سیاسی تاریخ میں شروع ہی سے ایسے بزرگوں کے نام آتے ہیں۔ سیواجی کی کامیابی کا راز اگر تمام تر نہیں تو زیادہ تر ان کے مذہبی گُرو کا رہینِ منت سمجھا جاتا ہے۔ برہمیندر سوامی کا نام بھی اسی قسم کے بزرگواروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ سوامی جی کو اپنی زندگی میں مرہٹہ طاقت پر جو قابلِ رشک اقتدار حاصل رہا اُس کی مثال بعد کی تاریخ میں تلاش کر لینا مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے ان کی قابلِ احترام شخصیت نہ صرف کثیر التعداد عام مرہٹہ افراد کی دینی رہنما سمجھی جاتی تھی بلکہ اُس عہد کے تمام مرہٹہ سرداروں، پیشوا حتیٰ کہ خاندانِ سیواجی کے چشم و چراغ "شاہو" کی روحانی رہبر اور اتالیقِ سیاست تسلیم کی جاتی تھی۔

پیشوا باجی راؤ اوّل کے زمانہ میں مرہٹہ قوت کو جو انتہائی عروج حاصل ہوا، شاہو کو پیشوا پر جو کچھ طاقت حاصل رہی وہ سب سوامی جی ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ سنہ ۱۷۲۰ء سے ۱۷۴۵ء تک مرہٹہ طاقت سے متعلق کوئی واقعہ ایسا نہ ملے گا جو ان کی مؤثر شخصیت کا زیر بار احسان نہ ہو۔ سلطنت مغلیہ کو کمزور کرنے کی تدبیریں، دہلی میں مرہٹوں کی سازشیں، نظام الملک کی شکست، پرگیزوں سے جنگ "بیسین" کا محاصرہ غرض ہر واقعہ میں ان کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

لہ دفتر پیشوا، دفتر چہارم و ششم صد ۱۲۱ و ۲۰۵

سوامی جی کا اصلی نام "وشنو" تھا، "دھاودیش" کے رہنے والے تھے، ان کا خاندان عرصہ دراز سے مذہبی تقدس کے لئے مشہور چلا آتا تھا۔ سوامی جی کو ابتدائے عمر ہی سے دنیا کی طرف زیادہ توجہ نہ تھی۔ ریاضت اور نفس کشی میں بیشتر وقت بسر کرتے تھے۔ اس کے بعد سیاحت شروع کی، اور شمال میں ہمالیہ کی مقدس چوٹیوں سے لیکر جنوب میں رامیشور تک ہر جگہ پہونچکر زیارت اور تپسیا کی۔ ان تمام باتوں سے فارغ ہوکر وطن کی طرف مراجعت کی، علاقہ "رتناگری" میں ایک مقام "چپلن" ہے وہاں ۱۶۹۸ء میں گوشہ گیر ہوکر بیٹھ گئے۔ سنیاس لینے کے بعد اپنا اصلی نام بھی ترک کر دیا، اس کے بجائے "برہمیندر سوامی" کا لقب اختیار کیا۔ چنانچہ تاریخی اور مذہبی دنیا میں آج تک اسی نام سے مشہور ہیں۔

سوامی جی پہلے دنیا کے گرد خود گھومے تھے۔ اب گوشہ نشینی کے بعد دنیا اُن کے گرد آکر جمع ہوگئی۔ ان کے حسنِ اخلاق اور فیاضی نے اسمیں اور اضافہ کیا۔ معتقدین کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی، یہاں تک کہ لاکھوں تک نوبت پہونچ گئی۔ پیشوا بالاجی وشنوناتھ راؤ ان کے اثر اور اوصاف کی شہرت سُن سُنکر غائبانہ ملاقات کا مشتاق ہوا، اور جب حاضری کا موقع ملا تو ان کے خداداد اوصاف سے بہت متاثر ہوکر اُٹھا۔ اُن کے تقدس سے صرف ہندو ہی متاثر نہ تھے بلکہ قرب وجوار کے مسلمان رؤسا بھی ان کا دل سے ادب کرتے تھے۔ جنجیرہ کے مسلمان فرمانروا نے دو گاؤں اُن کے مصارف کے لئے وقف کردیئے تھے۔ مرہٹہ سردار تو ایک بھی ایسا نہ تھا جس پر سوامی جی کا غیر معمولی اثر نہ ہو۔ اُس زمانہ کی جس قدر سربرآوردہ مرہٹہ شخصیتوں کے نام تاریخ میں آتے ہیں وہ سوامی جی کی اطاعت کا سب دم بھرتی تھیں۔[1]

سوامی جی اگرچہ دنیا سے دُور رہتے تھے لیکن دل کی نگاہ سے سب کچھ دیکھتے تھے، معاملاتِ دنیا کو خوب سمجھتے تھے، تمام نشیب وفراز پیش نظر رکھتے تھے، آنے والے واقعات کا اندازہ کرتے تھے اور ضرورت کے وقت حالات پر اثر انداز بھی ہوتے تھے۔ مرہٹہ سرداروں کی روحانی امداد کے علاوہ مادّی اسباب سے بھی مدد کرتے تھے۔ پیشوا اور خود شاہو سے براہِ راست خط وکتابت جاری رہتی تھی۔ ان خطوں کی بیشتر تعداد بیان کی جاتی ہے۔ ۱۹۰۱ء میں مرہٹہ تہذیب کے مرکز "ستارا" سے راؤ بہادر پارسین آنجہانی نے سوامی جی کی ایک مکمل سوانحعمری شائع کی، جس میں انھوں نے ۲۷۵ مکتوبات کی نقل درج کی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت بمبئی کے زیر اہتمام پیشوا کے دفتر کا ایک حصہ ۴۵ ضخیم جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ اس میں بھی سوامی جی کا نام جا بجا آتا ہے۔ خطوط اور حالات کے مطالعہ سے اندازہ

[1] لائف آف برہمیندر سوامی ص ۱۵۲

ہوتا ہے کہ سوامی جی اعلیٰ سیاسی قابلیت کے مالک تھے۔ اُن کی شخصیت مرہٹہ طاقت کی روح رواں تھی۔ تمام مہاراشٹر میں اُن کا نام نہایت احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ اور انھیں اُس عہد کا "مہاپرش" تسلیم کیا جاتا تھا۔

مرہٹوں کے مہاراجہ اعظم شاہو پر سوامی جی کا جو اثر تھا، شاہو کو ان کی خاطر جس درجہ عزیز تھی، اور جن طریقوں سے وہ ان کی دلداری کی کوشش کیا کرتا تھا، ان تمام باتوں پر مذکورہ تحریروں سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

اُسی زمانہ میں درباروں یا سرکاری دفتروں سے جو خط کسی کے نام لکھے جاتے تھے اُن میں تکلفات اور رسمی اُمور کا صد درجہ خیال رکھا جاتا تھا، اور ساری تحریر تصنع و عبارت آرائی کا نمونہ بن کر رہ جاتی تھی۔ لیکن شاہو اور پیشواؤں نے جو خط سوامی جی کو لکھے ہیں اُن میں ان فرعات کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ ہر خط کی تحریر نیازمندانہ و مخلصانہ اور صاف ہے سوامی جی بھی جو خط اِن لوگوں کو لکھتے تھے اُن میں خوشامد اور تکلف سے دُور رہ کر حکیمانہ نصیحتیں اہم مسائل پر اظہار رائے اور مفید مشورے ہوتے تھے۔ کبھی سوامی جی اپنی ضروریات و تکلیفات کا اظہار بھی "شاہو" سے کیا کرتے تھے۔ اور وہ ان فرمائشات کو تمام اُمور ریاست پر مقدم سمجھکر انھیں انجام دینے میں ہر امکانی کوشش صرف کر دیتا تھا۔

"شاہو" کے زمانہ میں "اودے جی" ایک سرکش مرہٹہ سردار تھا، اُس نے اس قدر طاقت حاصل کر لی تھی کہ شاہو اُس کے خلاف کوئی کارروائی علانیہ کرنے میں تامل کرتا تھا۔ جس طرح مرہٹے دوسرے صوبوں سے چوتھ وصول کرتے تھے اُسی طرح اودے جی نے شاہو کو مجبور کر کے خود مرہٹہ صوبوں سے ایک خاص حق وصول کرنے کی اجازت لکھوالی تھی۔

سوامی جی گو خود فقیر تھے، مگر ان کے یہاں دولت کا بڑا انبار تھا، لاکھوں روپیہ نقد اور اس سے زائد کا سامان جمع تھا، چیلوں کے اخراجات کے لئے بہت سے گاؤں معافی میں تھے، اودے جی اپنا حق وصول کرتا ہوا جب ادھر سے گزرا تو اُن سے بھی مطالبہ کیا، اُنھوں نے کچھ فقیرانہ تصرفات سے کام لے کر کچھ چیلوں کا زور دکھا کر اُسے زیر کرنا چاہا، مگر وہ بھی اپنی جماعت لیکر اڑ گیا۔ اور اثبات حق میں شاہو کا فرمان دکھلایا۔

یہ معاملہ بہت طول پکڑ گیا۔ آخر سوامی جی نے شاہو کو کل کیفیت سے آگاہ کیا۔ شاہو نے اودے جی کے نام ایک مراسلہ لکھا اور بطریق مناسب گوشہ نشین فقیر کے مزاحم ہونے سے روک دیا۔

اِس طرف سے اطمینان کرکے ایک خط سوامی جی کی خدمت میں بھیجا، اس میں وہ نہایت لجاجت کے ساتھ لکھتا ہے :-

"میں سوامی جی کی خاطر سے ہر وہ خدمت بجالانے کے لئے حاضر ہوں جو میرے امکان میں ہے، سرداروں کو مناسب ہدایت کردی گئی ہے، آئندہ کوئی مرہٹہ سردار جناب کے خلاف کسی فعل کی جرأت نہ کرسکے گا۔ مجھے آپ کی ذات سے زیادہ دنیا کی کوئی چیز محبوب نہیں۔"

سوامی جی کی خدمت میں شاہو اکثر تحفے تحائف بھی بھیجا کرتا تھا۔ سوامی جی بہت بڑے شہسوار تھے، اعلیٰ النسل کے گھوڑے تلاش کرکے منگواتے اور اپنی سواری میں رکھتے تھے۔ معتقدین علاوہ دیگر لوازمات کے گھوڑے بھی پیش کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہو نے اپنی پائیگاہ کے چار منتخب گھوڑے سوامی جی کے پاس بھیجے اور درخواست کی کہ ان میں سے پسند کرکے قبول فرمالیں۔

سیواجی کے خاندان میں شاہو آخری شخص تھا جسے مرہٹہ حکومت پر کچھ اثر و اقتدار حاصل تھا۔ شاہو جی چونکہ ناز پروردہ تھا اس لئے اہم معاملاتِ سلطنت کو سرانجام دینے سے گھبراتا تھا۔ اپنی عیش پرستی کی وجہ سے پیشواؤں کے خاندان کی بنیاد خود اسی نے ڈالی تھی، اور اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے مرہٹہ حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک وہی لوگ ہوگئے، اور یہ اُن کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ تاہم اپنے خاندان کا یہی آخری شخص تھا جسے باوجود پیشواؤں کے غلبہ کے کچھ قوت نصیب تھی۔

شاہو اور پیشوا کی طاقتیں آپس میں برابر ٹکراتی رہتی تھیں، اور اس کا نتیجہ ہمیشہ پیشوا کی فتح اور شاہو کی شکست کی صورت میں مترتب ہوتا تھا۔ اِن متضاد حالات کے درمیان قطعی غیر ممکن تھا کہ کوئی فرد واحد ان دونو شخصیتوں کا معتمد علیہ ہوسکے، مگر سوامی جی نے وہ عاقلانہ تدابیر اختیار کی تھیں کہ دونوں انھیں اپنا معتمد سمجھتے تھے، اور ضروری اُمور میں ان سے مشورہ طلب کرتے تھے۔

دوسرے پیشوا باجی راؤ کی تو یہ حالت تھی کہ بغیر سوامی جی کے مشورہ کے کوئی کام شروع ہی نہیں کرتا تھا۔ یہی حال "آپا صاحب" کا بھی تھا۔ پیشوا کے یہاں سے ہندوستان کے دوسرے درباروں میں جو مراسلت ہوتی تھی پہلے وہ سوامی جی کے سامنے پیش کی جاتی تھی، یہ بغور ہر ایک کا مطالعہ کرتے تھے اُن میں ترمیم و تنسیخ کرتے تھے۔ جنگ کے اسباب، صلح کی شرطیں، ریاست کے اُصول سب میں ان کی رائے شامل ہوتی تھی۔ گویا پیشوا کے دربار میں جس قدر اُمور معرضِ ظہور میں آتے تھے۔

وہ سب اِنھیں کی عقل کے سرچشمہ سے نکلے تھے۔

سوامی جی کی اعانت صرف صلاح و مشورہ ہی تک ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ کثیر مالی امداد بھی پہونچاتے رہتے تھے۔ ضرورت کے وقت پیشوا کو بیش قرار رقمیں قرض دیتے تھے۔ اکثر اوقات جب جنگ جاری ہوتی تھی اور روپیہ ختم ہو جاتا تھا اور کہیں سے آمد کا کوئی سہارا باقی نہ رہتا تھا تو ایسے نازک وقت میں پیشوا سوامی جی ہی کی عنایت کا طالب ہوتا تھا، اور یہ اُس کی منہ مانگی مراد پوری کر دیتے تھے۔

سوامی جی کے مزاج میں سختی بھی بہت زیادہ تھی، اُن سے مشورہ لینے کے بعد جب کوئی کام اُس کے خلاف ہوتا ہوا دیکھتے تھے تو اُسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بطور احتجاج کے برت رکھنا شروع کر دیتے تھے۔ اپنے مطالبات منوانے کے لئے جس طریق عمل کے گاندھی جی موجد خیال کئے جاتے ہیں، سوامی جی آج سے دو سو سال پہلے اُس پر کاربند ہوتے تھے۔ اس قسم کی صورت حال واقع ہونے پر شاہو خود سوامی جی کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور اُن کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اُس زمانہ میں کسی حکومت کی طاقت فوج کی کثرت اور اس کے نظام پر منحصر تھی۔ پیشوا کو دو کام انجام دینے پڑتے تھے، ایک اپنے حدودِ حکومت کو بڑھانا، دوسرے اپنے مقبوضات کو حریف طاقتوں سے محفوظ رکھنا۔ اِن دونوں کاموں کے لئے کثیر فوج اور فوج کے لئے کثیر رقم کی ضرورت پیش آتی تھی۔ پیشوا کا خزانہ اگرچہ مختلف ذرائع سے روپیہ حاصل کر کے بھرا جاتا تھا لیکن ان اخراجات کی وجہ سے ہمیشہ خالی ہی رہتا تھا۔ مجبور ہو کر ساہوکاروں سے روپیہ قرض لینا پڑتا تھا۔ عرصہ تک ادائگی نہ ہونے پر وہ بھی ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔ ان حالات کے گرداب میں پھنس کر جب مرہٹہ طاقت کی ناؤ ڈوبنے کے قریب ہوتی تو سوامی جی روپیہ کے زور سے اُسے پھر تِرا دیتے تھے۔

ایک مرتبہ باجی راؤ سوامی جی کا بہت قرضدار ہو گیا تھا، باوجود کوشش کے کہیں سے روپیہ نہیں آیا۔ ادھر انھوں نے سختی سے تقاضے شروع کئے۔ پیشوا نے تنگ آ کر انھیں ایک خط لکھا۔ اس میں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"قرض کا اس قدر بار ہو گیا ہے جس کے برداشت کرنے کی اب مجھ میں طاقت نہیں رہی اب یہی چاہتا ہے کہ خودکشی کر کے اس زندگی کی کشمکش سے نجات حاصل کر لوں۔"

ایک اور خط میں لکھتا ہے:۔

"میں قرض کے ایسے جہنم میں داخل ہو گیا ہوں جہاں قدرت نے ساہوکاروں کو عذاب دینے کے لئے مجھ پر مسلط کر دیا ہے۔ میں نے اپنے قرضخواہوں کے قدموں پر اس قدر جبیں سائی کی ہے کہ میری پیشانی گھس گئی ہے۔

یوں تو مرہٹہ حکومت کی ہر تحریک سوامی جی کے دماغ کی تخئیل ہوتی تھی، مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ مرہٹوں کو پرتگیزوں کے خلاف آمادہ کرنا ہے جو جنگ بسین کی صورت میں نمودار ہوا اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ پرتگیز بسین میں آہستہ آہستہ اپنی قوت بڑھا رہے تھے کہ آگے چل کر مرہٹہ طاقت کے لئے مستقل خطرہ ثابت ہوں۔ پیشوا باجی راو باوجود اپنی سیاسی تجربہ کاری کے اس کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا۔ مگر سوامی جی کی دُوررس نگاہ نے آنے والے خطرہ سے آگاہ کر کے باجی راؤ پر پرتگیزوں کے استیصال کے لئے زور ڈالنا شروع کیا۔ آخر باجی راؤ نے "آپا صاحب" کے ماتحت پرتگیزوں کے خلاف ایک فوج بھیجی۔ اس نے بسین کا محاصرہ کیا اور پرتگیزوں کو شکست ماننا پڑی، اس واقعہ سے مرہٹہ حکومت کو ایک قریبی خطرہ سے نجات حاصل ہو گئی۔

سوامی جی کو باجی راؤ سے خاص محبت تھی۔ سیاسی اُمور میں اُن کی سرگرمیاں اُس محبت کا عملی ثبوت تھیں۔ ۱۷۴۰ء میں باجی راؤ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے سوامی جی نے دنیاوی معاملات سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد "آپا صاحب" نے بھی دنیا کو خیرباد کہا۔ سوامی جی کی عمر بھی کافی زیادہ ہو چکی تھی، اِن صدموں نے ان کی روح کو اور بھی گھلا دیا، آخر ۱۷۴۵ء میں اس عالمِ فانی سے خود بھی رخصت ہو گئے۔

سوامی جی کے حالاتِ زندگی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی قوم کے دینی پیشوا تھے، بلکہ اُس کے سیاسی رہنما، زبردست مُدبّر اور میدانِ عمل کے شہسوار بھی تھے۔

آج جبکہ ہندوستانی قومیت انتہائی نازک دَور میں سے ہو کر گزر رہی ہے، اور سیاست کی راہ میں ہر قدم نہایت احتیاط کے ساتھ اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ ملک کے لئے ایسے لیڈر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جو صرف اُمورِ دُنیوی کی اصلاح میں مہارتِ کامل رکھتے ہوں مگر روحانی اور اخلاقی رہنمائی کرنے سے قاصر ہوں۔ نہ ایسے مقدس بزرگ کارآمد ہو سکتے ہیں جو دین کی تلقین میں دنیا سے قطع نظر کر لیں۔ بلکہ ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے

جو اِن دونوں کے درمیان صحیح توازن قائم کرکے ملک کی ایسی رہبری کریں کہ سیاسی ترقی کے ساتھ ساتھ صفائے نفس اور پاکیزگیِ اخلاق کے اوصاف بھی مترتب ہوتے رہیں تاکہ ہندوستانی قوم ہر اعتبار سے دوسری قوموں کے سامنے امتیازی درجہ حاصل کرسکے۔ اِسی کی اس وقت کمی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی اُس وقت سخت ضرورت ہے۔

واردات

(از حضرت مضطر نعمانی)

کیفیتِ تباہیِ ارماں نہ پوچھیے — کس نے بنا دیا مجھے انساں نہ پوچھیے
اُف حُسن ہے رہینِ حجابِ تعیّنات — دیر و حرم ہیں بے سر و ساماں نہ پوچھیے
اب لے اُڑا ہے شوقِ دیارِ حبیب کو — ہم سے نزاعِ گبر و مسلماں نہ پوچھیے
مُضمر ہیں میری ذات میں لاکھوں تجلّیاں — ذرّاتِ دل ہیں جوشِ بداماں نہ پوچھیے
جس غمزدہ کا بیڑا ہو غرقابِ بیخودی — اُس سے حکایتِ شبِ ہجراں نہ پوچھیے
حیرت سے بن گیا ہوں مَیں اِک پیکرِ سکوت — احباب نے کیا ہے جو احساں نہ پوچھیے
نیرنگیٔ حیات نے دیوانہ کر دیا — بس چھوڑ دیجیے مرادِ اماں نہ پوچھیے
دنیائے بے وفا میں مری سادگیِ دل — وہ کر رہی ہے جورِ فراواں نہ پوچھیے
وہ جنبشِ نگاہ ہے اب ضامنِ حیات — ہم سے ہمارا حالِ پریشاں نہ پوچھیے
دامن کرم کا تھام کے بیہوش ہوگئے — یہ دل ہے یا کہ جنتِ عصیاں نہ پوچھیے
بادِ خزانِ آہ سے ہمدم بہارِ دل — جس درجہ ہو تی رہتی ہے ویراں نہ پوچھیے

المختصر کہ مضطرِ بے خانماں سے آپ
جُز قصّہ ہائے جورِ عزیزاں نہ پوچھیے

نادار طالب علم

(از ابوالفضل رازؔ چاندپوری)

اِک طالبِ علم و ہنر جویائے رازِ زندگی
معصوم صورت، خوش نظر جلوہ طرازِ زندگی
جس کی جبیں سے ہے عیاں
فطرت کے اسرارِ نہاں

افسردہ و اندوہ گیں بیٹھا ہوا ہے مضمحل
گویا کوئی ایسا نہیں جو ہاتھ میں لے اُس کا دل
خاموش ہے، دلگیر ہے
حسرت کی اِک تصویر ہے

شمعِ جمالِ علم کا لاریب وہ پروانہ ہے
حُسنِ کمالِ علم کا دیوانہ ہے، دیوانہ ہے
مانع مگر ہے مُفلسی
تکمیل ذوقِ علم کی

رہ رہ کے یوں اُس کی نظر اُٹھتی ہے سوئے آسماں
جیسے کوئی بے بال و پر مہجورِ کُنجِ آشیاں
آمادۂ فریاد ہو
رنجور ہو، ناشاد ہو

اے باغبانِ کم نظر اَے خود غرض، اے بے وفا
شاید نہیں تجھکو خبر اے نوبہارِ خوش ادا
اے لالہ رخ، رعنا نوجواں

یہ غنچۂ نورس ابھی واقف نہیں اِس راز سے
باغِ جہاں کی زندگی مملو ہے سوز و ساز سے
گھبرا نہ جائے یہ کہیں!
کمھلا نہ جائے یہ کہیں!
اے مالکِ لعل و گہر یہ وقت ہے ایثار کا
اُٹھ اور کارِ خیر کر جو فرض ہے زردار کا
ورنہ یہ دولت ہیچ ہے
اس کی حقیقت ہیچ ہے
کوئی انیس و آشنا سُنتا نہیں آہ و فغاں
اب کیا کروں، تو ہی بتا اے مادرِ ہندوستاں
بچّہ ترا ناشاد ہے!
فریاد ہے، فریاد ہے!!

رباعیاتِ سرمد

(ترجمہ از سید مقبول حسین بی۔اے۔ا۔ پوری)

درخوابی و از خویش نداری خبرے غفلت ندہد بجز ندامت ثمرے
یاراں ہمہ رفتند و تو ہم در راہی بر ہستیِ موہوم نداری نظرے

(ترجمہ)

اپنے جی کا ہوش نہیں پیارے تم ایسا سوئے چُگ گئیں چڑیاں کھیت تو اب پچھتائے سے ہو کیلئے
سب ساتھی جا لگے ٹھکانے، تم رہے مورکھ ٹھیمی مایا کا یا کارن تم کیوں آتم شوبھا کھوئے

(سرمد)

یارب زمنِ زار نہ بندہ و کارے جز معصیت و غفلتِ بیحد کارے
از کارِ گذشتہ کار آگاہ شدم کارے نشد از منِ کہ بباید کارے

(ترجمہ)

منشی پریم چند کی تشبیہات

از مسٹر نند لال مظلوم کیتھلوی مصنف "صورِ متحرکہ"

جس طرح ایک کامیاب افسانے کے لئے اعلیٰ پلاٹ کی ضرورت ہے، اسی طرح اس پلاٹ کو دلکش بنانے کے لئے عمدہ تشبیہات لازمی ہیں۔ افسانہ ہماری زندگی کا کوئی روشن یا تاریک پہلو نمایاں کرتا ہے، وہ کوئی سبق آموز یا تفریحی واقعہ ہوتا ہے اور نیک یا بد افعال کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جسے افسانہ نویس کا قلم الفاظ کا جامہ پہنا کر ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ایک کامیاب انشا پرداز کے دل و دماغ پر جو اثر ہوتا ہے اُس کے بیان کے لئے وہ دل نشیں تشبیہات کا محتاج رہتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی وہی چیز ہمارے دماغ پر زیادہ اثر کرتی ہے جسے ہم روزانہ کے واقعات میں محسوس کر سکیں، اس لئے قابل انشا پرداز ہمیشہ ایسی تشبیہات استعمال کرتے ہیں جو خواہ بظاہر معمولی ہوں لیکن غائر نظر سے دیکھنے والوں کو ان میں بحرِ معنی پوشیدہ دکھائی دیتا ہے۔

منشی پریم چند جی مرحوم بھی تشبیہات اور استعارات کے استعمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے منشی صاحب میں یہ خاص وصف تھا کہ وہ تشبیہات کو نہایت مختصر مگر آسان اور دل نشیں الفاظ میں پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی عبارت ذوقِ سلیم رکھنے والوں کے دل و دماغ پر فوری اثر کر کے گھنٹوں محوِ حیرت بنائے رکھتی ہے۔ معمولی الفاظ میں وہ اپنا دلی مدعا اس طرح ادا کر جاتے تھے کہ ایک معمولی انشا پرداز اُس بات کے لئے کئی صفحات سیاہ کرنے پر بھی ایسی خوبی سے ادا نہ کر سکے گا اُن کی تشبیہات حقیقت کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے اپنے ناول "بیوہ" میں بیواؤں کی زندگی کا رقت انگیز مگر بالکل صحیح فوٹو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"بیوہ کی عصمت پر الزام لگتے کتنی دیر لگتی ہے؟ ...... یہ وہ سفید چادر ہے جسے ہر شخص داغدار بنا سکتا ہے۔"

چند ہی الفاظ میں منشی صاحب نے ایک زبردست حقیقت حال کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے، کون نہیں جانتا کہ بیوہ پر کس آسانی سے الزام لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ نے بیوہ

کی عصمت کو سفید چادر سے تشبیہ دے کر ایک عجیب و غریب اثر پیدا کر دیا ہے۔ جس طرح سفید چادر پر ایک ہلکا سا داغ اُسے بدنما بنا دیتا ہے۔ اُسی طرح بیوہ کے چال چلن پر ایک بے بنیاد شک بھی اُسے لوگوں کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔

پریم چند صاحب معمولی معمولی باتوں میں جو لطف پیدا کر دیتے ہیں اُسے دیکھکر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جنھوں نے آندھی کے وقت آسمان پر تنکوں کو اُڑتے ہوئے دیکھکر کچھ سوچا ہو۔ لیکن منشی صاحب "پریم پچیسی حصہ اول" کے ایک افسانہ میں ایک معمولی شخص کے اعلیٰ پوزیشن حاصل کرنے پر لکھتے ہیں:-

"ایک چھوٹا سا تنکا بھی آندھی کے وقت آسمان پر جا پہونچتا ہے۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

"کانچ کا ٹکڑا جب ٹیڑھا پڑتا ہے تو تلوار سے زیادہ کاٹ کر جاتا ہے۔"

حقیقت بھی ہے کہ کانچ کا ٹکڑا سیدھا پڑنے پر کاٹ نہیں کرتا مگر جب ٹیڑھا پڑتا ہے تو لپنے لب رنگین کئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ تشبیہ ایک ایسے مقام پر دی گئی ہے جہاں یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ انسان اپنے دوست یا رشتہ دار کو کھلے دل سے ہنسی خوشی ہزار باتیں کہہ جائے مگر اس کا کوئی گلہ نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی معمولی بات بھی طنزاً کہہ دی جائے تو سننے والے کا خون غصہ سے کھولنے لگتا ہے۔

میرے خیال میں "رانی سارندھا" منشی صاحب کے بہترین افسانوں میں ہے بلکہ میں اسے مرحوم کا شاہکار خیال کرتا ہوں۔ اس افسانہ میں کئی حقائق زندگی کو اس خوبی سے صرف چند لفظوں میں ادا کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں خود بخود مصنف سے ایک دلی عقیدت پیدا ہو جاتی ہے آپ لکھتے ہیں:-

"دُنیا ایک میدان کارزار ہے، اس میدان میں اسی سپاہی کو فتح نصیب ہوتی ہے جو موقعہ اور محل سے فائدہ اُٹھانا جانتا ہے۔ وہ موقع دیکھکر جتنا آگے بڑھتا ہے خطرے کے وقت اتنا ہی پیچھے ہٹ جاتا ہے، ایسے ایک ہی حکومتوں کی بنیادیں ڈالتے ہیں اور تاریخ اُن کے نام پر صدیوں تک تعریف کے پھول نچھاور کرتی رہتی ہے۔"

اِن چند الفاظ میں آپ نے دنیوی کامیابی کا ایک سب سے بڑا راز بے نقاب کر دیا ہے یعنی ہر دنیوی فتح و شکست کے لئے دانشمندی کی ضرورت ہے۔ محض طاقت کو کبھی فتح نصیب نہیں ہوتی جس طرح میدان جنگ میں اندھا دھند آگے بڑھنے والا سپاہی شکست کھا بیٹھتا ہے اُسی طرح دنیا کے نشیب و فراز

کی پروانہ کرکے سرپٹ دوڑنے والا شخص بھی اکثر زمین پر آگرتا ہے۔ اسی کہانی میں آپ نے ایک قریب المرگ بہادر کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"جس طرح طائر گولی کھاکر پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا زمین پر آرہتا ہے، اسی طرح چھپت رائے پلنگ سے اُچھلے اور پھر بے جان ہوکر گر پڑے"

طائر کے پر پھڑپھڑانے اور ایک بہادر شخص کی آخری مگر ناکام کوشش میں کس قدر زبردست مشابہت ہے۔ یہ صرف زود فہم اصحاب ہی سمجھ سکتے ہیں، پرندہ گولی کھاتا ہے گو اُسے علم ہے کہ اب میرا زندہ رہنا امر محال ہے لیکن اس کے باوجود اپنے پر پھڑپھڑاکر بے رحم شکاری کے ہاتھوں سے نکل جانا چاہتا ہے۔ اسی طرح ایک بہادر شخص اپنے آپ کو موت کے بے رحم مگر مضبوط ہاتھوں میں پاکر بھی دشمن سے بدلہ لینے کے لئے اپنی آخری کوشش کئے بغیر نہیں رہتا۔

پریم چند صاحب میں ایک بہت بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ صفحات کا مطلب چند الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ آپ اپنے افسانہ "آسرا" میں افسانے کے کردار کو انتہائی مصیبت میں دکھانا چاہتے ہیں، مگر اس کے لئے صرف یہی لکھ دیتے ہیں کہ

"متھرا کی جان اس وقت تلوار کی دھار پر تھی"

آپ عام افسانہ نویسوں کی طرح اس کے مصائب کا ذکر کرکے اپنے ناظرین کے دماغ پر بار نہیں ڈالتے بلکہ اپنے مطلب کو صرف چند لفظوں میں واضح کر دیتے ہیں۔ ایک سمجھدار انسان سمجھ جاتا ہے کہ جس شخص کی جان ہمیشہ تلوار کی دھار پر ہو اُسے ہر وقت کن کن مصائب کا سامنا رہتا ہوگا۔

چند بہادر آرام پرستوں کی طبیعت میں بہادری کا خیال دکھانے میں آپ ان الفاظ سے کام لیتے ہیں

"جس طرح دبی ہوئی آگ ہوا لگتے ہی سُلگ جاتی ہے اُسی طرح تکلیف کے دھیان سے اُن میں بہادری کا سویا ہوا جذبہ بیدار ہوگیا"

اس تشبیہ میں بہادری اور آگ، آرام پرستی اور خاک، ہوا اور تکلیف کا رشتہ قابل غور ہے۔ بہادری اور آگ ایک دوسرے سے اس لئے مشابہ ہیں کہ دونوں میں تیزی ہوتی ہے، دونوں دشمن کو خاک میں ملا دیتے ہیں جواب نہیں رکھتیں۔ آرام پرستی اور خاک دونوں چیزیں ایسی ہیں جن میں بہادری اور آگ ایسی متضاد چیزوں پر پردہ ڈالنے کی قوت موجود ہے، اور دونوں چیزیں اتنی قوت کی حامل ہونے کے باوجود اس قدر لطیف ہیں کہ تکلیف اور ہوا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہیں۔

منشی صاحب کو منظر نگاری کا بھی بڑا زبردست ملکہ تھا، اس کے ثبوت میں یہاں پر صرف ایک

تشبیہ پیش کی جاتی ہے جو یہ ہے:۔

"درختوں کی کانپتی ہوئی پتیوں میں سے سرسراہٹ کی آواز نکل رہی تھی گویا کوئی فرقت زدہ روح پتیوں پر بیٹھی سسکیاں بھر رہی ہو"

اِس تشبیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ پتیوں میں سے ہوا کی سرسراہٹ اور فرقت زدہ روح کی سسکیوں کی مطابقت نے ہماری آنکھوں کے سامنے دونوں چیزیں اس کمال سے پیش کردی ہیں کہ سرسراہٹ اور سسکیوں میں چولی دامن کا ساتھ ہوگیا ہے۔ ایک ندی میں پانی کی کمی بیان کرنے کے لئے لکھتے ہیں:۔

"ندی دُور اُونچے کناروں میں اس طرح منہ چھپائے ہوئے تھی جس طرح کمزوردلوں میں جوش اور جرأت کا برائے نام جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے۔"

اُونچے اُونچے کناروں کو کمزوردل اور ندی کے پانی کی کمی کو جوش اور جرأت کا برائے نام جذبہ بتاکر خوبی پیدا کرنا صرف منشی صاحب ہی کا کام تھا۔

چونکہ منشی پریم چند کو اپنی زندگی میں کئی بار انتہائی مایوسی سے دوچار ہونا پڑا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں مایوسی میں گرفتار لوگوں کے منہ سے جو الفاظ نکلتے ہیں اُن میں حد سے زیادہ حسرت پائی جاتی ہے۔ دنیا کی بے قدری سے تنگ آئے ہوئے شاعر کے اِن لفظوں میں کتنا درد ہے:۔

"میں چراغ ہوں اور جلنے کے لئے بنا ہوں"

بیکس، غریب انسان پر جب ناجائز رعب ڈالا جاتا ہے اُس وقت اس کی حالت اور منشی صاحب کے الفاظ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا ہے:۔

"بیچارہ غریب آنکھوں میں آنسو بھرے چپ چاپ مورت کی طرح گالیاں سُن رہا تھا، جیسے کسی نے اُسے قتل کردیا ہو"

یعنی قتل ہوجانے کے بعد انسان جس طرح پتھر کی مورت کی طرح بے حس وحرکت ہوجاتا ہے، بیچارہ غریب اسی طرح خاموش تھا

عورت کی آزادی کس قدر خطرناک ہوتی ہے، اُسے جدید تہذیب کے دیوانے نہیں سمجھ سکتے منشی پریم چند اس کی بابت لکھتے ہیں

"وہ آزاد تھی، دریائے سندھ کی طرح۔ جس کی روانی کے سامنے عالی شان شہر آنِ واحد میں غرق ہوجاتے ہیں۔"

یہ تشبیہ کس قدر سبق آموز اور آئے دن رونما ہونے والے واقعات کا صحیح نقشہ ہے۔

عورت کے اوسان کس قدر جلد خطا ہو جاتے ہیں ان کا نقشہ منشی صاحب نے اپنے افسانہ "جوالی دیوانی" میں کھینچا ہے، جس کا ایک فقرہ یہ ہے "شکرے کے چنگل میں پھنسی ہوئی فاختہ کی طرح کامنی کے ہوش اڑ گئے۔" کیسا پُر معنی فقرہ ہے جس نے چند ہی لفظوں میں پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا۔

انسان کس قدر خود غرض واقع ہوا ہے اس کا ذکر بھی منشی صاحب نے اپنے ایک افسانہ میں اس مقام پر کیا ہے جہاں ایک عورت کے بوڑھی ہو جانے پر اس کے خاوند کی بے التفاتی قلمبند کی ہے فرماتے ہیں:-

"لالچی کا تاجر دل ہر ایک چیز کو تجارت کے لئے ترازو پر تولتا تھا۔ بوڑھی گائے جب نہ دودھ دے سکتی ہے اور نہ بچھڑے تو اس کے لئے گؤ شالہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔"

یہ تشبیہ نہیں ہے بلکہ تازیانہ ہے جو منشی پریم چند نے مردوں کی خود غرضی پر لگایا ہے۔ عیب کو اگر عیب کہا جائے تو ہم لوگ ناراض ہو جاتے ہیں، کونین کی گولی جب شکر میں لپیٹ کر دی جاتی ہے تو آسانی سے حلق کے نیچے اتر جاتی ہے۔ منشی صاحب بوڑھی عورت کی بے قدری کو دوسرے الفاظ میں پیش کر سکتے تھے مگر ایک بوڑھی گائے کے مثال سے اُنھوں نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں، واقعی بعض لوگ کس قدر خود غرض ہوتے ہیں کہ مطلب نکل جانے کے بعد دوسرے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

منشی پریم چند اپنے افسانوں میں جب مذاق پر اُتر آتے ہیں تو اُن کی تشبیہات اس قدر پُر مذاق ہوتی ہیں کہ انسان ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جائے۔ ایک مزاحیہ افسانہ "ڈھپوڑ سنکھ" نامی میں پریم چند صاحب نے دکھایا ہے کہ ایک شخص اپنے دوست سے واقعہ بیان کر رہا ہے اُس کی بیوی اُسے کہیں کہیں ٹوک دیتی ہے، خاوند بیوی کو کئی بار منع کرتا ہے مگر بے سود۔ آخر ایک موقع پر تنگ آ کر کہتا ہے:- "بیچ بیچ میں ٹوکو مت، عدالت کی توہین ہوتی ہے۔" یعنی بیوی کو اس قدر لطیف جھاڑ دی ہے کہ بیوی بھی خاموش ہو جائے اور دوست اسے مذاق ہی سمجھے، اور افسانہ پڑھنے والے بھی ہنس ہنس کر دوہرے ہو جائیں۔

غرض منشی صاحب میں تشبیہات پیش کرنے کا خداداد ملکہ تھا، اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو یقیناً موجودہ سے بھی زیادہ بہتر اور موثر تشبیہات پیش کرتے۔ کیونکہ بقول ایڈیٹر صاحب "زمانہ" عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے خیالات میں بھی پختگی آ رہی تھی۔ لیکن جس طرح گذری ہوئی لہر اور بکھری ہوئی خوشبو ہاتھ نہیں آسکتی، اُسی طرح پریم چند جی کا واپس آنا بھی ناممکن ہے۔ البتہ ہم اُن کے شاہکاروں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

تنہائی

(از حضرت دردؔ کاکوروی)

تو تخیّل کی ہے دوشیزہ، تصوّر کی پری
مائلِ وحشت نہ کیوں ہو قلبِ مضطر ہر گھڑی

یہ دلِ وحشی ہے تیری زلف میں اُلجھا ہوا
لاکھ ہو بے فکر پر ہے فکر میں ڈوبا ہوا

کیوں نہ تیری معتقد ہو ہستیِ فانی مری
ہے ترے عنواں سے ظاہر تیرہ سامانی مری

تجھ میں ہے کچھ جذب ایسا اور کچھ ایسی کشش
بنکے ہے تصویر پھرتی درد و حسرت کی خلش

شامِ تنہائی۔ جوانی کے ترنم نغمہ کوش
صبحِ وحشت چشمِ تر ہے دم بدم گوہر فروش

چاک دامانی ہوئی تو دامنِ صحرا ملا
بخیۂ صد چاک دل سے۔ دل کو یوں بہلا ر

حامیِ جوشِ جنوں ہے تیری ہستی کی نمود
وحشت ہے آزارِ خاطر کے لئے تیرا وجو

تیری زلف و رخ سے ظاہر ہے پریشانی مری
تیری خلوت، تیری جلوت، خانہ ویرانی مر

یوں بیاباں میں نہ پھرتا ایک وحشی سر پھرا
تیرے دل میں کاش گنجائش اگر ہوتی ذ

تو مری ہمدم ہے لیکن ایک ناصح کی طرح
ہو گوارا کیوں مجھے اعلانِ غم تیری طرح

مجھ کو یوں سمجھا رہی ہے سرد آہیں یوں نہ بھر
ہو سکے تجھ سے جہانتک عشق کو رسوا نہ ک

دھوکے دیتی ہے مجھے تو، رات ہے یہ دن نہیں
تجھ سے تنہائی! علاجِ دردِ دل ممکن نہیں

تجھ میں برقی رَو ہے پنہاں شدتِ احساس کی
تو وبالِ زندگی ہے یا مآلِ زندگی

عہد میں تیرے جو ہے صحرا نوردی کا وفور
ہے تغیر عشق کی فطرت، نہیں تیرا قص

ہاں بغاوت تجھ سے ہے آئینِ الفت کے خلاف
کہہ گیا وحشت میں جو کچھ کر خدارا تو معاف

باعثِ مشقِ تصور بادۂ مستی تری
سوز و سازِ عشق کی تکمیل ہے ہستی تر

جلوہ گر ہر وقت دردِ دل سے کاشانہ ترا
میری حیرانی ہے یا ہے آئینہ خانہ ترا۔

زرتشت

از مسٹر محمد اسحاق ایم۔ اے

زرتشت کی پیدائش کی نسبت بہت سے قصے مشہور ہیں، جو اسی طرح عجیب و غریب ہیں جسطرح کہ مشرقی توہمات کی بنا پر دوسری بزرگ ہستیوں مثلاً بدھ، عیسیٰؑ، کرشن اور پیغمبر اسلامؐ کے بہت سے بے سروپا قصے بیان کئے جاتے ہیں۔

ایک قصہ یہ ہے کہ زرتشت کی پیدائش سے بہت پہلے ایک مقدس روشنی اہورامزدا کی طرف سے زمین پر اُتری، اور اُس گھر کی طرف چلی جہاں زرتشت کی ماں پیدا ہونے والی تھی، چنانچہ یہ مقدس روشنی زرتشت کی ماں کے ساتھ ساتھ رہی، یہانتک کہ پندرھویں سال زرتشت کا جنم ہوا۔ یہ اس کا پہلا فرزند پارسیوں کا پیغمبر ہوا جسے اہورامزدا نے بھیجا تھا۔

لیکن اس کی پیدائش سے پہلے وہ لڑکی اسقدر خوبصورت اور حسین ہوگئی کہ اُس کے باپ نے شیطان کے بہکانے سے خیال کرلیا کہ اس لڑکی پر جادو کا اثر ہوگیا ہے۔ اِس لئے اُس نے اُسے دوسرے گاؤں میں بھیجدیا۔ جہاں پوراشاسپ سے اُس کی ملاقات ہوئی اور اُس نے شادی کرلی۔

دوسری کہانی اِس طرح مشہور ہے کہ دو فرشتے وہومان اور اشا وہشت آسمان سے زرتشت کی روح کو ہوما پودے کی ٹہنی میں جو قدِ آدم تھا لیکر نازل ہوئے، مدت تک یہ ٹہنی ایک چڑیا کے گھونسلہ میں محفوظ رہی، چڑیا کے بچوں کو سانپ کھاجایا کرتا تھا مگر اس ٹہنی کے اثر سے بچے محفوظ رہنے لگے، اور موذی سانپ وغیرہ ہلاک ہوگئے اس طرح وہ ٹہنی چڑیوں کے لئے ایک عمدہ تعویذ ثابت ہوئی۔ بالآخر وہ روح منتقل ہوکر زرتشت کے باپ پوروشاسپ کے سپرد ہوئی۔

تیسری کہانی یہ ہے کہ زرتشت کی ماں دوگدھو کو ایک فرشتے نے شراب پیش کی، جس کے پی لینے کے بعد زرتشت پیدا ہوا اور اس کی پیدائش ہی کے وقت اُس کی نبوت کی پیشگوئی ہوئی تھی، وہ شراب دراصل ہوما نامی بوٹی کا عرق تھا۔ جسے آتش پرستوں کے موبد خاص خاص عبادتوں کے موقع پر اب بھی استعمال کرتے ہیں۔

پیدائش کے وقت بچے عموماً رویا کرتے ہیں، لیکن زرتشت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ خلاف معمول ہنس رہا تھا کہتے ہیں کہ جنات نے پہلے تو کوشش کی کہ وہ پیدا ہی نہ ہو، لیکن جب کسی طرح اُن کا بس نہ چلا، تو

اُس کی جان کے درپے ہوئے۔ توران کے موبد دوراسرویو نے جو اپنے وقت کا شداد و فرعون تھا۔ خاص طور پر زرتشت کے مارنے کی ہزاروں تدبیریں کیں، چنانچہ ایک مرتبہ اُس نے بچپن ہی میں زرتشت کا سر کچل دینے کا ارادہ کیا، اُس کے بعد اس نے ایک تیز چھرے سے گلا کاٹنے کا ارادہ کیا، لیکن اِس ناپاک کوشش کے وقت اُس کا ہاتھ شل ہوگیا۔

اِس ناپاک موبد کا اتنا اثر تھا کہ اُس نے زرتشت کے باپ پوروشاشپ کو اپنے بیٹے کی طرف سے بدظن کر دیا۔ جس سے وہ اپنے بیٹے کی طرف سے بالکل بے پروا ہوگیا۔ ایک مرتبہ خود اس کے ایمائے سے زرتشت کو دہکتی ہوئی آگ میں جلا دینے کی سازش ہوئی، مگر ناکامیابی ہوئی۔ دوسری مرتبہ زرتشت کو بیلوں سے روند ڈالنے کی کوشش کی گئی تو بڑے بیل نے بچے کو اپنے سایہ میں لے لیا تاکہ کوئی گزند نہ پہونچے۔

اسی طرح گھوڑوں سے روند ڈالنے کی تدبیر کی گئی، لیکن وہ بھی ناکام ثابت ہوئی، اس کے بعد لوگوں نے زرتشت کو ایک بھیڑیے کے غار میں جس کے بچے مار ڈالے گئے تھے ڈال دیا۔ مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ بھیڑئے نے زرتشت کو ایذا پہونچانے کے بجائے اُس کو دودھ پلانے کا انتظام کیا۔

اِس طرح تمام دشمنوں سے بچکر زرتشت پرورش پاتا رہا۔ یہانتک کہ ساؔت برس کی عمر میں باپ نے تعلیم و تربیت کیلئے ایک عالم کے حوالہ کر دیا۔

جب زرتشت پندرؔہ سال کا ہوا تو دوراسرویو نے مباحثہ کیا جسمیں زرتشت نے ایسی عالمانہ اور مُدلل تقریر کی کہ سب لوگ قائل ہوگئے۔

جب زرتشت کی عمر تیسؔ سال کی ہوئی، تو بہت سی کرامتیں ظہور میں آئیں۔ مثلاً وہ سب کے دیکھتے دیکھتے دریائے دائتی کے پار اُتر گئے، اور ایک دوسری ندی کو بھی عبور کیا، علی الصباح وہ ایک تیسرے دریا کے کنارے کھڑے تھے کہ یکایک دکھن کیطرف سے ایک نورانی عصا جو نبوت کی نشانی تھی ہاتھ میں لئے ہوتے سروش کی مبارک صورت نظر پڑی۔

اس کے بعد زرتشت نے ایک تیسرے دریا کے عبور کرنے کا ارادہ کیا۔ جب وہ نزدیک پہونچے تو انھیں ایک پیکرِ دیو مثال سے جو انسان سے نوگنا بڑا تھا سامنا ہوا، اِس قوی ہیکل سروش نے زرتشت سے لباس اُتار ڈالنے کو کہا۔ جس کے بعد یہ قاصد زرتشت کی روح کو آہورآمزدا کے حضور میں لے گیا۔ اور اُسے اپنے پیغام کا پہلا درس تلقین کیا گیا۔

پھر کامل دسؔ برس کی ریاضت اور قربِ آلہی کے بعد زرتشت پختہ کار ہو کر دنیا میں نازل ہوئے اور اپنے پیغام کا اعلان کیا، تمام شیطانی طاقتیں متحد ہو کر مقابلے کو تیار ہوئیں، لیکن تائید آلہی اُن کے ساتھ

تھی، اِس لئے مخالفین کو شکستِ فاش ہوئی۔

ایک مرتبہ زرتشت کا گذر بادشاہ وشتاسپ کے دربار میں ہوا، جہاں کے وحشتناک مظالم سے وہ بہت متاثر ہوئے، اور اسی وقت سے اپنی اصلاحی تدبیروں کا آغاز کیا۔ وشتاسپ کو اپنا پیغام سُناکر اُسے اپنے دین میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ جب زرتشت نے بادشاہ کے دلی خیالات بیان کردئے تو وہ بہت حیران ہوا، مگر درباریوں نے اُسکی مخالفت کی۔ اور سازش کرکے زرتشت کی خوابگاہ میں چند آلات فنِ جادوگری اور سیمیا کے رکھوادئے، اور اس جھوٹی تہمت پر انھیں قید میں ڈلوادیا۔ اُس پر ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا کہ بادشاہ کا ایک پیارا گھوڑا چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ زرتشت نے قیدخانہ ہی سے اطلاع دی کہ اگر بادشاہ چار شرطیں منظور فرمائے تو گھوڑے کی چاروں ٹانگیں بدستور اپنی اصلی حالت پر آسکتی ہیں۔ بادشاہ نے اُن شرائط کو منظور کرلیا۔ جنمیں پہلی شرط یہ تھی کہ گھوڑے کی پہلی ٹانگ کے اچھا ہونے پر بادشاہ زرتشت کا مذہب قبول کرلے۔ اور دوسری ٹانگ درست ہونیکے پہلے اُس کا بیٹا اسفندیار مذہب زرتشت کیلئے جہاد کرے۔

تیسری شرط یہ ٹھہری کہ ملکہ بھی زرتشت کے مذہب کو قبول کرے۔ چوتھی اور آخری شرط یہ تھی کہ اُن مجرموں کے نام بتائے جائیں جنھوں نے زرتشت کے خلاف سازش کرکے خوابگاہ میں جادو اور سیمیا کے آلات رکھوائے تھے، چنانچہ اُن کے نام بتائے گئے اور اُنھیں سزائے موت دی گئی۔ اُس کے بعد گھوڑے کی چوتھی ٹانگ بھی درست ہوگئی اور وہ بدستور کودنے پھاندنے لگا۔

آج بھی ڈیڑھ لاکھ زرتشتی اِس پیغمبر کے نام لیوا دُنیا میں آباد ہیں۔ اِس قوم کے بزرگ زرتشت کی نسبت اپنے بچوں کو مذکورہ بالا کہانیاں سُنایا کرتے ہیں اور اِس مذہب کی تعلیم دیتے ہیں، زرتشت کی سالگرہ کے دن عورتیں اپنے زرق برق لباس میں اور مرد سفید کپڑوں میں ملبوس ہوکر، سر پر سیاہ رنگ کی ٹوپیاں پہنکر آگیاری میں اپنے آقا کی روشن کردہ آگ کی پرستش کرنے جایا کرتے ہیں۔

الہامی مناظر

(از حضرت نکہت شاہجہانپوری)

اونچی اونچی چوٹیوں پر مہرِ تاباں دیکھنا — اور فضائے کوہ کو عظمت بداماں دیکھنا
دامنِ صحرا میں وہ ٹھنڈی ہوا کی شورشیں — اور ان کے نغمۂ رنگیں گل افشاں دیکھنا
جھومنا شاخوں کا وہ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے — اور طیورِ نغمہ زن کو زمزمہ خواں دیکھنا
وہ عروسِ صبح کے رخ پر شعاعِ زرنگار — اور طلوعِ مہر سے عالم درخشاں دیکھنا
آبشاروں کا وہ چلنا اور دنیائے سکوں — اور چشموں یا کہ فوّاروں کو رقصاں دیکھنا
گھاٹیوں پر ابرِ کہساری کا اٹھ کر جھومنا — اور چمک میں برق کی دشت و بیاباں دیکھنا
ہاں اسی سنسان دنیا میں وہ بادل کی گرج — وہ پرندوں کا جھجکنا اور پر افشاں دیکھنا
موتیوں کے ہار کی صورت میں بارش کی بہار — اور گل و گلزار و برگ و بار خنداں دیکھنا
عالمِ حیرت میں وہ پگڈنڈیوں کے پیچ و خم — اور پہاڑی سلسلے داماں بداماں دیکھنا
شام کی آمد پہ یہ سب عالمِ پست و بلند — رفتہ رفتہ پردۂ ظلمت میں پنہاں دیکھنا
ہاں شفق کی سرخیوں میں سطحِ دریا کا سماں — اور موجوں کو بہم دست و گریباں دیکھنا
چاندنی راتوں میں لہروں کا چمکنا بار بار — اور نقابِ ابر میں مہتاب پنہاں دیکھنا
ہاں اندھیری میں ستاروں کی وہ ہلکی روشنی — اور فضائے چرخ کو رشکِ گلستاں دیکھنا
ظلمتِ شب کی فضا میں جگنوؤں کی وہ چمک — اور جبینِ حسنِ فطرت کو پُر افشاں دیکھنا
ہاں کسی محفل میں ساقی کی نگاہیں دلربا — یا کسی مہوش کے گیسوئے پریشاں دیکھنا
ہاں گنہگاروں کی دنیا میں ندامت کا خمار — اور دستِ توبہ کو رہ رہ کے لرزاں دیکھنا

دیکھنا ہاں دیکھنا نکہت کو بھی اہلِ نظر
اس کو ہر انداز میں اندازِ جاناں دیکھنا

سوا روپیہ

از بابو پرتاپ بہادر پردھان بی۔ اے، ایل ایل بی



جناب! یہ بیس آنے یا اسّی پیسوں والا سوا روپیہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ سوا روپیہ ہے جو دینے والوں کی جیب سے نہ معلوم کتنی مرتبہ اسّی پیسے نکلوا تا ہے مگر لینے والوں کو صرف ایک حقیر سی رقم معلوم ہوتی ہے ہندوؤں میں جب کسی پنڈت دیوتا سے پوجا پاٹ یا کوئی دوسری مذہبی رسم ادا کرائی جاتی ہے، وہ بار بار "دھرٹکا" کی رٹ لگا کر نہ معلوم کتنی رقم بٹور لے جاتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی شخص کا کچہری میں کام پڑتا ہے، تو اس کی بھی سوا سوا روپیہ کی معمولی رقموں کی صورت میں نہ معلوم کتنی حجامت بنا دی جاتی ہے۔ مثلاً دور کیوں جائیے، گذشتہ "بقرعید" کے ہی واقعات لے لیجئے۔ مقامی حکام نے عید سے ایک دن پہلے تحفظ امن و امان کے خیال سے بارہ بجے سے چار بجے تک سیکڑوں مشتبہ چلن آدمی گرفتار کرئے جنمیں سے بہت سے گنگا کنارہ کے عظیم الشان سرکاری مہمان خانہ میں پہونچا دئے گئے۔ ان لوگوں پر کیا گذری؟ اس کی کیفیت تو کچھ وہی لوگ بتا سکتے ہیں، البتہ ان لوگوں کے اعزا و اقربا کی جو حالت ہوئی، وہ ناگفتہ بہ تھی۔

ایک صاحب جن کے چچا گرفتار ہو گئے تھے، اُن کو ضمانت پر رہا کرانے کی غرض سے کچہری پہونچے، ایک وکیل صاحب سے ملے۔ اور عرض کیا۔

"حضور چچا میاں کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ برس دن کا تہوار ہے۔ اگر ضمانت پر رہا کرا دیجئے تو بڑی مہربانی ہوگی"۔

وکیل صاحب "اجی یہ کون بڑی بات ہے۔ آخر جرم تو قابل ضمانت ہے ہی۔ منشی جی سے درخواست لکھوا لیجئے، وکالت نامہ بھروائیے، میں ابھی ابھی اجلاس سے آتا ہوں۔ (محرر سے) منشی جی! یہ ہمارے خاص آدمی ہیں۔ ان کا کام ذرا جلدی کر دیجئے۔

موکل کو محرر کے حوالے کر کے وکیل صاحب اِدھر اُدھر گپ شپ اُڑانے چل دئے۔

منشی جی "ہاں صاحب تو دام نکالئے، پھر میں اپنا کام کروں"

موکل۔ کیا خرچ ہوگا؟

ا؎ کانپور جیل گنگا کنارے سرسیا گھاٹ پر ہے۔

منشی جی۔ "ایک درخواست بارہ آنہ، وکالت نامہ بارہ آنہ، کاغذ ایک آنہ، متفرق سوا روپیہ، تحریر اور محنتانہ اس کے علاوہ"!

موکل۔ اور یہ متفرق کیا چیز ہے ؟

منشی جی۔ "آپ خود دیکھتے جاتیے، اور خود اپنے ہاتھ سے خرچ کیجئے۔ مجھے تو صرف کاغذ اور ٹکٹ منگوا دیجئے"۔

موکل بیچارہ نے ایک روپیہ نو آنے داخل کردئے۔ منشی جی نے ایک سرسری سی درخواست لکھی، اور وکالت نامہ کی خانہ پُری کرکے، وکیل صاحب کو تلاش کیا۔ وکیل صاحب درخواست لے کر عدالت میں تشریف لے گئے۔ اسوقت اتفاق سے حاکم اجلاس کسی ضرورت سے باہر تشریف لیگئے تھے۔ پیشکار صاحب موجود تھے۔

"ایک ضمانت کی درخواست ہے، پیشکار صاحب"! وکیل صاحب نے کہا۔

پیشکار۔ "ارے اس وقت۔ سوال خوانی بارہ بجے ہوتی ہے۔ (گھڑی دیکھ کر) اور اب پونے تین بجے ہیں۔ وکیل صاحب لاچاری ہے"۔

"اجی گرفتاری بھی تو بارہ بجے کے بعد ہوئی تھی"۔ وکیل صاحب نے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے اذرا سنئے گا۔ اور ہمارا...... "پیشکار نے اشارتاً کہا۔

"ابھی لیجئے جناب! (موکل سے) خان صاحب ذرا چپراسی کو...." وکیل نے کہا۔

الغرض چپراسی کو ایک روپیہ چار آنہ "حق" دیدیا گیا۔ اور چپراسی نے اجلاس میں آکر پیشکار سے اشارتاً کہا۔ "پیشکار صاحب! بابو صاحب کا کام جلد کرا دیجئے"۔

"اچھا دیکھا جائے گا (وکیل سے) آپ تشریف رکھئے۔ حاکم کے آتے ہی درخواست پیش کردیجئے گا۔ میں خود تو لے نہیں سکتا، کیونکہ سوال خوانی ختم ہوچکی ہے۔ لیکن میں کوشش کرونگا کہ آپکی درخواست آج ہی پیش ہوجائے"۔ پیشکار نے کہا۔

حاکم اجلاس کے آتے ہی وکیل صاحب نے درخواست پیش کی۔ جس نے گھڑی کی طرف اشارہ کرکے کہا: "تین بجکر دس منٹ ہوچکے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میرے یہاں سوال خوانی بارہ بجے ہوتی ہے"۔

بجا ارشاد فرمایا حضور! مگر یہ گرفتاری بھی تو بارہ بجے کے بعد ہوئی تھی"۔

"معلوم نہیں پولیس نے کاغذات بھی بھیجے ہیں یا نہیں۔ اور جرم قابل ضمانت ہے یا نہیں"

"حضور پولیس سے رپورٹ طلب فرمالیں" پیشکار نے صلاح دی۔

"اچھا لائیے، چونکہ معاملہ ارجنٹ ہے، میں اس پر حکم دیئے دیتا ہوں کہ پولیس سے رپورٹ طلب ہو

"دیکھا خان صاحب آپ نے! میں نے آپ کا کام کسقدر جلد کرا دیا۔ اگر میں نہ ہوتا تو یقیناً آج حکم نہ ہو سکتا"۔ وکیل نے موکل سے کہا۔

"آپ کی مہربانی ہے، آپ مدد نہ کریں گے تو پھر کون کریگا۔ اب شام تک چھوٹنے کی اُمید ہے نا؟" موکل نے پوچھا۔

"وہ تو ہے ہی! اب آپ محرر سے بات چیت کیجئے اور انھیں ہیڈ اجلاس کے پاس لے جائیے"۔ وکیل نے کہا۔

خانصاحب منشی جی کے پاس پہونچے تو اُس نے پوچھا۔ "کہئے خان صاحب کیا ہوا؟"

"پولیس کی نسبت کچھ حکم ہوا ہے۔ بابو صاحب دیکھ آتے ہیں"۔

"پولیس سے تو رپورٹ طلب نہیں ہوئی ہے"۔

"ہاں، ہاں، یہی! مگر یہ پولیس کی رپورٹ کیسی؟"

اجی کچھ نہیں، ابھی چل کر ہیڈ اجلاس سے رپورٹ لکھائے دیتا ہوں۔ آپ بنیٔ آنے نکالئے اور رپورٹ جلد بھجوائیے۔

"بیس آنے تو میں نے ابھی دئے تھے؟"

"وہ تو پیشکار کو دئے ہوں گے"۔

"اچھا خیر یہ بھی دئے جائیں گے۔ آپ کوشش کر دیجئے"۔

خان صاحب اور منشی جی دونوں ہیڈ اجلاس کے پاس گئے، اور منشی جی نے کہا۔

چیف صاحب! یہ میرے خاص دوست ہیں۔ ان سے میرے بہت پُرانے تعلقات ہیں۔ انکے چچا دفعہ ۱۰۷ میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ضمانت کی درخواست پر پولیس کی رپورٹ طلب کی گئی ہے، ذرا جلدی کر دیجئے"۔

"جب ہمیں کام زیادہ ہوتا ہے، اُسی روز آپ کی رشتہ داریاں نکلتی ہیں"۔

"میرے تعلقات کا خیال نہ کیجئے۔ اپنا حق لیجئے اور ذرا جلدی کام کر دیجئے"۔

"منشی جی آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ کاغذات کا ڈھیر اور یہ سائلوں کی بھیڑ"۔

"چیف صاحب! (سوا روپیہ جیب میں ڈال کر) مہربانی کر کے جلدی کیجئے"۔

"اچھا بتائیے عنوانِ مقدمہ"۔

"دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری کا ہے۔ سرکار بہادر بنام علی بخش۔"

"دیکھا خان صاحب آپ نے؟ آپ کا کام کسقدر جلد ہو رہا ہے۔ اُفوہ! کا کتنا ڈھیر تھا۔ آپ کا نمبر تو شاید پانچویں دن آتا۔"

"منشی جی آپ کا بڑا احسان ہوا۔"

"اچھا تو اب فوراً دو ضامن بلوائیے۔"

الغرض دو ضامن بھی آ گئے۔ مگر ضمانت نامہ لکھنے سے منشی جی نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ کسی عرائض نویس سے لکھوائیے۔ چنانچہ منشی جی نے اپنے ایک دوست عرائض نویس سے ضمانت نامہ لکھوا کر، سوا روپیہ اس کی بھی نذر کیا۔

اِس کے بعد یہ دقت پیش آئی کہ شناخت کون کرے؛ وکیل صاحب ایسا کرنے سے رہے، اِس لئے مولوی امداد علی خان پنشنر کو اس کام پر آمادہ کیا گیا اور اُنھوں نے وقت کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے دو روپیہ فیس اور آٹھ آنہ حق محرر لیا (حالانکہ کوئی محرر نہ تھا)۔

شام کو چار بجے کے قریب ضمانت نامہ مع رپورٹ پولیس پیش ہوا۔ اور پیشکار صاحب نے موکل اور محرر کی طرف اشارہ کیا کہ "ہاں!"۔

"جناب! میں ابھی تو آپ کو دے چکا ہوں۔"

"واہ واہ! وہ درخواست پیش کرنے کا حق تھا، اب ضمانت منظور کرائی دیجئے۔"

خان صاحب نے طوعاً وکرہاً سوا روپیہ نذر کیا۔

"اجی وکیل صاحب! آپ بھی جتنے پرانے ہوتے جاتے ہیں، قاعدہ قانون بھولتے جاتے ہیں۔ اس وکالت نامہ پر کہیں ملزم کے بھی دستخط ہیں، جانتے وکالت نامہ اور درخواست ضمانت دونوں ناجائز!" پیشکار نے وکیل سے کہا۔

یہ سُنکر وکیل صاحب بہت سٹ پٹائے۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں، کسی کے ہاتھ جیل بھیجکر فوراً دستخط کرا منگائیے۔ مگر جلدی کیجئے۔ صاحب اُٹھنے والے ہیں" پیشکار نے کہا۔

"اِس وقت تو یہ کام بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

"اجی نکالئے سوا روپیہ، میں ابھی اپنے چپراسی سے دستخط کرا منگاتا ہوں۔"

سوا روپیہ چپراسی کا اور سوا روپیہ "وہاں کا" دیا گیا۔ اور یہ خدمت اردلی کے سپرد ہوئی۔ مگر اسی اثنا میں ڈپٹی صاحب آ گئے اور پوچھا۔

"پیشکار کوئی کام؟"

"حضور ضمانتوں کی بہت سی درخواستیں داخل ہوئی ہیں"

"اچھا تحصیل سے ضمانتوں کی تصدیق کرائی جائے"۔

"حضور علی بخش کی ضمانت دستی دیدی جائے۔ میں آج ہی تصدیق کرالونگا"۔

ڈپٹی صاحب نے "بہت اچھا" کہا اور مع اردلی تشریف لے گئے۔

اُس وقت کسی کی توجہ اس بات کی طرف نہیں ہے کہ وکالت نامہ پر ملزم کے دستخط ہیں یا نہیں، آپ بھی کسی سے تذکرہ نہ کیجیئیگا"۔

"بہت اچھا۔ تو ضمانت نامہ جلدی دیجئے، ورنہ تحصیلدار صاحب اُٹھ جائیں گے تو تمام محنت خاک میں مل جائے گی"۔

"اچھا تو نکالئے سوا روپیہ"۔

"ابھی تو آپ دو مرتبہ لے چکے ہیں"

"تو جو دیا تھا اس کا کام نہیں ہوگیا۔ اب آپ دستی چاہتے ہیں تو درخواست دیجئے اور صاحب کے بنگلہ جاکر حکم لائیے۔ آپ یہ نہیں دیکھتے کہ چار روپیہ کی بچت کرا رہا ہوں۔ اور سوا روپیہ دیتے جان نکلتی ہے۔ احسانمندی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا"۔

مجبوراً سوا روپیہ اور نذر کیا گیا۔ اور وکیل صاحب ضمانت نامہ لے کر افتاں وخیزاں تحصیلدار صاحب کے یہاں گئے۔ جو اس وقت کسی کام میں مشغول تھے۔ وکیل صاحب نے پیشکار کو ضمانت نامہ دیا اور کہا کہ "ذرا جلدی کر دیجئے"۔

"ابھی لیجئے۔ مگر ضامن کون ہیں؟"

"ایک میر صاحب ہیں اور ایک شیخ جی"۔

"اور اُن کی شناخت کس نے کی ہے؟"

"مولوی امداد علی خان نے"۔

"وہ جو بڈھے سے ہیں۔ اُدنھ اُن کی شناخت کون مانتا ہے۔ یہ بڑا ذمہ داری کا کام ہے"۔

اُس وقت کوئی اور نہ ملا تو اُنھیں سے شناخت کرالی گئی"۔ (سوا روپیہ پیشکار کے ہاتھ پر رکھکر جو کٹھرے کے پاس میز کے نیچے تھا)

"حضور ملزم بہت معزز شخص ہے۔ ضامن بھی معزز ہیں۔ جنھیں وکیل صاحب بھی جانتے ہیں"۔

پیشکار نے ضمانت نامہ پیش کرتے ہوئے تحصیلدار صاحب سے عرض کیا۔
"اچھا نائب صاحب سے رپورٹ لکھا کر چلتا کیجئے"۔ تحصیلدار صاحب نے فرمایا۔
خدا خدا کرکے شام کو چھ بجے کے قریب نائب تحصیلدار نے رپورٹ لکھی اور وکیل صاحب ضمانت لے کر حاکم کے بنگلہ پر گئے۔ جہاں معلوم ہوا کہ صاحب کسی انتظام کے سلسلہ میں شہر گئے ہوئے ہیں انتظار کرتے کرتے آٹھ، نو، دس بج گئے۔ اور کہیں ساڑھے دس بجے کے قریب ڈپٹی صاحب تشریف لائے۔ اور وکیل صاحب کو برآمدہ میں بیٹھا دیکھ کر فرمایا:۔ "کہیئے! اتنی رات گئے کیسے آئے"
حضور وہ ضمانت نامہ تو تصدیق ہوگیا ہے۔ اب پروانۂ رہائی چاہئے"۔
"اب! یہ کوئی کچہری کا وقت ہے۔ نہ پیشکار، نہ اہلمد نہ ہیڈ اجلاس۔ کون پروانہ لکھیگا؟ اور اگر لکھا بھی گیا تو اس وقت ملزم کیسے چھوٹ سکتا ہے۔ میرا حکم بھی بیکار ہوجائیگا۔ اس لئے کل تشریف لائیے"۔
مجبور ہوکر وکیل صاحب مع محرر و موکل واپس ہوئے۔ راستہ میں اہلمد صاحب مع چپراسی جاتے ہوئے ملے۔ جن سے وکیل صاحب نے پوچھا۔
"اہلمد صاحب! یہ رات کو گیارہ بجے کہاں؟"
"کیا عرض کروں ضمانت ناموں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ اسی میں مصروف رہا۔ آپ فرمائیے! آپ اس وقت کہاں؟"۔
"کیا بتاؤں، وہی علی بخش والا معاملہ تھا۔ ضمانت منظور ہوگئی ہے۔ تصدیق ہوگئی، تحصیلدار صاحب کی رپورٹ درج ہوگئی، لیکن پروانہ رہائی نہ ملا"۔
"وکیل صاحب! یہ تو میرا کام تھا، پروانہ تو میں لکھتا ہوں۔ میرے پاس تو کاغذات بھی نہیں پہونچے، میں ڈپٹی صاحب سے یا کسی دوسرے حاکم سے دستخط کرا دیتا"۔
"ہاں یہ تو بیشک غلطی ہوئی، اچھا اب سہی"۔
"اب رات کو، آپکو بیکار ڈھائی روپیہ خرچ کرنا ہونگے، پہلے ہی کام سوا روپیہ میں ہوجاتا، کیا کبھی کیا نہیں؟"۔
"خیر کیا مضایقہ، دیر آید درست آید (ڈھائی روپے بڑھا کر) آپ یہ لیجئے اور کام کر دیجئے"۔ (نذرانہ جیب میں پہونچگیا)
"کیوں بھئی آج تو بستہ میں بہت سے پروانے دھرے ہوں گے؟" اہلمد نے چپراسی سے پوچھا۔
"ہاں لایا تو ہوں، مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کوئی زائد فارم ہے کہ نہیں؟"۔ (خیر کسی ایک سے کام چل جائیگا)

وکیل صاحب، محرر، موکل سب اہلمد کے گھر گئے۔ جس نے بستہ کھولتے ہوئے پوچھا:۔ "اتنی رات گئے آپ کہاں سے آ رہے تھے؟"

"اسی پروانہ کے لئے حاکم کے بنگلہ پر گیا تھا۔"

"ہیں کیا آپ نے حاکم سے ذکر کر دیا؟"

"جی ہاں!"

"غضب کیا، اب مجبوری ہے۔ اگر حاکم تک بات نہ گئی ہوتی تو میں یقیناً آپ کو آج ہی پروانہ دلا دیتا۔ اب میں مجبور ہوں۔ آپ ناحق پریشان ہوئے اور ڈھائی روپے بھی برباد کئے۔ ڈھائی روپیہ کے پیچھے میں اپنی ملازمت تو کھو نہیں سکتا۔ لیکن کل انشاء اللہ نماز سے پہلے آپ کو پروانہ مل جائیگا اور ملزم چھوٹ جائے گا۔"

اثناء راہ میں محرر نے خان صاحب سے کہا۔ "حضور میری تحریرا اور وکیل صاحب کی فیس بھی تو ملنی چاہئے، جو صبح سے گیارہ بجے رات تک پریشان ہوئے ہیں۔"

"اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں، کل دیکھا جائیگا" خان صاحب نے کہا۔

"ہاں صاحب! یہ مروت کا نتیجہ ہے کہ نہ وکیل کی فیس ہے نہ محرر کی تحریر۔ خان صاحب کہیں اور گئے ہوتے تو ڈیڑھ سو روپئے خرچ ہو جاتے، پھر بھی درخواست پیش ہونے کی نوبت نہ آتی۔ یہ ہمارے ہی وکیل صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ضمانت تو منظور ہو گئی۔"

"اچھا اس وقت تو معاف کیجئے۔ کل دیکھا جائیگا۔" خانصاحب نے غصہ سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"اچھا کل ذرا جلدی آئیگا، تاکہ حاکم کے باہر جانے سے پہلے ہی پروانہ پر دستخط کرا لئے جائیں۔ اور ہاں تیس روپیہ آج اور تیس روپیہ کل کی فیس ضرور لیتے آئیگا۔ ورنہ ہمارے وکیل صاحب کام کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ پیشہ میں دوستی سے کام نہیں چلتا۔ محض آپ کی رعایت سے فیس اسقدر کم کر دیگئی ہے آپ نے تو خود دیکھ لیا کہ کس قدر محنت کرنی پڑتی ہے۔"

دوسرے دن عید تھی۔ تمام حکام انتظام میں مصروف رہے۔ اسلئے کسی سے ملاقات نہ ہو سکی، اہلمد نے یہ کہکر ٹال دیا کہ اگر معاملہ حاکم تک نہ گیا ہوتا تو پروانہ رہائی مل جاتا۔ الغرض دوڑ دھوپ میں خان صاحب کی نماز بھی تشریف لے گئی۔ تیسرے دن جب نقص امن کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو سب ملزم چھوڑ دئے گئے۔

ملاحظ فرمایا آپ نے کہ ہر اہلکار کو صرف ایک حقیر سی رقم ملی، مگر سوا سوا روپیہ نکلتے نکلتے خانصاحب کا دیوالہ نکل گیا یہ ہیں کچہری والوں کے وہ ہتکھنڈے، جسے انگریزی داں طبقہ "ٹکا دھر سسٹم" کہتا ہے۔ دیوانی کے معاملات اس سے بھی زیادہ نازک نوعیت کے ہوتے ہیں، جہاں فریقین مقدمہ برسوں دیوانہ بنائے جاتے ہیں۔

نغمۂ روح

(از سید مقبول حسین احمدپوری بی اے ایل ایل بی)

رگِ جاں میں تمھیں ہو اور تمھیں روحِ مجسّم میں　　تمھیں ہو عکس پیرا ہر طرف پہنائے عالم میں
تمھیں سے ذرّہ ذرّہ میں خلش ہے زندگانی کی　　تمھیں نے آنکر ہلچل مچا دی قلبِ آدم میں
تمھارا ہی تبسّم روح کی گہرائیوں میں ہے　　تمھیں قلبِ حزیں میں ہو تمھیں جذباتِ پیہم میں
تمھیں سے ہے تپش دل میں تمھیں سے آنکھ میں شبنم　　تمھیں ہو شادمانی میں خوشی میں رنج میں غم میں
تمھیں سے عزم اور ہمت تمھیں سے جی کو تقویّت　　تمھیں ہو ولولوں میں جوش میں کس بل میں دم خم میں
تمھاری یاد خلوت میں اُٹھا لاتی ہے جلوت سے　　مچلنے لگتے ہیں آنسو تمھیں سے چشمِ پُرنم میں
تمھیں تنہائی میں آکر لپٹ جاتے ہو اس دل سے　　تمھارا ہی اثر کچھ ہے جو ہے کیفیتِ غم میں
تمھیں کون و مکاں میں ہو تمھیں سرّ و عیاں میں ہو　　تمھارا ذکر ہوتا ہے ہمیشہ بزمِ عالم میں
تمھیں ہو جلوہ افگن روز و شب میں ماہ میں خور میں　　وداعِ روزِ روشن میں سحر کے خیر مقدم میں
تمھیں نے کفر اور اسلام کے آئینے دکھلائے　　تمھیں نے ٹھوکریں کھلوائیں تاویلاتِ مبہم میں
تمھیں نے یہ گھروندوں کا بنانا بھی سکھایا ہے　　تمھیں بتخانۂ کاشی میں اور بیتِ معظم میں
تمھیں تھے نغمۂ داؤد میں اور کرشن کی نے میں　　تمھیں تعلیمِ کنفوشس میں اور پیغامِ گوتم میں
تمھیں تھے نوح و ابراہیم و موسیٰ کی دعاؤں میں　　تمھیں اخلاقِ روح اللہ اور توحیدِ صلعم میں
تمھیں دیکھے کوئی کیسے نہیں تم سے جدا کوئی　　کوئی محرم نبے کیسے تمھیں ہو قلبِ محرم میں

تمنّا ہے کہ یہ جانِ حزیں کچھ کام آجائے
تمھاری مصلحت پوری ہو جبتک دم رہے دم میں

قطعہ

جھٹپٹے کے وقت کوندے کا لپکنا بار بار　　ظلمتوں پر مارتا ہے جس طرح تھم تھم کے تیر
یونہیں وحشت ناک عصیاں کی اندھیری رات میں　　آدمی کے قلب کو رہ رہ کے ڈستا ہے ضمیر

(جوش ملیح آبادی)

تنقید کتب

رومیؒ[1]

میر ولی اللہ صاحب ایڈووکیٹ ایبٹ آباد پنجاب، ملک کے اُن محقق ادیبوں میں ہیں جو عربی فارسی جواہرات سے اُردو کے خزانہ کو مالامال کر رہے ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے "لسان الغیب" کے نام سے حافظ شیرازیؒ کے فارسی دیوان کی شرح مع مقدمہ و سوانحعمری چار جلدوں میں شائع کی ہے۔ اُس کے بعد آپ نے "کاس الکرام" کے نام سے رباعیات خیامؒ کا ترجمہ شائع کیا۔ جسمیں رباعیات کی ترتیب مضمون کے لحاظ سے رکھی گئی۔ اب میر صاحب نے رومی کے نام سے مثنوی مولانا رومؒ کا خلاصہ دو جلدوں میں مع مختصر سوانحعمری شائع کیا ہے۔

مسلمانوں میں قرآن شریف کے بعد جو ہر دلعزیزی مثنوی مولانا رومؒ کو حاصل ہے، وہ کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ خود مولانا کا دعویٰ ہے کہ ؎

من زقرآن مغز ہا برداشتم ۔۔۔ استخواں پیش سگاں انداختم

لیکن رومی میں میر ولی اللہ صاحب نے خود مولانا کا "مغز" نکال لیا ہے۔

مثنوی مولانا رومؒ کو عموماً لوگ اخلاق آموز حکایتوں اور منازل تصوف سمجھانے والی کہانیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ سمجھتے ہیں، لیکن میر ولی اللہ صاحب نے مثنوی کا مطالعہ ایک دوسرے زاویۂ نظر سے کیا ہے۔ اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب متفرقات فلسفہ و تصوف کا ایک غیر منظم مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ سعی و عمل جد و جہد و جہاد اور اُن کے متعلق دیگر مسائل کی ایک مسلسل اور جیتی جاگتی تصویر ہے

جن لوگوں نے "گیتا" کا بغور اور سمجھکر مطالعہ کیا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ کتاب سراسر سعی و عمل اور جد و جہد کی تعلیم سے معمور ہے بقول میر ولی اللہ صاحب یہی حال مثنوی کا ہے۔ گیتا کی طرح مثنوی مولانا رومؒ میں بھی، فلسفۂ جہاد، زندگی اور موت کی حقیقت، دولت دُنیا کی محبت، ایذا و عذاب کا خوف، توکل اور جہد، نفس کشی، حریت و آزادی، راہِ خدا میں جان و مال کی قربانی، جاہ و مال کی ہوس، عشق اور آداب رسمی، مظلوموں کی حمایت، چاپلوسی کی مذمت۔ بزدلی کی بُرائی، اخوت و اتحاد، بقا و فنا، صبر و عزم، موت سے ڈرنے کی حماقت، حرص و آز، دولت اور زندگی کی ناپائداری، جبر و اختیار، عزم و ایمان، بلاغیال نتیجہ کوشش

---

[1] دو جلدوں میں، قیمت فی جلد عہ ملنے کا پتہ:۔ منیجر دارالاشاعت بادۂ ناب ایبٹ آباد۔

کرنیکی ضرورت، فلسفۂ ارتقا، کوئی شے مطلق بُری نہیں، رہبانیت کی مذمت، خودی، تمام عالم ایک میدانِ جنگ ہے، دلجمعی کی خوبیاں، وغیرہ وغیرہ پر تسکین بخش دلائل سے بحث کی گئی ہے۔ اِس کتاب میں میر صاحب نے یہ ترتیب رکھی ہے کہ جس مضمون کی کوئی حکایت ہے، پہلے اپنے لفظوں میں اُس مضمون کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد مثنوی کے ضروری اشعار جلی قلم سے درج کرکے اُن کا نمبر وار ترجمہ دیا ہے۔ اِس طرح تمام اہم اور ضروری مضامین مثنوی کے تمام دفتروں سے نکالکر دو جلدوں میں درج کردئے ہیں۔ دوسری جلد کے آخر میں میر صاحب نے مولانا جلال الدین رومیؒ کی مختصر سوانحعمری بھی دی ہے۔ ہمارے خیال میں فاضل مولف کی اِس مبارک کوشش سے اُردو کی دُنیا میں بیش بہا اضافہ ہوگیا ہے اور اِس حیثیت سے یہ کتاب ہر لائبریری میں رکھنے قابل ہے۔

ہمیں بعض جگہ میر ولی اللہ کے تشریحی نوٹوں سے اتفاق نہیں۔ مثلاً بانسری والی ابتدائی نظم کی تشریح کرتے ہوئے میر صاحب لکھتے ہیں:-

> "بانسری یہی قصہ بیان کرتی ہے اور جدائی کی شکایت کرتی ہے کہ اِس نیستان سے جسمیں تمام عدم قدم کے ساتھ متحد تھے، جب مجھے کاٹ کر علیحدہ کیا ہے، میرے نالوں سے مرد اور عورت رو رہے ہیں۔ مرد سے مراد خلاقِ وجود کے اسماء ہیں جو اطوار وجود میں فاعل ہیں۔ عورت سے مراد ممکنات کے اعیان ہیں جو اسماء وصفات سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔"

ہمارے نزدیک "مرد وزن" سے مطلب کچھ اور ہے۔ حکماء کی اصطلاح میں اجرام سماوی کو "آبائے علوی" کہتے ہیں۔ اور موالید ثلاثہ یعنی جمادات، نباتات وحیوانات کو "اُمہاتِ سفلی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی "آبا" یعنی باپ (مرد) اور یہی "امہات" یعنی مائیں (عورت) ہیں۔ جن کو مولانا رومؒ کے اشعار میں "مرد وزن" کہا گیا ہے۔ مولانا کا شعر ہے ؎

کز نیستان تا مرا ببریده اند　　از نفیرم مرد وزن نالیده اند

یعنی جب مجھے جنگل سے تراشا گیا تو میری فریاد وزاری پر تمام مرد وزن روئے ہیں۔ رونے کا کام مادی چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسماء باری مادی چیز نہیں ہیں۔ اجرام سماوی اور موالید ثلاثہ دونوں مادی چیزیں ہیں۔ اور اپنے شعر میں مولانا رومؒ کی "مرد وزن" سے مراد شاید یہی "آباء علوی اور اُمہات سفلی" یعنی اجرام سماوی اور موالید ثلاثہ ہیں۔

"لسان الغیب" اور "کاس الکرام" میں میر صاحب نے مشکل الفاظ کی فرہنگ دینے کے بعد اشعار یا رباعی کے معنی لکھے ہیں مگر اس کتاب میں فرہنگ الفاظ کی کمی رہ گئی ہے۔ اشعار کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ

مشکل الفاظ کی خود بخود تشریح ہو گئی ہے مگر بہتر ہوتا اگر اصل اشعار کے نیچے ہی اُن کا ترجمہ بھی دیا جاتا۔ فرہنگ سے الفاظ کے لغوی معنی بھی معلوم ہو جاتے۔

بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں بھی رواج عام نظر انداز ہو گیا ہے۔ مثلاً لفظ "کمند" کو مذکر لکھا گیا ہے گو یہ لفظ مونث استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض اشعار مروجہ نسخوں سے کسیقدر مختلف صورت میں شائع ہوئے ہیں ایک شعر اِس طرح درج ہوا ہے ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر

حالانکہ اس کا معروف اور زیادہ صحیح نسخہ یہ ہے ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

دوسرا مصرعہ لفظی و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بھی بہتر ہے۔ اب اس کے معنی ہیں "اگرچہ لکھنے میں شیر و شیر ایک دوسرے کے مانند ہوتے ہیں"۔ کتاب کی لکھائی چھپائی، کاغذ سب خاطر خواہ ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۴ صفحات اور دوسری ۲۲۳ صفحات پر ختم ہوئی ہے

کالیداس[1]

کالیداس شاعری و ڈرامہ نویسی دونوں میں یکتائے روزگار مانا جاتا ہے۔ شکنتلا و وکرم اروسی وغیرہ اُس کے مشہور ڈرامے ہیں۔ رگھوبنس کی حیثیت شاہنامہ کی ہے مگر افسوس ہے کہ اس عدیم المثال شاعر کی نسبت صحیح طور پر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کس سن میں اور کہاں پیدا ہوا تھا، کس قسم کا آدمی تھا۔ اور کب وفات پائی۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ کالیداس اُجین کے مہاراجہ وکرماجیت کا درباری شاعر اور اُس کے "نورتن" میں شامل تھا۔ اور یوروپین محققین کے نزدیک اُس کا زمانہ ۳۷۵ء کے لگ بھگ تھا۔

زیر نظر کتاب اسی مشہور و معروف شاعر کی سوانحعمری ہے، جسے چودھری جے کرشن ایم اے۔ ایل ایل بی ایبٹ آباد نے نہایت دماغ سوزی اور تلاش و تجسس سے کام لے کر مرتب کیا ہے۔ فاضل مؤلف نے اسکو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں کالیداس کی سوانحعمری بیان کی گئی ہے۔ دوسرے میں اُس کی شاعری، تیسرے میں اُس کی تصنیفات کا ذکر ہے۔ سوانحی حالات بڑی چھان بین کر کے فراہم کئے گئے ہیں۔ اور اُس کی پیدائش، وطن اور ذات کے متعلق مختلف محققین نے جو نظریے قائم کئے ہیں، اُن پر معقول بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں کالیداس کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے تنقید کی گئی ہے اور تیسرے حصہ میں کالیداس کی تصانیف کا خلاصہ اردو نثر میں درج کیا گیا ہے۔ غرض فاضل مؤلف نے کتاب کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی اِس کیلئے وہ ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

---

[1] کتاب جلد۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- چودھری جے کرشن [illegible]

دیوان غالب (طاہر ایڈیشن)[1]

دیوان غالب کے اب تک بیشمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جنمیں بعض بعض بہت قیمتی ہیں۔ کئی ایڈیشن جیبی تقطیع پر بھی شائع ہوتے ہیں، لیکن اس ایڈیشن کی سب سے نرالی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے آغا محمد طاہر صاحب نے جو شمس العلماء آزاد مرحوم کے نبیرہ ہیں، اپنے ایک خاص اور نایاب نسخہ سے نقل کرا کے شائع کیا ہے۔
آغا صاحب لکھتے ہیں کہ: "مدت سے آرزو تھی کہ غالب کا اردو دیوان شائع کروں، جو سند ہو اور سب قسم کے عیوب سے پاک ہو۔ خوش قسمتی سے اپنے ہی گھر میں ایک مستند قلمی نسخہ نکل آیا۔ یعنی میرے پرنانا جناب حسین مرزا صاحب نواب ناظر قلعہ معلیٰ مرزا کے دوست بلکہ عاشق زار تھے۔ وہ انتخاب میں بھی شامل تھے، اُنھوں نے منتخب کلام کا ایک نسخہ اپنے قلم سے لکھ کر مرزا کو دیا، مرزا نے پڑھکر دستخط اور مُہر سے مزین کر کے بطور یادگار واپس کر دیا۔ جواب بھی میری ننھیال میں مرزا کے محبت بھرے تعلق کو زندہ کرتا ہے۔ یہ دیوان اسی نسخہ سے درست کیا ہے۔ کیونکہ مروجہ دیوانوں میں بار بار چھپتے چھپتے بہت کچھ تبدیلیاں ہو گئی ہیں، اکثر مقامات چھوٹ گئے ہیں، مگر یہ بہت مکمل نسخہ ہے"۔
غرض صحتِ دیوان کی یہی سب سے اچھی تصدیق ہے۔ شروع میں مرزا غالب کے زمانہ کبرسنی کی تصویر، اُن کے مزار کا فوٹو اور اُنکی تحریر کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ چھپائی بلاک کی بہت دیدہ زیب ہے۔ تقطیع چھوٹی حجم ۱۴۷ صفحات ہے۔

سودا[2]

جامعہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد دکن میں علمی تحقیق کو فروغ دینے کیلئے ہر سال چند فارغ التحصیل طلباء کو جنمیں تحقیق و تدقیق کا خاص ذوق اور ملکہ ہوتا ہے، مختلف علوم و فنون میں اُستادوں کی نگرانی میں ریسرچ کرنے کیلئے وظائف دئے جاتے ہیں۔ اسی ضمن میں شیخ چاند ایم۔ اے، ایل ایل بی نے مشہور و معروف شاعر و ادیب مرزا رفیع السودا کی حیات، تصانیف اور کلام پر ریسرچ کی اور اپنی تحقیق کے نتائج کو ایک طویل علمی مقالہ کی صورت میں پیش کیا، جو اب کتابی صورت میں ہمارے پیشِ نظر ہے۔ مرزا سودا کا کلام ہماری تنقید و تبصرہ سے بلند و بالا ہے۔ شیخ چاند نے تحقیق و تنقید میں نہایت دماغ سوزی سے کام لیا ہے۔ ایسی سیر حاصل تنقید لکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم اس کے فاضل مصنف کی جواں مرگی کو ایک ادبی سانحہ سمجھتے ہیں۔ اِس بات کا جتنا قلق کیا جائے کم ہے کہ شیخ چاند اِسقدر جلد رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے

[1] قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ۱) ملنے کا پتہ:- آزاد بکڈپو کوچہ چیلان دہلی۔
[2] قیمت ... روپیہ (...) " ... انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔

افسوس اُن کا تحقیقی مقالہ اُن کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا اور وہ اسوقت احباب کی قدردانی دیکھنے کیلئے ہمارے درمیان موجود نہیں۔ مگر ہم اس کی اشاعت پر انجمن ترقی اُردو کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ کتاب عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے۔ حجم چار سو صفحات ہے۔

کتاب العین[1]

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ساتھ ایک طبیہ کالج بھی ہے، جس کا مقصد طلبار کو فن طب کی نظری وعملی تعلیم و تربیت دینے کے علاوہ اُردو زبان میں فن طب پر مفید و مستند کتابوں کا تصنیف و تالیف کرنا بھی ہے چنانچہ یہ کتاب اسی کالج کے فاضل پرنسپل ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ ایم۔ ڈی (برلن)، بی۔ایس (پنجاب)، ممبر مجلس ماہرین امراض چشم جرمنی کی ہے۔ اس کا موضوع امراضِ چشم، اُن کی ماہیت اور علاج ہے۔ اِس لئے اِسمیں یوروپ کے مشہور اور مستند ارباب فن کی تصنیفات سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے اِسمیں اُن مختلف مقالات سے بھی پورا فائدہ اُٹھایا ہے جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے طلبار کے درس کیلئے مرتب کئے تھے۔ اُن مقالات میں مزید تشریحات و اشارات کا اضافہ کر کے یہ مہتم بالشان کتاب شائع کی گئی ہے۔

اِس ضخیم کتاب کے مختلف ابواب ہیں۔ اعضائے [2] کی تشریح اور اُن کے فوائد۔ معائنۂ چشم کی ہدایات۔ امراضِ چشم کا بیان۔ آنکھ کی خرابیوں کا ذکر۔ آنکھ کے جراحی عمل کی کیفیت اور آنکھ کے علاج و حفاظت کی تدابیر اور نسخہ جات وغیرہ۔ غرض آنکھ کے نقائص اور اُن کے علاج کے متعلق سبھی کچھ درج کر دیا گیا ہے واقعی یہ تمام امور اِس شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ پرنسپل صاحب نے اِس کتاب میں آنکھ کے متعلق کوئی بات نہیں چھوڑی۔ اعضائے چشم کی تشریح کرنے اور اُن کے سمجھانیکے لئے بیشمار نقشوں، تصویروں اور فوٹوز سے بھی کام لیا گیا ہے۔ جس سے مضمون زیر بحث کی وضاحت میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا۔ جن آلات کے ذریعہ آنکھ پر جراحی عمل کیا جاتا ہے، اُن کی تصویریں دی گئی ہیں۔ آنکھ کی بیماری کے متعدد ڈاکٹری، یونانی اور ویدک نسخے بھی درج کئے گئے ہیں۔ جنمیں سے بعض بینظیر ہیں۔ کتاب کی زبان بیشک بہت عالمانہ ہے۔ اور عربی اصطلاحوں اور غیر مانوس و دقیق الفاظ سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے۔ جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے:۔

"نوری انعکاس سے حسی انعکاس زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے، کیونکہ طبعی حالات میں اسکی انجام دہی سے مراکز انبساطی و انقباضی دونوں کا تعلق ہوتا ہے۔ یہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ حسی تحریک سے پہلے نوری انبساط رونما ہوتا ہے۔ کیونکہ سب سے اول منبسط الیاف میں تحریک ہوتی ہے۔ جن کا واسطہ

[1] قیمت دس روپیہ (۱۰) ملنے کا پتہ:۔ منیجر شعبہ تصنیف و تالیف طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
[2] چشم

عنقی شر کی اعصاب سے ہوتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انقباضی الیاف میں کچھ دیر کے لئے تحریکات کا جانا رُک جاتا ہے۔ مذکورہ انعکاسات کے علاوہ حدقۂ عین کے دوسرے انعکاس بھی ہوتے ہیں مثلاً نفسیاتی وغیرہ، جن کے متعلق ہم اس مقام پر زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتے۔

فنی اصطلاحات کے بھی چند نمونے ملاحظہ فرمالیجئے مثلاً استرخا جفنی، عضلۂ جبہیہ۔ محجر۔ حجوظ العین، مقلہ چشم، اجفان، التوا جفنی، فتح العین، شعیرۃ الجفن، نقاط دمعی، احتقان ملتحمی، ماق انسیہ، صمام، حلمہ، غضون، ملعات وغیرہ وغیرہ، کتاب کے آخر میں ایک انڈکس بھی شامل ہے۔ جس سے بآسانی معلوم ہوجاتا ہے کہ کتاب کے اندر کونسا اہم لفظ کس جگہ استعمال ہوا ہے۔ آخر میں فرہنگ اصطلاحات ہے۔ جسمیں آنکھ کے متعلق تمام انگریزی اصطلاحات اور اُن کا عربی ترجمہ دیا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک جہانتک فن کا تعلق ہے، یہ کتاب نہایت مکمل ہے اور اس کا مطالعہ اُن طبیبوں کیلئے بہت ہی مفید ہوگا جو امراض چشم کے بھی ماہر ہونا چاہیں، اور ملک کی تمام بڑی بڑی لائبریریوں میں یہ کتاب رکھنے کے قابل ہے۔ اسکی لکھائی چھپائی، کاغذ ظاہری آرایش سب بہت عمدہ اور حجم بڑی تقطیع کے تقریباً نو سو صفحات، کتاب خوشنما مجلد ہے۔

مہرشی درشن[1]

منشی تلوک چند محروم بی۔ اے۔ کے نام نامی سے اُردو کی شاعرانہ دُنیا میں کون شخص واقف نہیں ہے آپ ہندوستان میں عموماً اور پنجاب میں خصوصاً چوٹی کے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، زیر نظر کتاب آپ ہی کے دلپذیر کلام کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔ اسمیں زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں، جنمیں سوامی دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔ اس لئے اسکا نام "مہرشی درشن" رکھا گیا ہے۔ لیکن اور بھی متعدد دلپسندیدہ نظمیں ہیں۔ ایک نظم پنڈت گورودت جی اور دوسری پنڈت لیکھرام کی شان میں ہے تیسری نظم میں مہاتما منسراج کی تعریف کی گئی ہے۔ غرض روح میں تازگی اور بالیدگی پیدا کرنے کیلئے اس مجموعہ کا مطالعہ بہت موثر ثابت ہوگا۔ شروع میں پنڈت چموپتی ایم۔ اے گورنر گورکل کانگڑی کا لکھا ہوا دو جزو کا مقدمہ ہے، جسمیں سوامی دیانند سرسوتی جی کی سوانحعمری پر روشنی ڈالتے ہوئے محروم کے کلام پر بھی لطیف تنقید کی گئی ہے۔ اسکا حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۶۸ صفحات ہے

محبوبِ خدا[2]

یہ کتاب پیغمبر اسلامؐ کی دلچسپ مگر مختصر سوانحعمری ہے۔ جو مولوی افضل حق صاحب نے بحالت

---

[1] قیمت ایک روپیہ (عہ)۔ ملنے کا پتہ:۔ مسٹر جگناتھ آزاد بی۔اے۔بی۔ای بازار راولپنڈی بالمقابل آریہ سماج مندر
[2] قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) " " :۔ تاج کمپنی لیمٹیڈ ریلوے روڈ، لاہور

قید فرنگ ملتان سنٹرل جیل میں شروع کرکے راولپنڈی جیل میں پایۂ تکمیل کو پہونچائی۔ اس قسم کی سوانحعمریاں ہر زبان میں لکھی جا چکی ہیں۔ جنمیں سب سے ضخیم مولانا شبلی کی "سیرۃ النبیؐ" سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہر کتاب کا طرز تحریر جدا جدا ہے۔ مثلاً "سیرۃ النبیؐ" کا طرز بیان مورخانہ و عالمانہ ہے، اور کتاب زیر نظر کا طرز بیان والہانہ ہے۔ فقرے فقرے سے رسول اسلامؐ کی محبت ٹپکتی ہے، اور کتاب کا انداز بیان شاعرانہ ہوگیا ہے۔ واقعات گو مجمل طور پر بیان کئے گئے ہیں، لیکن ضروری باتیں درج کردی گئی ہیں۔ انشا پردازی کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ حکیمانہ اقوال بھی چسپاں ہیں۔ مثلاً

"خدا کی ہستی کا اقرار تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔"

"جب جسم اور روح آلائشوں سے پاک ہوتے ہیں تو حسینوں سے حسین خدا کی محبت اُجڑی بستی کو بساتی ہے۔"

"گلہ بانی، جہانبانی کا دیباچہ ہے، اِس لئے کہ اِس سے جہانبانی کیلئے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں۔"

"بیوہ کے سوا کون جانتا ہے کہ خاوند کے مرقد میں کتنی کشش ہوتی ہے۔"

"قالینوں پر لوٹنے والے بچے ارادے کے کمزور ہوتے ہیں۔"

"جو موتی ریت کی تہ میں پائے جاتے ہیں، دُر شہوار بنتے ہیں۔ مٹی اور پتھروں میں رُلنے والے ہیرے کوہ نور کہلاتے ہیں۔"

بعض واقعات کے متعلق کافی چھان بین سے کام نہیں لیا گیا۔ اور وہی باتیں لکھدی گئی ہیں، جو مروجہ تفسیروں میں بیان کی گئی ہیں۔ بہرحال یہ کتاب بہت خوبصورت پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کیلئے اسکا مطالعہ خاص طور پر دلچسپ ہونا چاہئے۔ اسکی لکھائی چھپائی اور ظاہری آرایش سب بہت پسندیدہ ہے غرض محاسن ظاہری میں اسمیں وہ سب باتیں موجود ہیں جو تاج کمپنی لیمیٹڈ لاہور کے اہتمام میں چھپی ہوئی کتاب میں ہونا چاہئیے۔ ضخامت دو سَو صفحات ہے۔

"ملاپ" لاہور کے خاص نمبر

پنجاب کے اکثر اخبار و رسالے سال میں کئی کئی خاص نمبر نکالا کرتے ہیں۔ لیکن اس فن میں جو خاص سلیقہ ملاپ لاہور اور "تیج" دہلی کو حاصل ہے وہ انہیں کا حصہ ہے چنانچہ "ملاپ" نے پچھلے بسنت و ہولی کے موقعوں پر جو خاص نمبر شائع کئے وہ اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے انگریزی اخباروں کے سالناموں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اسکا ٹائیٹل پیج بھی بہت نظر فریب ہے۔ دونوں نمبروں میں بہت سے دلچسپ مضامین کے علاوہ مختلف رنگین تصویریں بھی دیدی گئی ہیں اسطرح ظاہری محاسن کے ساتھ معنوی لحاظ سے بھی دونوں پرچے قابل قدر ہیں جن پر ہم کارکنان ملاپ کو مبارکباد دیتے ہیں، البتہ اگر اشتہارات مضامین سے علیحدہ صفحات پر ہو سکیں تو بہت خوب ہو۔

بنی نوعِ انسان کو ورلڈ فیڈریشن کی ضرورت

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔اے آنریری اسسٹنٹ ایڈیٹر "زمانہ")

دُور بیں نظریں دیکھ رہی ہیں کہ زمانہ کس رُخ جا رہا ہے۔ اگر اس بے راہ روی کی روک تھام کا مناسب انتظام نہ ہوا اور بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے ایسے پیشوایانِ امن نہ ملے جن کی نظر قومیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر بین الاقوامی حدود تک پہونچتی ہو اور جن کے دلوں میں کل بنی نوع انسان کی محبت کا جذبہ موجزن ہو تو شیرازۂ عالم منتشر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

ہمیشہ سے دنیا قومی رہنما پیدا کرتی آئی ہے۔ مگر اس وقت ایسے بین الاقوامی رہنماؤں کی ضرورت ہے جو کل بنی نوع انسان کو اخوتِ انسانی Brotherhood of Man اور پدریتِ خدا Fatherhood of God کا سبق پڑھا کر مختلف ملکوں کو ایک شیرازہ میں اس طرح باندھ دیں جس طرح ایک قوم پرست رہنما ملک کے اندر مختلف فرقوں اور جماعتوں کو ہم آہنگ کر کے متحد کر دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں نقل و حمل کے ذرائع میں جو حیرت انگیز ترقی ہوئی اس کے ذریعہ کل دنیا اقتصادی طور سے ایک رشتہ میں منسلک ہو گئی ہے۔ جہاں تک اقتصادیات کا تعلق ہے اب مختلف ممالک کے درمیان دور دراز فاصلے علیحدگی کا سبب نہیں ہیں۔ موجودہ ضروریات اس امر کی متقاضی ہیں کہ نوعِ انسان کے تمام اہم صیغوں میں مثلاً کرنسی (Currency) تجارت (Trade) وغیرہ میں بین الاقوامی ہم آہنگی کی پالیسی پر عمل درآمد کیا جائے۔ پس جملہ مہذب اقوام نے باتفاقِ رائے اپنے Currency System کی بنیاد سونے پر رکھی تاکہ بین الاقوامی تجارت کو فروغ ہو، جس کی بدولت قومی ترقی میں خلل نہ پڑے۔

جہاں تک بین الاقوامی ہم آہنگی کی معرفت قومی ترقی مدنظر رکھی گئی، اس غرض و غایت کی کامیابی میں ۱۹۱۴ء سے قبل تک کوئی موانع حائل نہ ہوئے۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں عالمگیر جنگ ہوئی جس سے باہمی تعلقات کا قلع قمع ہو گیا، بے ارتباطی پیدا کرنے والے اسباب پیدا ہوئے۔ اس جنگ سے دنیا منتشر اور غیر مربوط ہو گئی۔ دوسرے ممالک پر تجارتی دیگر موانع عاید کرنے والی پالیسی

اور علحدگی کے طرز عمل نے جو مظاہرات مابعد جنگ میں تھے بین الاقوامی تجارت اور مالیات کی راہیں مسدود کر دیں، اور کل دنیا کو معاشی مصیبت کے قعر مذلت میں گرا دیا، جس سے ہنوز دنیا پورے طور سے نکل نہیں سکی۔ مختلف ممالک نے مدہم تجارت اور بے روزگاری کے پیش نظر تنگ اقتصادی قومیت کی پالیسی اختیار کی اور دیگر ممالک کی ساختہ اشیاء کی درآمد پر ٹیکس عائد کئے۔ لیکن قانون قدرت (جیسا کہ ارتقائے مجلسی کے علمبردار ہربرٹ اسپنسر نے بیان کیا ہے) یہ ہے کہ جو کچھ منظم تفریق و پیچیدگی کی طرف سے سادگی کی طرف واپس جاتا ہے وہ ورطۂ فنا میں گرفتار ہو کر معدوم ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا اس اٹل قانون کو مسلسل نظر انداز کرتی رہے گی تو اس کا لازمی نتیجہ تنزل اور بربادی ہوگا۔" حال ہی میں مانچسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر ایچ جے فیلور۔ ڈی۔ ایس۔ سی، ایف۔ آر۔ ایس[1] نے کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ یورپ کی سب سے بڑی ضرورت یوروپین فیڈریشن کا قائم کیا جانا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "مختلف ممالک کے لوگوں کو مختلف حالات گرد و پیش کے باعث مختلف اسکیمیں درکار ہیں جو انھیں یقیناً ہمسائگی کے رشتہ میں منسلک رکھتی ہوئی پہلو بہ پہلو اتحادی اور فیڈرل رہنمائی کے تحت قائم رکھ سکتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ ایسی فیڈریشن کا بنیادی اصول یہ ہو کہ دلوں میں اختلاف کے لئے گنجائش ہو اور فراخ دلی کے ساتھ غرض و غایت یہ ہو کہ ممالک کی فاضل پیداوار ضرورتمند پڑوسی ملکوں کے استعمال میں آ جائے۔"

لارڈ لوتھین نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ یورپ کے لئے یوروپین فیڈریشن اور ہندوستان کے لئے انڈین فیڈریشن کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موصوف ارتباط کی پالیسی کے حامی ہیں لیکن انھوں نے یہ بات نظر انداز کر دی ہے کہ اس وقت کی اصلی ضرورت اندرون قوم یا اندرون براعظم ارتباط و ہم آہنگی کی نہیں بلکہ بین الممالک اور بین الاقوام ارتباط و ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہے جس سے مختلف اقوام متحد و منظم ہو کر ایک عالمگیر فیڈریشن World Federation کی صورت اختیار کر سکیں جس کی برکت سے یوروپین فیڈریشن کا (اگر ایسا فیڈریشن قائم کیا گیا) ایشیاٹک فیڈریشن یا امریکن فیڈریشن (کیونکہ جواباً دونوں قائم ہو جائیں گے) کے ساتھ نزاع و اختلاف کا احتمال ہی نہ رہے۔ مجلس اقوام ناکامیاب رہی کیونکہ اس نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا، اس کی تنظیم درحقیقت جنگ عظیم کے فاتحان نے اپنے ذاتی مفاد کے لحاظ سے کی مغلوب فریق کا حصہ محض مفعولی و مجبوری رہا۔ اس کے سوائے چارہ ہی کیا تھا کہ جو اسکیم بھی فاتحان

[1] Mr. H. J. Fleure D.Sc., F.R.S. ط

کی طرف سے پیش کی جائے اُس پر مغلوب ممالک خاموشی سے رضامندی کی مہر ثبت کر دیں چنانچہ بیچاروں کو طوعاً و کرہاً ایسا ہی کرنا پڑا۔

معدودے چند بدنصیب قوموں کو چھوڑ کر قومی تنظیم وارتباط بدرجۂ غایت پہونچ چکا ہے اور اب اس بارے میں حد سے گذرنا بنی نوع انسان کے مجلسی ارتقاء کے لئے باعث تخریب ثابت ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت دنیا کا اتحاد اس قدر مشکل ہو گیا ہے۔ اگر اجزاء (Parts) کُل (Whole) کی امداد و اعانت سے منکر ہیں، اور اپنے آپ کو نوع انسان کی بہبودی کا ذریعہ نہیں بناتے تو یا تو ایسے باغی اجزاء "کل" کے مفاد کی خاطر کاٹ کر پھینک دیئے جائیں گے یا "کل" ورطۂ فنائیت میں پڑ کر نیست و نابود ہو جائیگا۔

انسانی سوسائٹی کے پیشواؤں کو اس خطرہ کا احساس کرنا واجب ہے اور اس کا احساس کرکے مناسب ہوگا کہ دنیا کے (Hitlers) ہٹلر غاصبانہ قومی تنگ نظری سے بالاتر ہو کر قومی علمبردار بننے کے بجائے بین الاقوامی علمبرداری اختیار کریں تاکہ انسان کی مجلسی ارتقا میں ان کی کارروائی قانونِ قدرت کے مطابق معاون ثابت ہو نہ کہ مزاحم۔

اگر سولیزیشن کی تاریخ کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں مجلسی ترقی کا ارتقاء بتدریج وسیع اور وسیع تر سنگٹھن کے ذریعہ ہوا ہے۔ اس حقیقت کی شہادت انسانی عمل کے ہر صیغہ سے ملتی ہے۔ چنانچہ انسان کی اقتصادی ترقی اس پہلو کی مظہر ہے کہ معاشی نظام مفرد کاریگر پر قائم ہوا۔ پھر یہ نظام وسیع تر ہو کر Domestic System of Production کی صورت میں قائم ہوا اور اس کے ماتحت ہمارے تجار مختلف کاریگروں سے اشیاء کے نمونے دے کر اور کچا مال اور مالی مدد بہم پہونچا کر ساختہ مال بنوا لیتے تھے۔ کاریگر اپنے اوزار خود رکھتے تھے۔ وقت پر اس نظام نے اور بھی وسیع تر پیمانہ پر سنگھٹن کے ذریعہ کام شروع کیا اور جو صورت اختیار کی وہ فیکٹری سسٹم کہلائی، یعنی اس کے تحت منتشر کاریگروں کو ایک ہی عمارت میں ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی اہتمام میں مجتمع کیا گیا۔ اس نظام سے بھی آگے بڑھ کر مجلسی ارتقاء کے بموجب یہ ترقی ہوئی کہ الگ الگ کام کرنے والی فیکٹریوں کو سنگھٹن کے ذریعہ ملا دیا گیا اور ٹرسٹ اور کارٹل (Kartal) قائم کئے گئے۔ قدرت کا قانون ہے کہ جو کچھ انتشار سے تنظیم کی جانب جا رہا ہے وہ ارتقاء کی رو میں ہے۔ اسپنسر نے زندگی کی یہ تعریف کی ہے کہ اندرونی

رشتوں کا بیرونی رشتوں کے ساتھ مسلسل ارتباط ہی زندگی ہے۔

جیسے جیسے سوسائٹی نشو و نما پاتی ہے اس میں تفریق و پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے لیکن نشو و نما کی یہ حالت اُس وقت ہوتی ہے جب متذکرہ بالا تفریق و پیچیدگی کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرکے "ایک کل" کی صورت پیدا کردی جائے۔ امریکہ کی ترقی سنہ ۱۸۶۰ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک اسی قانون ارتقاء کے مطابق ہوئی ہے۔ جب سولیزیشن ترقی کر جاتی ہے اور زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے لئے موجودہ تنظیم غیر کافی ثابت ہوتی ہے تو انسان کے لئے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر وہ زندگی کو مکمل بنانا چاہتا ہے تو موجودہ نظام کو توڑکر وسیع تر سنگھٹن کے ذریعہ وسیع تر نظام قائم کرے۔ اگر انسان اس قانون کی پیروی نہیں کرتا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ارتقاء کے برعکس وہ تنزل کی طرف گامزن ہے۔ جیساکہ تاریخ یورپ میں سنہ ۱۸۲۰ء سے سنہ ۱۸۶۰ء تک کا زمانہ اس صداقت کو واضح کرتا ہے، جس کے دوران مجلسی نظام کا رخ تنظیم کی طرف سے ہٹکر انتشار کی جانب رہا۔ پس اگر زندگی کو انتہائی طور سے مکمل بنانا ہے تو مجلسی تنظیم کو قومی نظام سے آگے بڑھکر بین الاقوامی تنظیم کی جانب گامزن ہونا چاہیئے کیونکہ قوم کی محدود تنظیم زندگی کے موجودہ حالات کے لئے ناکافی ثابت ہورہی ہے۔

علمی نوٹ

انجمن ترقی اُردو کے اہتمام میں انگریزی ہندستانی زبان کی جو مستند ڈکشنری تیار ہورہی تھی وہ حال میں "اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری" کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ انجمن کے سکرٹری مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو زبان کی توسیع و ترقی کی کوشش میں اپنی عمر عزیز صرف کردی ہے اور شائقین ادب اُن کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں، لیکن اس ڈکشنری کی تیاری اُن کی مفید و قابل قدر زندگی کا سب سے شاندار کارنامہ ہے جس پر انھیں جسقدر فخر ہو کم ہے۔ انجمن اُردو نے اس یادگار لغت کو خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کا کاغذ خاص طور پر ولایت سے بنوایا گیا ہے۔ اور جلد بھی بہت خوبصورت تیار ہوئی ہے۔ صحت کا خاص انتظام رکھا گیا ہے۔ اسکا حجم سوا پندرہ سو صفحات کے قریب ہے۔ غرض جس تحقیق و تفتیش ۔ عرقریزی و جانفشانی اور صرفِ کثیر سے یہ ڈکشنری تیار کی گئی ہے۔ اس کے دیکھتے ہوئے اسکی قیمت سولہ روپیہ کسی طرح زائد نہیں کہی جا سکتی ہے۔

ہندستانی اکیڈمی نے عوام کی دلچسپی کیلئے ایک روپیہ والی کتابوں کا ایک خاص سلسلہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کی ہر کتاب دو سو صفحات کی ہوگی اور سب کتابیں انگریزی کی "ہوم یونیورسٹی لائبریری" کے نمونے پر لکھی جائینگی اس سلسلے میں تاریخ، تمدن، تجارت، سیر و سفر، سوانح عمری، سائنس اور مذہب غرض سبھی موضوعات پر کتابیں لکھوائی جائیں گی

ڈاکٹر اقبال مرحوم

۲۱/اپریل کو صبح پانچ بجے شاعر اعظم ڈاکٹر اقبال کے انتقال پُر ملال سے اُردو ادب کو جو صدمہ عظیم پہونچا ہے اُس پر تمام ملک میں ماتم برپا ہے۔ ڈاکٹر اقبال موجودہ زمانہ کے سب سے بڑے اُردو شاعر تھے۔ اور گو کئی سال سے اُردو کی بہ نسبت فارسی کلام کی طرف اُنکی توجہ بہت زیادہ مبذول ہو گئی تھی، تاہم اُردو میں جو کچھ لکھ دیتے تھے۔ وہ اس ہر دلعزیز زبان کیلئے مایۂ ناز و باعث فخر ہوتا تھا۔ اِس طرف ایک عرصہ سے آپ کی صحت خراب تھی اور مہینوں سے علالت کا سلسلہ برابر جاری تھا جس سے بیحد نقاہت ہو گئی تھی تاہم کسی کو بھی یہ اندیشہ نہ تھا کہ آپ کا انجام اِسقدر قریب ہے

ابھی جنوری گذشتہ میں ہندوستان کے اکثر شہروں میں معتقدین اقبال نے "اقبال ڈے" منایا تھا۔ ہم نے بھی زمانہ مارچ ۱۹۳۸ء میں "اقبال کی شاعری اور تصوف" پر دو خاص مضامین شائع کئے تھے جنکو ہمارے دو عزیز دوستوں نے ہماری استدعا پر بڑی کاوش و تحقیق سے لکھا تھا۔ آہ! کس کو خبر تھی کہ اس اظہار عقیدتمندی، مضامین کی اشاعت کے بعد اِسقدر جلد یہ شاعر اعظم داعیِ اجل کو لبیک کہکر اپنے مشتاقانِ کمال کو ہمیشہ کیلئے داغِ مفارقت دیجائیگا۔ مگر خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے۔ سچ ہے ؎

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا ... آدمی بلبلہ ہے پانی کا

اِس حادثے نے طبیعت کو افسردہ کر دیا ہے کیونکہ گو علالت اور عدیم الفرصتی کے باعث ایک عرصہ سے زمانہ کو ڈاکٹر اقبال کے کلام کے اشاعت کی عزت نصیب نہیں ہو سکی تاہم یہ ناچیز رسالہ آپ کی خدمت میں ہمیشہ باریاب ہوتا رہتا تھا۔ اور آپ نے اس کے "جوبلی نمبر" اور ایک خاص نمبر کے لئے اپنے اشعار عطا فرمائے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں آپ نے اپنا مشہور گیت "ہندوستان ہمارا" کا صحیح ایڈیشن بھی سب سے پہلے زمانہ ہی کو اشاعت کیلئے مرحمت فرمایا تھا۔

کلام اقبال پر زمانہ میں کئی مفصل تبصرے شائع ہو چکے ہیں اور آیندہ بھی ہوں گے لیکن اب ان مضامین کی کون داد دیگا۔ اصل یہ ہے کہ اقبال کا اُردو میں کوئی جواب پیدا نہیں ہوا ہے۔ اُن کے کلام میں میر تقی کا سوز و گداز، خواجہ درد کا تصوف اور مرزا غالب کا حکمت و فلسفہ کچھ اِس طریقے سے یکجا ہو گیا تھا کہ اسکی نظیر کم سے کم اُردو میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔

اُنکی پیدائش کی تاریخ ۲۲/فروری ۱۸۷۳ء تحقیق ہوئی ہے۔ اس حساب سے موت کیوقت آپکی عمر ۶۵ سال دو ماہ تھی کہتے ہیں وفات سے کچھ قبل آپ نے یہ اشعار ارشاد فرمائے تھے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ... نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے ... دگر دانائے راز آید کہ ناید

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ لوح مزار پر نقش کرانے کے لئے خود ہی یہ قطعہ کہا تھا۔

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک ... ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر ... چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

افسوس اب یہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی

تہنیتِ شادی

کتخدائی مسٹر دینا ناتھ خلف مسٹر رام سرن نگم ڈپٹی کلکٹر بنارس

(۱)

از محمد یعقوب خاں صاحب بی-اے ب سب اڈیٹر "زمانہ"

بادِ صبا نے کلیوں، کلیوں نے سب گلوں سے
اور گُل نے کھلکھلا کر گلشن کی بلبلوں سے
بلبل نے طوطیوں سے، طوطی نے صلصلوں سے
صلصل نے مسکرا کر پوچھا یہ سنبلوں سے

تزئینِ رنگ و بُو ہے، آراستہ چمن ہے
کس کی رچی ہے شادی، کیوں گرم انجمن ہے

اتنی سی بات سن کر، ہلچل ہوئی چمن میں
جمگھٹ میں بلبلوں کے، پھولوں کی انجمن میں
ہونے لگے اشارے نسرین و نسترن میں
سوسن نے یوں صدا دی اترا کے بانکپن میں

یہ محفلِ مسرت راجیندر کی سبھا ہے
دینا ناتھ کے سر سہرا بندھا ہوا ہے

طالع کے نیک اختر، اقبال کے ہیں یاور
جن پر دیا نرائن کی ہوتی ہے سراسر
یہ فخرِ دودماں ہیں، بحرِ شرف کے گوہر
بزمِ طرب کے نوشہ، اس انجمن کے افسر

سہرا یہ کہہ رہا ہے، ہو کر نثار صدقے
فصلِ بہار صدقے، تم پر ہزار صدقے

(۲)

(از پروفیسر ہری کرشن سکسینہ راز ایم-اے لکچرار بی-این-ایس-ڈی کالج کانپور)

روئے زمیں پہ محفلِ فصلِ بہار ہے
محراب آسماں پہ بنی زرنگار ہے
ہے فرشِ چاندنی سے منور فضا تمام
قندیلِ ماہ، چرخ سے یا نوربار ہے
ہیں لاجوردی تخت میں ہیرے نجوم کے
یا برقی قمقموں کی فلک پر بہار ہے

ہے دشت لالہ زار بنا ڈھاک پھولے ہیں
فرشِ زمرّدیں سے سجا سبزہ زار ہے

دیکھیں بہارِ حسن کی، تا گلرخانِ باغ
آئینۂ مصفّا بنی جوئے بار ہے

آئے ہیں بور آم میں کوئل بھی مست ہے
قربان لاکھ جان سے گل پر ہزار ہے

بجتے ہیں جل ترنگ روانی سے آب کی
بربط کوئی شجر ہے تو کوئی ستار ہے

طاؤس محوِ رقص، عنادل کے چہچہے
فردوسِ گوشِ گل ہیں، صبا عطربار ہے

فرطِ طرب سے نغمۂ شادی ہے کل جہاں
بارات دینا ناتھ کی کیا شاندار ہے

پھولے سماتے رام سرن جامے میں نہیں
سہرے کی نورِ چشم کے رخ پر بہار ہے

ہیں باغ باغ راج نراین بھی اِن دنوں
شاخِ اُمید اُن کی ہوئی باردار ہے

مسرور و شاد کیسے ہیں منشی دیا نراین
اور لب پہ شکرِ رحمتِ پروردگار ہے

احباب و رشتہ دار ہیں خنداں مثالِ گل
ہر دل نسیمِ عیش سے جو ہمکنار ہے

اپریل پندرہ وسنہ اڑتیس اُنیس سو
تاریخِ شادی بر صفحۂ روزگار ہے

دولہا دُلہن ہمیشہ رہیں شاد و بامراد
جبتک زمیں پہ دورۂ لیل و نہار ہے

یہ شادیِ سعید مبارک ہو سب کو راز
دل سے یہی نکلتی صدا بار بار ہے

قطعۂ تاریخ

(نتیجۂ فکر جناب منشی فتح بہادر صاحب نگم وکیل لکھنؤ)

یہ غل ہے ہر طرف شادی مبارک ہو مُبارک ہو
دلوں کی فرحت آبادی مُبارک ہو مُبارک ہو
کیا آلام کو دُور اور لکھا خوش ہو کے راحت نے
"یہ دینا ناتھ کی شادی مُبارک ہو مُبارک ہو"

۱۳۲۹ + ۲۸ = سنہ ۱۳۵۷ھ

تصحیح :- زمانہ بابت مارچ سنہ ۳۸ء صفحہ ۱۹۵ سطر ۲ میں "بحرِ قلزم" غلط چھپ گیا ہے "بحیرہ روم" صحیح ہے، درست فرمالیجیے

The ZAMANA, May 1938.



مئی ۱۹۳۸ء | مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے۔ | جلد ۷۰ نمبر ۵

فہرست

عکس تحریر علامہ اقبال - اصلی مسودہ "ہندوستاں ہمارا" مطبوعہ زمانہ ۱۹۰۴ء

قیمت سالانہ پانچ روپیہ | دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا | فی پرچہ سات آنہ

غرض چکبست نے اُردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کیا، اور اپنی مُلکی اور قومی نظموں کے ذریعے سے وہ شعلے برسائے کہ ہندوستانیوں کے خرمنِ غفلت کو پھونک کر رکھدیا۔

چکبست پہلا شاعر نہیں جس نے اپنے تخیل اور فکر کی بلندی کو آزادیٔ وطن کی قربان گاہ پر چڑھایا دنیا کے ہر ایک پسماندہ اور محکوم ملک میں شاعروں نے اپنے ملک کو غیروں کے پنجہ سے آزاد کرانے میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کی غفلت اور بے حسی کی دھجیاں اُڑائی ہیں۔ اور اُن میں بیداری، جوشِ عمل اور آرزوئے ترقی کے جذبات پیدا کئے۔ اسکاٹ لینڈ کے قومی شاعر رابرٹ برنس[۱] نے اپنے ملک کی عظمت اور اپنے ہم وطنوں کی بہادری کی داستانیں لکھی ہیں جو آج بھی طبیعت میں جوش پیدا کردیتی ہیں۔ اُس نے غیر ملکی حکمران کے برخلاف جہاد کا وہ جذبہ پیدا کیا جسے انگلستان کی پوری طاقت بھی نہ دبا سکی۔ انقلابِ فرانس کے دنوں میں ایک فوجی افسر کیپٹن رفنٹ ڈی لائل کا مشہور قومی ترانہ "مارسیلز" سامعین کے دلوں میں ہیجان پیدا کردیتا تھا۔ اُس نے فرانس کی کایا ہی پلٹ دی یہ ترانہ اب تک آزادی کے گیتوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ امریکہ کے مشہور شاعر جان گرین لیف ویٹیر (John Greanleaf Whitter) نے "باربرا فریچی" کے عنوان سے ایک ولولہ انگیز نظم لکھی، اور ایک بچانوے سالہ بوڑھی خاتون کی داستان بیان کی جس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈالکر قومی جھنڈے کی عظمت کو برقرار رکھا۔ مائیکل ڈریٹن اور کئی دوسرے انگریز شعرا نے انگلستان کی عظمت کی داستانیں لکھ کر اپنے ہم وطنوں کو آزادی کا سبق سکھایا ہے۔ قومی ہیجان کے وقت شاعری نمایاں حصہ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات بہت معمولی قسم کی شاعری لوگوں کے دلوں میں تلاطم برپا کردیتی ہے تاریخ شاہد ہے کہ انگلستان کے قوانین کی اصلاح میں اس قسم کی شاعری نے معتدبہ حصہ لیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں بھی ایسے کئی شاعر ہوئے جنھوں نے قومی عظمت کے گیت گائے اور غیر ملکی حکومت کے خلاف آواز بلند کی۔ عہدِ مغلیہ کی ایک مثال لیجیئے، اورنگ زیب نے شمال مغربی سرحد پر رہنے والے قبائل کو مطیع کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن خوشحال خان خٹک کی پرجوش قومی پشتو نظموں نے تمام قبائل میں حرّیت کا وہ جذبہ پیدا کیا جس کے سامنے اورنگزیب کا لشکر بیکار رہ گیا۔ موجودہ تحریک آزادی میں بنکم چندر چیٹرجی کے مشہور قومی گیت "بندے ماترم" نے برسوں تک ہزاروں محبانِ وطن کے قلب و روح کو گرمایا۔ موجودہ سیاسی بیداری میں چکبست کے علاوہ اقبال۔ ساغر۔ [illegible]۔ جوش۔ اور قاضی نذر الاسلام کی قومی نظموں نے بہت حصہ لیا ہے۔

[۱] Robert Burns.

اقبال کا قومی ترانہ :-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ہمارے جذباتِ حریت، آرزوؤں اور اُمنگوں کا حامل ہے۔ اقبال کا تخیل گو بعد میں اسلام اور فلسفۂ اسلام کی ترجمانی میں منتقل ہو گیا، لیکن اُس نے آزادی، خودداری، غلامی اور مظلومیت کا جو احساس ملک میں پیدا کیا ہے، وہ نہایت ہی قابلِ قدر ہے۔ ٹیگور کی شاعری نے دنیا کی نظروں میں ہندوستان کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا ہے، اور وہ ہندوستان کی روح کو بے نقاب کرنے میں بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اُن معنوں میں قومی شاعری نہیں کہلا سکتی جو اِس وقت زیرِ بحث ہے۔ ٹیگور بین الاقوامی شاعر ہیں، وہ امن و آشتی کے علمبردار ہیں، اس واسطے دنیا کے ہر حصے کے باشندے اُن کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کو گیتانجلی میں کئی ایک ایسے گیت ملیں گے جن سے حبِ وطن کی بُو آتی ہے۔ فردوسِ وطن کے نام سے عطاء اللہ کلیم نے ایک گیت کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔

جس سرزمیں میں خوف و خطر کا گذر نہ ہو جس سرزمیں میں حاکمِ جابر کا ڈر نہ ہو
جس سرزمیں میں علم کی پرواز ہو بلند جس سرزمیں میں فرقہ پرستی کے ہوں نہ بند
جس سرزمیں میں بات ہو آئینۂ خیال جس سرزمیں میں فکر ہے تشنۂ کمال
جس سرزمیں میں عقل نہ گم کردہ راہ ہو جس سرزمیں میں روح سے اُس کا نباہ ہو

اُس جنتِ نظر میں بسیں میرے ہم وطن
گہوارۂ طرب میں رہیں میرے ہم وطن

آپ چکبست کے دیوان "صبحِ وطن" کو پڑھیے، ہر ایک نظم میں آپ کو دردِ وطن میں ڈوبے ہوئے جگر پارے ملیں گے۔ عنوان کوئی ہو لیکن وطن کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہے۔ کہیں شوکتِ پارینہ کا ذکر ہے۔ کہیں موجودہ بے بسی اور سیاسی کشمکش کا تذکرہ ہے۔ اور کہیں ماضی کی داستانیں ہیں۔ حال کا دُکھڑا ہے اور مستقبل کے خواب ہیں۔ غرض اُس دیوان کے ایک سیر حاصل مطالعہ کے بعد آپ کو ایک محبِ وطن کا مکمل خاکہ مہیا ہو جائیگا۔ لیجئے میں ہی ایک خاکہ پیش کئے دیتا ہوں۔

ملک کے قدرتی مناظر، اسلاف کے کارنامے اور شوکتِ پارینہ کے قصے ایک انسان کے دل میں وطن پرستی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ایک ہندوستانی کے واسطے اُس کا ملک خوبصورت

قدرتی مناظر سے پٹا پڑا ہے، اس کی تہذیب و تمدن کا لوہا ایک دنیا مانتی ہے، چکبست ہی کی زبان سے سنیئے :۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے اللہ رے زیب و زینت! کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر روز ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اب اسلاف کے کارنامے سنیئے :۔

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اِس انجمن کو سینچا لہو سے اپنے رانا نے اِس چمن کو

ایسے اسلاف کے کارناموں کو یاد کر کے قومی برتری اور بزرگی کا غیر معمولی احساس ہوتا ہے۔

سب سُور ویر اپنے اِس خاک میں نہاں ہیں ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں
دیوار و در سے اب تک اُن کا اثر عیاں ہے اپنی رگوں میں ابتک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے فردوس گوش ابتک کیفیتِ اذاں ہے

قومی بزرگی کا نشہ سر میں خمار اور دل میں سُرور پیدا کر دیتا ہے اور شاعر بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے :۔

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مُبارک رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مُبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مُبارک ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مُبارک

لیکن یہ غرور کا جذبہ دیر تک قائم نہیں رہتا جونہی غلامی اور موجودہ پستی کا خیال آتا ہے نشہ ہرن ہو جاتا ہے، قدرتی مناظر کا کیا لطف جب آزادی ہی نہیں ؎

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اُس کے لئے چمن کی خزاں کیا، بہار کیا

ایک غلام کو اپنے شاندار تمدن کا کیا احساس؛ غلامی انسان کے فطری جوہر کو زائل کر دیتی ہے :۔

یہ انقلاب ہوا عالمِ اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

ہمارے دل و دماغ، ہاتھ اور پاؤں، زبان و قلم پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں، اور ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔

قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی
اُڑا ہے باغ سے بُو ہو کے رنگِ آزادی
ہوائے شوق میں غنچے چٹک نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے
زباں ہے بند، قلم کو بندھائی ہے زنجیر
بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر

ہے دل میں درد مگر طاقتِ کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

ملک میں ہر ایک چیز کی فراوانی ہے، لیکن لوگ فاقوں مر رہے ہیں،

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اُس کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

افلاس ہماری قومی غیرت کو مٹا رہا ہے۔

کرشمہ یہ بھی ہے اے بے خبر! افلاسِ قومی کا
تلاشِ رزق میں اہلِ ہنر کا دربدر جانا

اس پر ستم یہ کہ ہم اتنے بے بس ہو گئے ہیں، کہ اپنے ستانے والے کو ستا بھی نہیں سکتے۔

یہ بیکسی بھی عجب بے کسی ہے دنیا میں
کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

اور اس پر یہ حکم ہے کہ گھُٹ کے مرجائیں لیکن فریاد نہ ہو، حرفِ شکایت لب پر نہ آئے۔

حکم مالی کا ہے یہ پھول نہ ہنسنے پائیں
چُپ رہے باغ میں کوئی اگر آزاد رہے

یہ آزادی بھلا کس کام کی؛ فرحت نے کیا خوب کہا ہے ؎

کتر کر، نوچ کر، پر توڑ کر، پر باندھکر فرحت
وہ مُرغانِ چمن کو قید سے آزاد کرتے ہیں

یہ سیاسی پستی ہم میں کیسے آ گئی۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم میں حبِ وطن کا فقدان ہے۔

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے — حبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

لیکن اس غلامی کی ظلمت ہند پر آخر کب تک طاری رہتی؟ کوئی حالت ہمیشہ کے لئے قائم نہیں رہ سکتی اس دنیا کے کارخانے میں تغیر لازمی ہے

چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی
شبنم کو آئے دامنِ گل میں قرار کیا

آخر ہماری حالت میں بھی انقلاب آیا۔ افریقہ میں ٹرانسوال اور دیگر مقامات میں جو مظالم ہندوستانیوں پر توڑے گئے، اور مہاتما گاندھی نے جو ستیا گرہ کی جدوجہد شروع کی اُس سے ہندوستانی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور اُنھیں احساس ہوا کہ اپنے ملک میں بے بسی کی وجہ سے وہ دُور رہتے ہوئے ہم وطنوں کی کوئی امداد نہیں کر سکتے۔ چکبست نے "فریادِ قوم" کے عنوان سے ٹرانسوالی ہندوستانیوں کا دُکھ درد بیان کرکے ہماری رگِ حمیت کو بھڑکایا ہے۔

وطن سے دُور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی — اسیرِ یاس بھی ہیں اور اسیرِ زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی — ہوئے ہیں نذرِ مصیبت کے دین و ایماں بھی

پڑھی نماز تو اُجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں

لٹے ہیں یوں کہ کسی کی گرہ میں دام نہیں — نصیب رات کو پڑ رہنے کا مقام نہیں
یتیم بچوں کے کھانے کا انتظام نہیں — جو صبح خیر سے گذری نصیب شام نہیں

اگر جیئے بھی تو کپڑا نہیں بدن کے لئے
مرے تو لاش پڑی رہ گئی کفن کے لئے

ادھر ہندوستان میں مسز اینی بیسنٹ نے تحریک ہوم رول شروع کی۔ سوئے ہوئے جذبات جاگ اُٹھے، قوم نے کروٹ لی اور سوراج کا زندگی بخش پیغام سنا۔

حکمِ حاکم ہے کہ فریاد زبانی رُک جائے — دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو یا پانی رُک جائے — پر یہ ممکن نہیں اب جوشِ جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا نہیں اب قوم نے کروٹ لی ہے

مسز بیسنٹ کی گرفتاری نے تحریک آزادی پر ایک تازیانہ کا کام کیا۔ شاعر مسز بیسنٹ کو

مخاطب کرکے کہتا ہے :-

ہند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے
جیسے برسوں کا مریض اٹھتا ہے بیماری سے

قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے
چاندنی پھیل گئی حسن وفاداری سے

تو نظربند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے، نور ہے محفل بھر میں

مسز بیسنٹ اور دیگر فدایانِ وطن کی گرفتاری اور قید نے قید خانے کو آزادیِ وطن کے راستہ میں ایک مقدس مقام بنا دیا۔

آج سے شوقِ وفا کا یہی جوہر ہوگا
فرش کانٹوں کا ہمیں پھولوں کا بستر ہوگا

پھول ہو جائیگا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا
قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا

سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

دل دہلتے نہیں زنداں میں گرفتاروں کے
بیڑیاں ڈھونڈتے ہیں پاؤں وفاداروں کے

درِ زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

دل جذبۂ حریت سے سرشار ہے، بڑی سے بڑی مصیبت بھی سدِّراہ نہیں ہو سکتی

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنھا نہیں سکتے

یہ وہ آگ ہے کہ بجھائے نہ بجھے،

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

اب تو سوراج کا سودا ہے، اور یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے"

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے

گلوں کی فکر میں بلبلیں نہ صبح و شام رہے
نہ کوئی مرغِ خوش الحاں اسیرِ دام رہے

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

دنیا کی کوئی طاقت اس آزادی کی خواہش کو کچل نہیں سکتی،

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا

دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا — رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا

یہی جذبہ ہے جو اُن کے مشہور گیت "وطن کا راگ" میں پایا جاتا ہے۔

پنھانے والے اگر بیڑیاں پنھائیں گے — خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے — یہ راگ گا کے اُنھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے — وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے — مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے..........

یہی دعا ہے وطن کے شکستہ حالوں کی — یہی اُمنگ جوانی کے نونہالوں کی
جو رہنما ہے محبت پہ مٹنے والوں کی — ہمیں قسم ہے اُسی کے سفید بالوں کی

طلب فضول ہے..........

بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر — وطن کا پاس ہے اُن کو سہاگ سے بڑھ کر
جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لختِ جگر — یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے اُنکے سینے پر

طلب فضول ہے..........

یہ جذبۂ حبِ وطن عہدِ شباب میں اپنے انتہائی مدارج پر ہوتا ہے۔ جب خون میں حرارت دل میں جوش، زبان میں روانی اور آنکھوں میں وطن کی محبت کا نشہ چھلکتا ہے۔

جنونِ حبِ وطن کا مزہ شباب میں ہے — لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
جو مانگنا ہو ابھی مانگ لو وطن کے لئے — یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

وہ جوانی ہی کیا جو وطن کی خدمت میں صرف نہ ہو، وہ دلیری ہی کیا جو وطن کے کام نہ آ

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ — جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ
جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب — وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

لیکن یہ محض زبانی محبت نہ ہو، اگر اس کا اثر گہرا نہیں اور دل گرفتارِ محبت نہیں تو ایسی محبت کس کام کی!

زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا — اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

دلوں میں آگ لگے یہ وفا کا جوہر ہے یہ جمع و خرچ زبانی رہے رہے نہ رہے
زباں کے زور پہ ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

فنافی القوم کے لئے کوئی تکلیف موجبِ آزار نہیں، اور نہ ہی موت اُس کے مقصد کے لئے پیغامِ فنا ہے۔

فنا نہیں ہے محبت کے رنگ و بُو کے لئے بہارِ عالمِ فانی رہے رہے نہ رہے
رہیگی آب و ہوا میں خیال کی بجلی یہ مشتِ خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے

کیا ہوا اگر جسم قید ہے، زبان بند ہے اور راحت کا کوئی سامان نہیں

جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے زباں کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے
دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا ولولوں کے لئے ممکن نہیں زنداں ہونا
مٹنے والوں کو وفا کا یہ سبق یاد رہے بیڑیاں پیر میں ہوں اور دل آزاد رہے

خدمتِ وطن کی راہ میں اگر موت بھی آئے تو بھی اُس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے، کیونکہ وفاشعار موت کو موت نہیں سمجھتا، اور خاصکر وہ شخص جو حیات و ممات کی حقیقت جانتا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

آخر کونسی چیز ہے جو ایک وطن پرست کو ہر قسم کے آزار سے بے پروا اور دنیا کے آرام و آسایش سے بے نیاز کر دیتی ہے، وہ اپنے منتہائے مقصود کے لئے ہر قربانی کرتا ہے، اور ہنستے ہنستے ہر نئی تکلیف اور آزمایش کے لئے سینہ سپر ہوتا ہے۔ منزلِ مقصود کی دوری اور پرخار راستہ اُس کے حوصلوں کو پست کرنے کے بجائے اُس کے آتشِ شوق کو تیز کر دیتا ہے بقول شاعر کیا خوب کہا ہے:۔

راحت سے بھی عزیز ہے راحت کی آرزو
دل ڈھونڈھتا ہے سلسلۂ انتظار کو

جب عاشقِ وطن قید سے آزاد ہوتا ہے، اُس کا پر جوش استقبال جو اُس کے ہم وطن اُس کے اعزاز میں کرتے ہیں نہایت ہی روح پرور نظارہ ہوتا ہے۔

قید سے چھوٹ کے آئے ہیں وفا کے یوسف سرِ بازار ہے کیا بھیڑ خریداروں کی

ہر غیر ملکی حکومت محسوس کرتی ہے کہ آخر قید کرنے سے اُسے کیا حاصل ہوا بجز اس کہ تحریک کو پہلے سے

بھی زیادہ تقویت ملی۔

رہ گئی بات زمانے میں دل آزاروں کی گردنیں خم ہیں ندامت سے وفاداروں کی

وطن پرست کا دل ہر وقت اُمید سے بھرا نہیں رہتا، کبھی مایوسی کا دَور دورہ بھی ہوتا ہے جب اُسے مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ خاصکر ہندو مسلم کشیدگی اُسے بیزار کر دیتی ہے۔

طرزِ ہندو دیکھ کر رنگِ مسلماں دیکھکر قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے

لبسا اوقات ہمارے استقلال کی کمی اور بے غرضانہ حبِ وطن کا فقدان ہمارے مشن کی کامیابی کو التوا میں ڈال دیتا ہے۔

اب اس بازار میں الفت کا سودا ہو نہیں سکتا گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے

ہمارے لیڈروں کی ناقابلیت یا ان پر عدم اعتماد ہماری تحریک کو نقصان پہونچاتا ہے، اور وطن پرست کا دل بیٹھ جاتا ہے۔

الٰہی خیر ہو یہ زخم اچھا ہو نہیں سکتا جسے ہے فکر مرہم کی اُسے قاتل سمجھتے ہیں

اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بیکار کٹ گئی اور منزلِ مقصود ابھی کوسوں دُور ہے لبسا اوقات یہ بھی شک پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم چٹان سے سر پھوڑ رہے ہیں۔ ناممکن الحصول کے لئے سعی لاحاصل کرتے رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر زندگی کا خطّ اُٹھایا ہوتا یا کسی اور مدعا کو مرکزِ توجہ بنایا ہوتا۔ بعض اوقات ساری عمر کی جد و جہد کا بہت ہی تھوڑا ثمر دیکھ کر دہ کہہ اُٹھتا ہے کہ کاش ہم سے کچھ زیادہ مفید مطلب کام بن پڑتا۔

جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے میں

لبسا اوقات وہ اس اُمید و یاس کی زندگی سے گھبرا اُٹھتا ہے اور موت کو دعوت دیتا ہے۔

الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا ہے عدم میرا کشاکش ہے اُمید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے

لیکن یہ یاس و مایوسی کا جذبہ کچھ وقت کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی فطرت پھر اثر انداز ہوتی ہے، اور دل میں اُمید کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا کمالِ بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں

نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہی بے مائگی دل کی

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، ہر تاریکی کے بعد روشنی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ سیاہ بادلوں میں

ہی بجلی کوندتی ہے۔

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

اگر زندہ رہنا ہے تو کشمکشِ حیات سے بھاگنے کی کوشش فضول ہے۔

رہ کے دنیا میں ہے یوں ترکِ ہوس کی کوشش
جس طرح اپنے ہی سائے سے گریزاں ہونا

دنیا میں رہ کر آزادیِ وطن کی مہم جاری رکھ اور مایوس نہ ہو، اگرچہ گوہرِ مقصود تیرے ہاتھ نہ آئے، کیونکہ

چمن زارِ محبت میں اُسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

ہندوستان کے قائد اعظم مہاتما گاندھی کی خدمت میں شاعر نے اپنی عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں:۔

نثار ہے دلِ شاعر ترے قرینے پر
کیا ہے نام ترا نقش اس نگینے پر

بال گنگا دھر تلک اور مسٹر گوکھلے ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں پیش پیش رہے اُن کی وفات سے تحریکِ آزادی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا۔ شاعر نے اُن کے مرثیے لکھے ہیں۔ مسٹر گوکھلے کی موت پر لکھا ہے:

خدا کے حکم سے جب آب و گِل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

چکبست ملک کو ہر پہلو سے متمدن اور ترقی یافتہ دیکھنے کا خواہاں تھا، آزادیِ وطن کے حصول کے لئے تعلیم کی ترقی لازمی ہے۔ چنانچہ جب ہندو یونیورسٹی بنارس کا ڈیپوٹیشن زیر قیادت پنڈت مدن موہن مالویہ برائے فراہمی چندہ لکھنؤ پہونچا تو اُس جلسہ میں جو اس غرض کے لئے منعقد ہوا چکبست نے ایک ولولہ انگیز اپیل کی:۔

یہ کارِ خیر وہ ہو نام چار سو رہ جائے
تمہاری بات زمانے کے روبرو رہ جائے

جو غیر ہوں اُنھیں ہنسنے کی آرزو رہ جائے
غریب قوم کی دنیا میں آبرو رہ جائے

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کردو
فقیر قوم کے آئے ہیں جھولیاں بھر دو

تعلیم نسواں کی ترقی کا بھی وہ دل سے خواہاں تھا، کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ اگر عورت جاہل اور پھوہڑ رہے تو قوم کے بچے کب پروان چڑھیں گے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ مغربی تہذیب کی رَو میں بہہ کر قوم کے بچے اپنی شاندار تہذیب اور روایات کو خیرباد نہ کہہ دیں، 'پھول مالا' کے نام سے اُس نے لڑکیوں کو جو نصیحت کی ہے اُس کا ہر ایک لفظ آبِ حیات ہے۔

روشِ خام پہ مردوں کے نہ جانا ہرگز　　داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و ریفارم　　تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں　　ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا　　اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں　　یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
انکی تعلیم کا مکتب ہے تمہارا زانو　　پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو　　دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمہارے نہ ہو اس وقت کا رنگ　　ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رُلانا ہرگز
ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں　　تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

"زمانہ" تیس ۳۰ سال پہلے

سوامی دویکانند پر نواب رائے" کے نام سے منشی پریم چند مرحوم نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں سوامی جی موصوف کی بعض تقریروں کے کچھ اقتباسات بھی درج ہیں۔ یہ تقریریں آج بھی عزیزانِ وطن کیلئے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتی ہیں اس لئے یہاں پر ان کا اقتباس بے موقع نہ ہوگا:-

"پیارے ہموطنو! اے مقدس آریہ ورت کے بسنے والو، کیا تم اپنے ذلت آمیز بودے پن سے وہ آزادی حاصل کر سکو گے جو دلیروں کا حق ہے۔ اے برادرانِ ہند یہ خوب یاد رکھو کہ سیتا، ساوتری، اور دمینتی تمہاری قوم کی دیویاں ہیں۔ اے بہادرو! مرد بنو اور للکار کر کہو "میں ہندوستانی ہوں، میں ہند کا رہنے والا ہوں" ہندوستانی اور ہند کا بسنے والا خواہ کوئی ہو میرا بھائی ہے۔ جاہل ہندوستانی، نادار ہندوستانی۔ اعلیٰ قوم کا ہندوستانی۔ ادنیٰ قوم کا ہندوستانی۔ سب میرے بھائی ہیں۔ ہندوستانی میرا بھائی ہے۔ میری زندگی ہندوستانی ہے۔ ہندوستان کے دیوتا میری پرورش کرنیوالے ہیں۔ ہندوستان میرے بچپن کا گہوارہ میرے شباب کا عیش گاہ اور میرے بڑھاپے کا فردوس بریں ہے۔ اے شنکر، اے مادرِ گیتی! مجھے مرد بنا، میری کمزوری کو دُور کر، اور میری بزدلی کو مٹا دے۔"

("زمانہ" مئی ۱۹۰۶ء)

کلامِ جگر

(ہمارے محبِ قدیم حضرت جگر مراد آبادی کا یہ تازہ ترین عطیہ ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں)

تھی جو بنیاد شادی و غم کی
دل نے وہ انجمن ہی برہم کی

آہ کی ہے صدا نہ ماتم کی
کیا طبیعت بدل گئی غم کی

اُس نے شانوں پہ زلفِ برہم کی
خیر! یارب نظامِ عالم کی

یوں تو پیاسے ہیں سبزہ و گل بھی
کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی

شانِ رحمت برس پڑی کیا کیا
اِس خطا پر کہ ہر خطا کم کی

آئی تھی آج بھی نسیمِ سحر
آگ بھڑکا گئی جہنم کی

اِک خطا پر سزائے بے بنیاد
ہائے تقدیر ابنِ آدم کی

حُسن کامل ہے ترا اور بھی کامل ہو جائے
میری گستاخ نگاہی بھی جو شامل ہو جائے

شعر و الہام تو کیا عرش بھی نازل ہو جائے
دل جو اک شئے ہے حقیقت میں اگر دل ہو جائے

دونوں عالم سے فراغت مجھے حاصل ہو جائے
عشق اگر حُسن بنے حُسن مرا دل ہو جائے

اُف رے بیدادِ فلک ہائے رے تقدیرِ چمن
غنچہ کھلتے بھی نہ پایا کہ مرا دل ہو جائے

مجھکو منظور دو عالم سے رقابت لیکن
وہ نگاہِ متبسم طرفِ دل ہو جائے

حیف وہ حُسن کا پندار جو کھا جائے شکست
ہائے وہ زعمِ محبت کہ جو باطل ہو جائے

میں تو منھ پھیر لوں اے وسعتِ صحرائے جنوں
اب جو کونین بھی چاہے کہ مرا دل ہو جائے

میں کہیں کا نہ رہوں عشق کہیں کا نہ رہے
اِک نفس بھی جو فراغت مجھے حاصل ہو جائے

---

۴ مئی کو کسی شخص نے مراد آباد سے جگر صاحب کے انتقال کی خبر اڑا دی۔ جس سے ملک بھر میں رنج و ملال کی لہر دوڑ گئی، مگر شکر ہے کہ دوسرے ہی دن اِس خبر کی تردید ہوگئی۔ خدا کرے عرصہ دراز تک آپ اپنی کمال شاعری سے ملک کو مستفید کرتے رہیں۔

پُرانا آریہ ورت[1]

پنڈت کشن پرشاد کول بی۔اے رکن انجمن خادمان ہند

دُنیا ابھی اپنے وحشیانہ پن کے دھندلکے سے اُبھرنے نہ پائی تھی۔ انسان نے اپنی قدرتی برہنگی کو ڈھاکنا ابھی مشکل سے سیکھا تھا۔ دجلہ و فرات کے کنارے اور وادیٔ نیل کی گھاٹیوں میں شائستگی کی پو اب پھٹنی شروع ہی ہوئی تھی کہ پورب کے دیس آریہ ورت میں پہلے پہل تہذیب و تمدن کا سُورج آب و تاب سے چمکتا نظر آیا۔ کوئی چار ہزار برس ہوئے ہوں گے کہ آرین قوم کا ایک کاروان وسطی ایشیا سے کوچ کر کے انڈس کی پنج ندیوں کے کنارے آکر ٹھہرا۔ جہاں اُس نے اپنے ڈیرے ڈنڈے ڈالدیئے اور فتح کے جھنڈے گاڑ دئے۔ رفتہ رفتہ گنگا اور جمنا کے دوآبہ تک اُس نے اپنا قبضہ جمایا۔ رگ ویدکی رچنا کے رچنے والے یہ آریہ اِس دیس میں بس کر ہندو کہلائے، اور اس ملک کا نام ہندوستان پڑا۔ بُودھ مت کے عروج کے زمانہ سے قطع نظر کر کے کہ جب چندرگپت موریہ کے عہد میں میگیا دلی اور بسمارک کا پیش رو اور ارتھ شاستر کا مصنف چانکیہ پیدا ہوا۔ اور پھلا پھولا اور اشوک اعظم نے اُس زمانہ کی سب سے عظیم الشان سلطنت پر حکومت کی جس کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا۔ ہندو آریوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ کو مورخوں نے تین حصوں میں بانٹا ہے۔ سب سے پہلا اور پُرانا زمانہ رگ وید کا ہے یعنی جب آریوں نے اپنا تسلط پنجاب پر جمایا۔ یہ زمانہ نمعلوم کب سے شروع ہو کر ۱۴۰۰ قبل مسیح میں ختم ہوتا ہے۔ دوسرا زمانہ اُپنشدوں، مہابھارت اور رامائن کا ہے یعنی جب اِس قوم نے ستلج کو پار کر کے گنگا اور جمنا کے دوآبہ پر اپنا تسلط کیا اور امن و سکون کے ساتھ تہذیب و تمدن کو نشو و نما دینا شروع کیا۔ یہ زمانہ ۱۴۰۰ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۱۰۰۰ قبل مسیح پر ختم ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ کا تیسرا عہد منطق، فلسفہ و اصلاح کا وہ دور ہے جو اس کا سب سے درخشان باب کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اس زمانہ میں اُپنشدوں کی تعلیم کو مکمل کر کے ہندوؤں نے فلسفیانہ نازک خیالی اور باریک بینی کو اوج کمال پر پہونچایا تھا۔ [illegible] کپل [illegible] سانکھ فلسفہ کے موجد کپل کا نام علمی دُنیا میں آج تک ادب سے لیا جاتا ہے فلسفہ کے علاوہ گرامر، منطق، ریاضی اور نجوم کے علوم میں بھی انھوں نے ایسی دستگاہ حاصل

[1] یہ مضمون لکھنؤ براڈکاسٹنگ اسٹیشن [illegible] براڈکاسٹ کیا گیا تھا ڈائرکٹر صاحب اسٹیشن مذکور کی اجازت سے ہدیۂ ناظرین زمانہ کیا جارہا ہے۔

کی تھی۔ جس سے دُنیا کو فیض پہنچا۔ اسی زمانہ میں کشمکش زندگی سے بےچین اور مکروہات دنیادی سے تنگ اور عاجز مخلوق کو گوتم نے اس سکون و دائمی نجات کا وہ پیغام دیا۔ کہ جو اس دُنیا کے اندھیرے میں راہ کا کھوج لگانے والے کیلئے ابد تک مشعل کا کام دیگا۔ ہندؤں کی تاریخ کا یہ عہد اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کہ یہ شمالی ہندوستان سے نکلکر بنگال، گجرات، کاٹھیاواڑ اور دکن تک اُس زمانہ میں پھیلے۔ یا یوں کہئے کہ تمام ہندوستان پر چھا گئے۔ اور جوں جوں ہندو پورب، پچھم اور دکن میں پھیلتے گئے۔ گوتم کا پیغام بھی بدھ مت کے نام سے مقبول عام ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ تمام دنیا پر چھا کر رہا۔ یہ زمانہ ۱۰۰۰ قبل مسیح سے شروع اور ۳۲۰ قبل مسیح میں ختم ہوتا ہے۔ کپل کے فلسفہ، گوتم بدھ کے اُپدیش اور چندرگپت موریہ اور اشوک اعظم کے زمانے کی تاریخ کا تذکرہ تو آپ کسی اور کی زبانی کسی اور دِن سُنینگے آج تو آپ کو صرف رِگ وید، مہابھارت، رامائین اور اُپنشدوں کے دَور کے آریوں کا حال سُنانا منظور ہے۔

ہندو آریوں کی یہ قوم جو پنجاب میں آکر بسی، فتح اور عظمت کے ارمان دِلوں میں لیکر آئی تھی۔ ہمت اور جیوٹ اُس کے رگ و ریشہ میں پیوست تھی۔ اُس کی زندگی نہایت سادہ، سہل اور دل لبھانے والی تھی۔ کھیتی باڑی کرنا، گھربار کی حفاظت کرنا، بال بچوں کی پرورش کرنا گھر کے ہر ایک سر دھرے کا کام تھا۔ اُسوقت تک نہ بڑی بڑی حکومتیں تھیں نہ راجہ و مہاراجہ، ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو ضرورت کے وقت اُس کی رہبری کرتا تھا۔ یہی صورت مذہب اور پرستش کی تھی۔ نہ دیویاں تھیں نہ دیوتا۔ نہ مندر تھے نہ پجاری۔ نہ پروہت تھے نہ لمبے چوڑے یگ اور نہ پوجائیں کائنات قدرت سے حیرت زدہ ہوکر اُس کے دلفریب مناظر کے آگے یہ سیدھے سادھے لوگ سر جھکا دیا کرتے تھے۔ ہر گھر میں اگن آہوتی دیجاتی تھی اور وید منتر پڑھے جاتے تھے اور بس۔ ورن آشرم کے دستور یا ذات کی تفریق سے یہ لوگ قطعی ناواقف تھے۔ نہ برہمن تھے نہ کھشتری نہ شودر، سب کے سب ہندو آریہ کہلاتے تھے۔ وہی رِشی اور مُنی جو وید منتروں کو پڑھتے اور اُن کی رچنا کرتے میدان جنگ میں جاکر فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتے، اور جو لوگ قبیلوں کے سردار ہوتے وہی وید کا پرچار بھی کرتے۔ ذات کی تفریق صرف آریہ اور غیر آریہ میں ہوتی، عورتوں کا مرتبہ بھی سماج میں اونچا تھا۔ گھر میں اُنکی عزت اور اختیار ہوتا تھا۔ باہر آنے جانے میں نہ روک ٹوک تھی نہ پردہ، شادی بچپن میں نہیں ہوتی تھی۔ شادی کا رشتہ باندھنے میں لڑکی کی مرضی کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ شادی کے وقت وید منتروں کے ذریعے سے خاوند اور بیوی میں عہد و پیمان ہونے بھی

بیواؤں کی شادی کی ویدوں میں اجازت تھی۔ اُس زمانہ میں بیواؤں کی شادی ہوا کرتی تھی۔ عورت کیلئے کنوارا رہنا بھی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عورتیں پڑھتی لکھتی بھی تھیں۔ اگن اُہوتی میں مردوں کے ساتھ برابر بیٹھتی تھیں۔ ایسی ایسی ودوان بھی نکلیں کہ جنھوں نے رشیوں کیساتھ شاستراتھ کئے۔ اور رشیوں کا مرتبہ پایا۔ اُن ہندو آریوں کی زندگی سادی اور سچی ضرور تھی لیکن دُنیا کی دولت اور عظمت اور تمام لذتوں سے یہ گریز نہ کرتے تھے۔ کھانے پینے اور باتوں میں بھی ممنوعات نہ تھیں۔ شکار اور قربانیاں کرتے تھے اور تقریباً ہر جانور کا گوشت کھاتے تھے۔ یہ لوگ سوم رس کے جو ایک قسم کی شراب ہوتی تھی، بڑے دلدادہ تھے۔ اس کا شوق نہایت عام تھا اور اُس کو متبرک سمجھکر پیتے تھے۔ یہ تو رگ وید کا زمانہ ہوا۔ اب مہابھارت، رامائن اور اُپنشدوں کے عہد پر نظر ڈالئے۔ آریہ اب سُتلج پار کرکے گنگا اور جمنا کے دوآبہ تک پھیل گئے تھے۔ بلکہ ترہت تک اُن کا تسلط ہو گیا تھا۔ چھوٹی بڑی سب طرح کی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ قانون اور ضابطے نے رواج پایا تھا۔ علم وہنر کو ترقی ہو رہی تھی۔ پچھلے زمانہ کی سیدھی سادھی زندگی پر شائستگی کی آب وتاب جھلکنے لگی تھی۔ تکلفاتِ زندگی بڑھتے جاتے تھے۔ شہر آباد ہوتے جاتے تھے راجدھانی میں محلوں اور قلعوں کی تعمیر ہونے لگی تھی۔ سڑکیں اور نہریں نکالی جاتی تھیں۔ تیر وتفنگ، ڈھال اور تلوار اور زرہ بکتر کے علاوہ سونے اور چاندی کے زیوروں اور جواہرات کا استعمال بھی ہونے لگا تھا۔ پولس اور عدالتیں قائم ہو گئی تھیں۔ محصول لگائے جاتے تھے۔ صنعت وحرفت اور دستکاری نے فروغ پایا تھا۔ غرضیکہ اس زمانہ میں ہندو تہذیب وتمدن نشو ونما پا رہا تھا۔ تاریخ میں پانچ شاہی خاندانوں اور حکومتوں کا ذکر خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ دہلی کے قرب وجوار میں کوروں کی حکومت تھی۔ قنوج پنچالہ خاندان کی راجدھانی تھی۔ اودھ اور اُس کے آس پاس میں کوشل خاندان حکومت کرتا تھا اور کاشی بنارس کے گرد ونواح میں ترہت اور متھلا میں [illegible] خاندان کا تسلط تھا۔ جابجا پریشد اور گورو کل قائم ہو گئے تھے۔ جنمیں قوم کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ اور وید شاستر، ویاکرن اور جوتش کے علوم سیکھتے تھے۔ مذہب اور پرستش کے طریقوں اور عقیدوں میں بھی بڑی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ سیدھے سادھے وید منتروں اور اگن آہوتی کی جگہ دیوی، دیوتاؤں کی پوجا پاٹھ، یگ اور تپس اور کرم کانڈ کی ریتوں اور رسموں نے لے لی تھی۔ برہمنوں کا بڑا زور تھا۔ گروؤں اور پروہتوں کی بڑی جماعت ایک علیحدہ ذات بن گئی تھی۔ اسی طرح حکمراں طبقہ نے بھی رعیت پر حاوی ہو کر اُس سے علیحدہ

اپنی ایک ذات قائم کرلی تھی۔ اسی طرح سے برہمن اور کھتری ذاتیں بنیں، باقی معمولی رعیت ویش کہلائی۔ غیر آریہ قوم کے ادنیٰ لوگ جنھوں نے آریہ قوم کی تہذیب کو قبول کرلیا تھا۔ شودر سمجھے گئے۔ ذات کی تفریق تو جو ہندو قوم کے زوال کا باعث ہوئی اس زمانہ میں قائم ہوگئی تھی، مگر ابھی تک کھانے پینے کی قیدیں اور چھوت چھات شروع نہیں ہوئی تھی، بلکہ مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ بھی ہوتا تھا۔ ذات کی موجودہ بگڑی ہوئی شکل جو آج ہم دیکھتے ہیں یہ بہت عرصہ کے بعد کی جدّت ہے۔ ہندوں میں مردوں کے ایک سے زیادہ شادی کرنے کا رواج بھی اسی زمانہ میں شروع ہوا گو یہ امیروں اور رئیسوں کے طبقہ تک ہی محدود تھا۔ رگ وید کے علاوہ اور تینؔ وید اُسی زمانہ میں لکھے گئے اور مہابھارت اور رامآین بھی۔ ایک بہت بڑی تبدیلی جو اس زمانہ میں ہوئی وہ یہ تھی کہ رگ وید کے زمانہ کے عام آریوں میں جو مردانگی کے جوہر، جیوٹ اور ہمت کے ولولے پائے جاتے تھے وہ قوم کے عام لوگوں میں اب نہیں دکھائی دیتے تھے۔ ایک وجہ تو اُس کی یہ تھی کہ اِس مُلک کی گرم آب وہوا نے طبقوں میں سُستی اور تکان پیدا کردی تھی۔ دوسرے شائستگی کی جِلا، علم وہنر کی مصروفیتوں اور تکلفات زندگی کی عادتوں نے قوم کو آرام پسند بنا دیا تھا۔ لیکن عوام الناس کی پستی اور ادبار کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ملک گیری اور ملک داری کا کام اور فتح وعظمت کا ولولہ قوم کے حکمران طبقہ میں محدود ہوکر رہ گیا تھا اور علم وفلسفہ اور تہذیب وتمدن کے نشوونما کو برہمنوں نے بلاشرکت غیرے اپنا فرض وحق قرار دے دیا تھا۔ جمہور قوم کو ان برہمنوں اور کھتریوں نے اِس طرح سے جکڑ بند کر رکھا تھا کہ اطاعت گذاری کے علاوہ یہ کسی مصرف کے نہیں رہے تھے اس زمانہ کے برہمنوں کے ایجاد کئے یوگ بنس اور کریاؤں کے اُپدیس کا اثر عام لوگوں کی ذہنیت پر یہ پڑا کہ دُنیا مایا اور متھا ہے۔ اس سے ایک طرف تو اُن میں اپنی آزادی اور حقوق حاصل کرنیکے ولولے پیدا نہ ہونے پائے اور دنیوی کام کاج سے اُن کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے ہندوں نے تاریخی تعمیرات، سنگ تراشی اور دوسری اختراعوں اور ایجادوں کی طرف سے لاپروائی برتی۔ دوسری طرف یوگ اور گیان کا فلسفہ بھی اُن کی پرواز سے اونچا تھا کہ یہ چھوت چھات، ذات پات اور شبہ اور شنکا کے ڈھونگ میں پڑ کر کسی کام کے نہ رہے، ان پر ہندی کی یہ مثل صادق آتی ہے کہ "دُبدھا میں دونوں گئے مایا ملی نہ رام"۔

آخری حصّہ میں کھتریوں نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ برہمنوں کو زک دیکر اُن سے چھٹکارا حاصل کریں۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، تاہم برہمنوں کے یوگ بنس ا

اور رسموں کے اُس جال کو جو اُنھوں نے پھیلا رکھا تھا۔ اُس زمانہ کے عالی ظرف کھتریوں نے جنمیں راجہ جنک کا نام خاص طور سے ممتاز ہے۔ اُپنشدوں کے گیان اور فلسفہ سے ایک حد تک توڑا۔ اپنشدوں کی تعلیم کی عظمت کے بارے میں صرف اِسقدر کہنا کافی ہوگا۔ کہ شوپنہار "Schopenher" نے ایک جگہ لکھا ہے کہ" دُنیا بھر میں کسی چیز کا مطالعہ اُپنشدوں کی تعلیم سے زیادہ روح افزا نہیں۔ اپنشدہی زندگی بھر میرے اطمینان کا باعث ہوئے ہیں اور مرتے وقت بھی مجھے انھیں سے تسکین ملیگی"۔

اِس تذکرے کو ختم کرنے سے پیشتر دو تین باتیں اِسی سلسلہ میں اور کہنی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ دُنیا کی تاریخ میں ہماری تہذیب و تمدن سب سے پُرانا ہے۔ یعنی پُرانے زمانے میں ہماری تہذیب و تمدن نے جو مرتبہ حاصل کیا تھا۔ اسوقت کسی ملک یا کسی قوم کو شائستگی کا یہ شرف حاصل نہ ہوا۔ چونکہ پُرانے زمانے کے ہندو آریہ علم تاریخ سے ناواقف تھے۔ ہمارے یہاں کی ملک گیری اور ملک داری کے مسلسل حالات، شاہی خاندانوں کے نام اور ہماری لڑائیوں کی تاریخیں صحیح صحیح معلوم نہیں ہوئی۔ اِسلئے مورخوں نے ہندوستان کی تاریخ کا شروع ۵۰۰ قبل مسیح سے کیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا شروع ہی ۵۰۰ قبل مسیح سے ہوتا ہے۔ اور باقی جو کچھ ہے، وہ سب من گھڑت کہانیاں یا سُنی سنائی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں ہماری تہذیب و تمدن کے نشوونما کا جسقدر سلسلہ وار حال مرتب ہے۔ اُس کی دوسری مثال مشکل سے ملیگی۔ اور جو کچھ لٹریچر میں ملتا ہے، اُس کی تصدیق پُرانے سکوں اور پُرانے آثاروں سے ہوتی ہے۔ بالخصوص منجہدارو اور ہڑپا کے پُرانے آثاروں سے جس تہذیب و تمدن کا کھوج ملا ہے اُس سے تو ہماری تاریخ ایک ہزار سال اور پُرانی ثابت ہوتی ہے۔ وہ زمانہ دُور نہیں کہ مورخ ہندوستان کی تاریخ کو ۳۰۰۰ قبل مسیح سے شروع کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اور ہماری تہذیب اب سے ۵۰۰۰ برس پُرانی ثابت ہوگی۔ دوسری بات دھیان میں رکھنے کی یہ بھی ہے کہ یہ خیال کہ ہندوستان کی ... و تمدن ہندوستان کی ہی چہار دیواریوں میں بند رہا۔ اور اس کو اور تہذیب دُنیا سے

تھا، صحیح نہیں۔

س زمانہ کی مہذب دُنیا ہی کتنی تھی۔ پھر آجکل کے زمانہ کی سی سفری آسانیاں بھی

م تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو پُرانے زمانے میں بھی جہاز رانی سے واقف تھے،

لہ تجارت اور تبادلۂ خیالات اس وقت کی مہذب قوموں سے ہوتا رہتا تھا۔

ن (Prof Rowlinson) نے لکھا ہے کہ فنیقیہ اور ہندوستان کے درمیان

۹۵۰ قبل مسیح میں سلسلہ تجارت جاری تھا۔ ہندوستان کے مغربی ساحل سے ہاتھی دانت، مور پنکھ، مٹی کے برتن، بنی ہوئی چیزیں اور جواہرات فینقیہ جایا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں تبادلۂ خیالات بھی لازمی تھا۔

ان کا یہ بھی بیان ہے کہ فیثاغورث نے یونان میں جس فلسفہ وحقانیت کا وعظ کیا۔ اُس پر اُپنشدوں کی تعلیم کپل کا فلسفہ اور گوتم کے مذہب کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ یونان کی تہذیب اور تمدن کے نشو ونما میں آواگون، کرم، نروان اور موکش کے مسئلوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اور وہاں کے علوم ریاضی اور نجوم کی ابتدا سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یونان ان معاملوں میں ہندوستان کا بہت کچھ مرہون منت تھا۔ صرف یہی نہیں کہ ہماری تہذیب وتمدن نہایت پرانا ہے اور اُس نے دُنیا کو شائستگی کی تعلیم دی ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ عجیب وغریب معجزہ تو یہ ہے کہ اس تہذیب نے عمر جاوداں پائی ہے۔ پچھلے ۲۰۰۰ برس میں صفحہ ہستی پر کتنی ہی تہذیبیں اُبھریں، پھلیں پھولیں اور بالآخر پیوند زمین ہو گئیں۔ آج اُن کا نام ونشان بھی باقی نہیں۔ لیکن ہماری تہذیب سفر زندگی کی مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی آج بھی جیتی جاگتی نہ صرف زندہ اور باقی ہے۔ بلکہ جوانی کی اُمنگیں پہلو میں رکھتی اور ترقی وعروج کے آثار ظاہر کرتی ہے۔ رشی رانا ڈے نے اِس معجزہ کو مشیت ایزدی کے مظاہرے سے تعبیر کیا ہے اور اسمیں قوم کے آیندہ عروج واقبال کے راز کو پنہاں بتایا ہے۔ اِسی خیال کو اقبال نے بھی اپنے ترانۂ ہندی میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے　　اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری　　صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

غلط فہمی نہ ہو میں اس کا قائل نہیں کہ "پدرم سلطان بود"۔ جو قومیں آج کشمکش حیات میں اپنا قدم ثابت رکھنا چاہتی ہیں۔ اُن کو اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ اور وہی مقابلہ کی تاب لاسکیں گی۔ کہ جن کے سینہ میں اُبھرنے کے ارمان اور سرفروشی کی تمنائیں نکلنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ یہ لوگ پیچھے پھر کے نہیں دیکھتے بلکہ اُن کی نگاہیں سامنے رہتی ہیں۔ اور قدم ہمیشہ آگے بڑھتا ہے۔ یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ اس مغربی تہذیب کے دور میں کہ سائینس کی جلوہ کاریاں جس کا خاصہ ہے، کپل کا فلسفہ اور گوتم کا پیغام ہمکو "عاقبت کی خبر خدا جانے" دُنیا کو نہیں بخشوا سکتا اور اگر ہم ترقی کے میدان میں قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ تو ہم کو مغرب سے ابھی بہت کچھ۔

سیکھنا ہے، یہ سب کچھ صحیح ہے تاہم یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ پیکارِ زندگی میں گامزن ہونے کے لئے بزرگوں کی گاڑھی کمائی کا یہ زادِ راہ بھی بڑا کارآمد اور ضروری چیز ہے۔ کیا اس ورثہ کو جس پر ہمیں جا بجا طور پر ناز کرنا چاہیئے۔ اور ناز ہے ہم آسانی سے ضائع ہونے دیں گے؟ اور اگر ہم نے ایسا کیا تو کیا یہ کوئی عقل کی بات ہوگی؟

ریلوے، ٹیلیگراف اور ٹیلیفون۔ موٹر کار اور ایروپلین، مشین گن۔ ڈائنامیٹ اور تارپیڈو، سینما، ریڈیو اور ٹیلیویژن بڑی حیرت انگیز اور کارآمد چیزیں ہیں۔ لیکن معیار شرافت و شائستگی ان سے بھی بالاتر ہے۔ یوروپ والے اس کا کھوج ابھی پوری طور سے نہیں لگا سکے ہیں۔ آدمی میں انسانیت بھی کوئی جوہر ہے۔ اس راز کا پتہ ضرور اپنشدوں کی تعلیم کپل کے فلسفہ اور گوتم کے پیغام سے چلتا ہے۔ اور یہی بات سمجھنے کی ہے۔

حبِ وطن

آجکل ہر شخص کی زبان پر حب الوطنی کا ذکر ہے۔ ہر شخص اپنے تئیں محب وطن سمجھتا ہے۔ مگر کتنے لوگ وطن کا درد دلوں میں رکھتے ہیں۔ فوری جوش سے کوئی محب وطن نہیں بن سکتا۔ ذاتی ارادوں میں ناکامی۔ نام کی خواہش یا کسی دنیاوی فائدے کی آرزو کسی کو وطن پرست نہیں بنا سکتی۔ ذراسی خود غرضی کا دخل بھی حب وطن کے منافی ہے نفرت کا ذراسا بھی لگاؤ اس کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کے دل میں اپنے ملک کی کسقدر سچی محبت ہے۔ ایک تقریر میں سوامی ویویکانند نے حب الوطنی کے دعوے داروں کو مخاطب کر کے کہا کہ کیا تمہارے دل میں اس بات کا درد اور احساس ہے کہ کروروں بندگانِ خدا جو تمھارے ملک کے بزرگوں کی اولاد ہیں حیوانیت کے درجے تک پہونچے ہوئے ہیں؟ کیا تم کو یہ درد ہے کہ تمھارے ملک کے کروروں آدمی مدتوں سے بھوکوں مر رہے ہیں؟ کیا تمہیں اسکا قلق اور صدمہ ہے کہ تمام ملک میں جہالت کالی گھٹا کی طرح چھائی ہوئی ہے؟ کیا ان باتوں کو سوچکر تم بے چین ہو جاتے ہو؟ کیا ان خیالات سے تمھارا خواب و خور حرام ہو جاتا ہے؟ کیا تمہارے رگ و پے میں یہ احساس خون کی طرح دوڑ رہا ہے اور تمہارے قلب کی حرکت سے ہم آہنگ ہے؟ کیا اپنے وطن کی تکلیف اور تباہی کے خیال نے تمہیں محو کر لیا ہے اور نام و نمود، اپنی شہرت اپنے اہل و عیال اپنے مال و متاع اور خود اپنے جسم کو بالکل بھول گئے ہو؟ کیونکہ محب وطن بننے کی پہلی شرط اور یہی پہلی منزل ہے۔

ماڑی اِنڈس

(چاندنی رات میں)

از حضرت طالب چکوالی بی-اے، ایل ایل بی

چاندنی کا دلرُبا منظر شرابِ حسن ہے
چاندنی کا جانفزا منظر شبابِ حسن ہے

نُور کے دریا میں ہیں دیوار و در ڈوبے ہوئے
نور کے سیلاب میں سنگ و شجر ڈوبے ہوئے

ساحلِ دریا قبائے نُور سے آراستہ
کوہساروں کا جہاں آراستہ پیراستہ

کشتیِ مہتاب بحرِ آسماں میں ہے رواں
ایک ہے دریا میں کشتی اور اُسمیں اِک جواں

گا رہا ہے کس مزے سے، فکر سے آزاد ہے
نور اور نغمہ سے اِک دنیا نئی آباد ہے

پتھروں کے ڈھیر اور اشجار ہیں بکھرے ہوئے
ساحلِ انڈس پہ سچ مچ لعل ہیں بکھرے ہوئے

پتھروں کی سلطنت کے شاہزادے دیکھیے
ہستیِ خاموش کے رنگیں ارادے دیکھیے

چاندنی میں ریت کے دریا کی بھی ہے کیا بہار
در کنارِ آبجو ہے ایک سیمیں رُود بار

نُور کا دریا ہے یا سیماب کا دریا ہے یہ
چاندنی کا سحر ہے یا نُور کی دُنیا ہے یہ

ہیں کھڑے اشجار جو دریا کنارے خال خال
عکس اپنا دیکھ کر ہیں آپ ہی مستِ جمال

اور ہے اُس پار کالاباغ کی نوریں بہار
کس طرح پھیلا ہوا ہے در کنارِ کوہسار

نیچے اوپر دُور تک روشن گھروں میں ہیں دیئے
عکس ان کا آبِ انڈس پہ ہے اِک جادُو کیے

نُور کے سیلاب میں دیوار و در ڈوبے ہوئے
نُور کے سیماب میں ہیں سیم و زر ڈوبے ہوئے

چاندنی کا سحر، عکسِ نور، آب و تابِ آب
نُور میں ڈوبے پہاڑوں کا ہے منظر لاجواب

نُور کی مینا میں ہے لطف اور مستی کی شراب
ڈھل گئی ساغر میں طالب کیفِ ہستی کی شراب

آسماں سے نُور کے دامن میں چھن کر آئی ہے
چاندنی کی حُور شیشے میں اُتر کر لائی ہے

پیجئے یہ مے، کہ ساقی نے صلائے عام دی
شوق سے پی اور پی جی بھر کے پی، اور خوب پی

ایک وادی کی شام

(از مولوی عبدالواسع عصری جلگگوری)

لہلہاتے کھیت ہیں، ساکن ہے جنگل کی فضا
شام کا ہے وقت جنگل سارا سونا ہوگیا
زندگی کی دَوڑ سے خستہ پرندے ہوگئے
آکے اپنے گھونسلوں میں سر چھپاکر سو گئے
شام کے سیاح نے بھی کھینچ لی رُخ پر نقاب
پڑ گیا ہے عرصۂ گیتی پہ دھندلا سا حجاب
چھاگئی شب کی سیاہی کوہ اور میدان پر
خوف سا ہوتا ہے طاری دیکھکر انسان پر
بحر و بر پہ ہے سکونِ عارضی چھایا ہوا
قافلہ موجوں کا ساحل کی طرف آیا ہوا
ایک انگڑائی میں فطرت کی جہاں مدہوش ہے
زندگی کا مدعا اب موت کی آغوش ہے
کوہ ساکن ہے مگر ندی رواں ہے زور سے
پُرسکوں وادی میں ہنگامہ ہے اسکے شور سے
جھومنا پودوں کا مستی میں ہے کتنا دلنواز
چاہتے ہیں کچھ کہیں موجوں سے اپنے دل کا راز
کھلکھلاکر جب چٹانوں کے قریب آتی ہے وہ
مسکراکر موت کے آغوش میں جاتی ہے وہ
دیکھ اے نادان انساں یہ ہے رازِ زندگی
ہر رگِ جاں میں ہے پنہاں سوز و سازِ زندگی
مشکلاتِ دہر سے ڈرنا کبھی اچھا نہیں
ہند والے! بزدلی تیرے لئے زیبا نہیں

ہو کے انساں راہِ فطرت سے اگر تو دُور ہے
میں سمجھ لونگا کہ تیری چشمِ دل بے نور ہے

فلسفۂ ہستی

ہر وقت جو گھیرے رہے پستی مجھ کو
تو خاک بلندی میں ہو مستی مجھ کو
ہونا ہے مجھے نیست کسی دن بسمل
لائی ہے کہاں کھینچ کے ہستی مجھ کو

(بسمل الہ آبادی)

سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت

(اسمِ جامد)

از مسٹر سلیم جعفر

اسم کی تین قسموں جامد۔ مصدر۔ مشتق میں سے پچھلی دُو سے بحث کی جا چکی۔ اب صرف
سم جامد سے بحث کرنی ہے۔ ایک قواعدنویس کا خیال ہے کہ "فارسی میں اکثر جامد لفظ صورت میں
فرد اور حقیقت میں مرکب ہیں، مثلاً کمند مبدل خم۔ وند کا ہے، کیونکہ کمند خم درخم ہوتی ہے۔ غرض فارسی
ں ہزاروں لفظ مرکب ہیں مگر اُن پر جامد ہی کے احکام جاری ہیں"۔ یہی مقتدر مصنف اس سے پہلے اسمائے
شتق سے بحث کرتے ہوئے اسم فاعل ترکیبی کے بیان میں رقم طراز ہے: "وند مثلاً لوآوند۔ آوند (یعنی آب وند)
ہلے خاص پانی کا برتن تھا اب عام ہے، حقیقت میں یہ وہی لفظ ہے جو سنسکرت میں ونت ہے مثلاً
بنت (زورمند) شاید مند اور وند سے بھی اس کا اتحاد ہو"۔ ایک ہی لفظ کو ایک جگہ مشتق ماننا اور
وسری جگہ مرکب یہ قرین قیاس نہیں۔ اِن متضاد بیانوں کے دو سبب ہیں۔ تسمیہ اسمار کا فریب دہ
نا اور فارسی اور سنسکرت میں جو حقیقی تعلق ہے اس کو تسلیم کرنے کے بعد بھی سنسکرت کے ذریعہ جو
نیتیں فارسی زبان کی معلوم ہوتی ہیں اُن کے اعتراف میں پس وپیش ہونا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی
الطہ کا امکان ہی نہ تھا۔ متحد المأخذ ہونے کی وجہ سے اس اساسی اُصول کے اعتراف سے مفر نہیں
فارسی کے لفظ جس صورت میں ملتے ہیں وہ سنسکرت کے لفظوں کی طرح مادوں سے بنائے گئے ہیں اور
تر لفظ اُن تینوں منزلوں میں سے جو ان مضامین کے شروع میں بیان کی جا چکی ہیں۔ دوسری منزل سے
گے نہیں بڑھتے۔ مثلاً اسپ کا مرادف سنسکرت میں اَشْوَ (अश्व) ہے۔ یہ مادہ۔ اَش (अश्
نا۔ بھرنا۔ جلد ہونا) میں لاحقہ۔ وَ (व) لگا کر بنایا گیا ہے اور چونکہ سنسکرت کا श्व (شْوَ) فارسی میں
زسپ سے بدل جاتا ہے۔ اس لئے فارسی میں اَشْوَ۔ کو اسپ کہتے ہیں۔ اب اگر کمند کو مرکب مانتے
ں تو اسپ کو بھی مرکب ماننا پڑے گا کیونکہ جو کام لاحقہ۔ ونت वत्   वन्तस = ونتس

سلسلہ کے لئے دیکھیئے "زمانہ" بابتہ ماہ جون ۱۹۳۵ء
وند کا ونت سے تعلق ضرور ہے لیکن مند سے اسے کوئی واسطہ نہیں جس کا اتحاد مت سے ہے۔ ملاحظہ ہو نوٹ نمبر ۱ ص ۲۰ "زمانہ" جون ۱۹۳۵ء
ملاحظہ ہو "زمانہ" بابت ماہ جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۳-۱۴

دیتا ہے وہی۔ و (व) بھی دیتا ہے یعنی دونوں فاعلیت کے معنی پیدا کرتے ہیں۔

عربی کی تقلید میں، قواعد فارسی اسم جامد کو معرفہ اور نکرہ دو قسموں میں تقسیم کرکے معرفہ کی چار قسمیں عَلَم۔ ضمیر۔ اشارہ اور موصول بتاتی ہے۔ پھر عَلَم کی بھی تقسیم کرتی ہے۔ قواعد سنسکرت اسم کی صرف تین ہی قسمیں مانتی ہے۔ اسم ذات جو کسی شے کو بتاتے ہیں۔ درویہ واچک (द्रव्यवाचक) اسم فاعل جو کسی کام کے کرنے والے کے بتاتے ہیں کرتر واچک (कर्तृ वाचक) اور ضمیر سرونام (सर्वनाम)۔ عربی کی موشگافی سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سنسکرت میں (مثلاً) کنیت کوئی چیز ہی نہیں۔ وہ بھی اس قسم کے اسم بناتی ہے۔ جیسے۔ مَنُ (मनु) سے مانَو (मानव مَنُ کی اولاد) جنھیں وہ پیترک पैतृक = ولدیت ظاہر کرنے والے) اسموں سے تعبیر کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جیسے عربی میں، ابن ماجہ۔ ابن خلدون بنائے گئے ہیں اسی طرح وہ بھی پُتر (पुत्र) یا سُت (सुत) لفظ کے آخر میں لگاتی ہے جو بالکل اِبن کا ترجمہ ہے جیسے برہم پُتر (ब्रह्मपुत्र) برہما کا لڑکا۔ پَون سُت (पवनसुत) ہنومان جی۔ غرض یہ کہ سنسکرت نے بال کی کھال نہیں کھینچی ہے فارسی کا قواعد نویس اس سے تو کیوں بحث کرنے لگا تھا کہ اسم ذات وغیرہ کیونکر بنے، لیکن فارسی چلی اسی راستے پر ہے جس پر کہ سنسکرت چلی ہے، اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ فارسی کے اسم سنسکرت کے اسموں کی طرح مادّوں سے نکلے ہیں۔ ذیل میں چند لفظوں کا ماخذ دکھایا جاتا ہے۔ یہاں فارسی کا لغات تو لکھا ہی نہیں جارہا کہ اس کے سارے اسموں کے ماخذ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور بتا بتا کر دعوے کو ثابت کیا جائے۔ چند اسموں کا تجزیہ و تحلیل کافی و وافی دلیل ہے۔

(۱) لاحقہ

	فارسی	سنسکرت	पद
अ	پے۔ پائے	पाद، पद	पद् = جانا۔ چلنا
	بار	भार	भृ = اُٹھانا
	گام	गाम	गम् = چلنا
	خرام	क्रम	क्रम् = چلنا
	خے۔ خوے (پسینہ)	स्वेद	स्विद् = پسینہ نکلنا
	نوید	निवेदन	नि + विद् = اچھی طرح جتانا
	سوگ (وار)	शोक	शुच = افسوس کرنا
	شرم	श्रम	श्रम् = افسوس کرنا

	لاحقہ	فارسی	سنسکرت	مادہ
(۱)		روز	रोच(+मान)	रुच् = چمکنا
		دیو	देव	दिव् = چمکنا
(۲)	अक[۱]	بندہ	वन्दक	वन्द् = پوجا یا تعریف کرنا
			बन्धक	बन्ध् = باندھنا
		تابہ	तापक	तप् = تپنا
		کوبہ	... .	कूप् = کمزور ہونا
(۳)	अन	(گل +) ستان	स्थान	स्था = ٹھہرنا۔ کھڑا ہونا
	نون ماقبل مفتوح	(شمع +) دان	धान	धा = رکھنا
		گریبان	ग्रीवा(+अन)	गृ = نگلنا
(۴)	आक	باک		भी = ڈرنا (؟)
	الف کاف ماقبل مفتوح	پاک		पू = پاک کرنا (؟)
(۵)	त اور ति ت اور تِ	بخت	भक्तिः, भक्त	भज् = بٹوارہ کرنا
		جفت (جوختی = زند)	युक्त	युज् = ملنا۔ جوڑنا
		سرشت	सृष्टि	सृज् = پیدا ہونا
(۶)	त्र تائے ساکن ورے	چتر	छत्र	छद् = ڈھانکنا
(۷)	न مفتوح ساکن (جو مونث میں ना (نا) ہوجاتا ہے۔	تشنہ	तृष्णा	तृष् = پیاس لگنا
		ستون	स्थूणा	स्था = کھڑا ہونا
(۸)	म (م)	بیم	भीम	भी = ڈرنا
		چشم		चक्ष् = دیکھنا
		شام	श्याम	शी = سونا

۱؎ چونکہ اس قسم کے لفظوں میں ہ دراصل ک کی بدل ہے اس لئے جب اس میں آن یا ی لگائی جاتی ہے تو ہ گ سے بدل جاتی ہے۔ بلکہ قدیم فارسی کی نسبت تو یہ کہنا چاہیئے کہ لفظ اپنی اصلی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ کم حوصلگی۔ بدمعاملگی قلعگی وغیرہ میں ہ کا گ سے بدلنا بالکل خلاف اصول ہے کیونکہ یہ عربی کے لفظ ہیں جن میں ہ دراصل عربی کی تائے مدوّر ہے جسے فارسی والے ہ پڑھتے ہیں۔ یہ کاف کی بدل نہیں ہے جو آن یا ی لگاتے وقت گ سے بدل دی جائے۔ مگر اس کے جواز کے لئے اہل زبان کا فتویٰ موجود ہے۔

لاحقہ	فارسی	سنسکرت	مادّہ
(۹) य (ی مذکر) या (یا مؤنث)	سایہ	छाया = छ्या	छद् = ڈھانکنا
	مایہ	माया	मा = ناپنا
	دایہ	धाया	धा = پیدا کرنا ۔ سہارا لگانا
	مے	मद्य	मद् = نشہ پینا ۔ خوش ہونا
(۱۰) व (و)	اسپ	अश्व	अश् = چلنا ۔ جلد ہونا
(۱۱) क (ک)	دخترک	(تحقیر) राजक (چھوٹا راجہ)	राजन् = راجہ
	مردک	(ٹٹو) " अश्वक	अश्व = گھوڑا
	زلوک	(زیادہ) पुनक	पुत्र = لڑکا
(۱۲) मि (م)	بوم	भूमि	भू = ہونا
	کرم (کیڑا)	कृमि	कृ =
(۱۳)[1] उ ساکن حرف آخر لفظ پر ضمہ بڑھانا	تن (جسم)	तनु	तन् = باریک ہونا ۔ تاننا
	دار (سُولی)	(لکڑی مجازاً سولی) दारु	दृ = پھاڑنا
(۱۴) तु (تُ)	جادو	यातु	या = غائب ہو جانا
(۱۵) तृ	پدر	पितृ	पा = بچانا
	مادر	मातृ	मा = بنانا ۔ پیدا کرنا
	برادر	भ्रातृ	भृ = مدد کرنا ۔ سہارا دینا

(۱۶) मत = मान = मन्तस فارسی میں صرف مَند کی صورت میں ملتا ہے ۔ تنومند ۔ برومند سے اسم فاعل ترکیبی میں بحث کی جا چکی ہے ۔ قواعد نویس کا خیال ہے کہ ان میں واو زیادہ ہے لیکن یہ زیادہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ उ ہے جو तनु سے فارسی نے گرا دیا تھا ۔ مند سے ترکیب کے وقت ظاہر ہو گیا ۔

مذکورہ بالا صاف صاف بتاتے ہیں کہ فارسی کے اسم جامد کیونکر بنے ۔

---

[1] یہ لاحقہ فارسی نے گرا دیا ہے ۔

آ کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

(از حضرت نجم الدین شکیب)

آ، کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے اپنی زندگی میں اک خلا پاتا ہوں میں
یاد کرتا ہوں تجھے جب اور جہاں جاتا ہوں میں
اِن بھری آبادیوں میں آہ تنہا سا ہوں میں
آ کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

مجھ کو اک دنیا سمجھتی ہے کہ میں دلشاد ہوں
خوش بھی ہوں، بیفکر بھی ہوں اور میں آباد ہوں
اِس طلسمِ رنگ و بُو کی قید سے آزاد ہوں
اپنی اس بے کیف آزادی سے گھبراتا ہوں میں
آ کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

چاندنی راتوں میں دریا کے کنارے کی بہار
جنگلوں میں سبزہ و گل کی جوانی کا نکھار
اور سنّاٹے میں دل ہارے پپیہے کی پکار
دیکھتا ہوں اور دل کو تھام رہ جاتا ہوں میں
آ کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

حُسن کی نیرنگیاں ہیں، مے بھی ہے، مینا بھی ہے
نوجوانی بھی ہے، ساون بھی ہے اور جھولا بھی ہے
زندگی کی ہر ادا سے عشق کا سودا بھی ہے
آہ سب کچھ ہے مگر پھر اک کمی پاتا ہوں میں
آ کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

گلستاں میں شاخِ گل پر بلبلِ رنگیں نوا
چھیڑتی ہے میٹھے میٹھے نغمہ ہائے جاں فزا
پتے پتے پر ہے طاری ایک عالم وجد کا
میں بھی سنتا ہوں، مگر سنتے ہی کھو جاتا ہوں میں
آہ، کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

پھونکے دیتی ہیں مرے دل کی مجھے چنگاریاں
بہ رہی ہیں آنکھ سے خونِ جگر کی ندیاں
کون ہے تو، اے مرے محبوب! رہتا ہے کہاں
تجھکو ان دیکھی فضا میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں میں
آہ، کہ اب تیرے بغیر اے دوست گھبراتا ہوں میں

جذباتِ میر

(از حضرت میر ولی اللہ صاحب)

آئے گی متاعِ دل و ایماں میرے کام آج
کہتے ہیں کہ لاتا ہے کوئی اُن کا پیام آج

تھا طورِ نگہ وادیِ حیرت سے بہت دور
آتی ہے نظر ساری مسافت دو سہ گام آج

بے باک نظر کے لئے بیتاب ہیں جلوے
ہے دیدۂ بینا کے لئے دعوتِ عام آج

وہ آئینگے میں خوش ہوں، زمیں خوش ہے، زماں خوش
کس ہاتھ میں ہے خانۂ دنیا کا نظام آج

روشن ہے ہر اک زاویۂ عالمِ تکویں
کس درجہ ضیا ریز ہے کیفیتِ جام آج

تھی صبح مری شامِ غریباں سے سیہ تر
ہے مشرقِ انوارِ تجلّی مری شام آج

خود پیشکشِ گرمیِ نظارہ نہوں گا
بیکار نہ جائے گا مرا پختہ و خام آج

ڈرتا ہوں ہنر دشمنیِ دورِ فلک سے
اُس تک نہ پہونچ جائے کہیں میرا کلام آج

اسرارِ ازل کھُل ہی گئے میر بالآخر
وہ پھیر تو دیتے مجھے بے نیل و مرام آج

بقا

(از مولوی محمد یحییٰ تنہا صاحب بی اے۔ ایل ایل بی)

شیخ بقاء اللہ نام اور بقا تخلص تھا، حافظ لطف اللہ خوشنویس کے فرزندِ ارجمند تھے وطن اکبرآباد تھا لیکن دلّی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی، بعدازاں لکھنؤ میں توطن اختیار کیا فنِ شعر سے حظِ کافی رکھتے تھے۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد تھے اور غمگین تخلص تھا۔ اردو میں شعر کہنے کے شوق نے شاہ حاتم کی خدمت میں پہونچا دیا۔ اور شاہ صاحب ہی نے بقا تخلص عنایت فرمایا۔ شاہ حاتم نے اپنے شاگردوں کی فہرست میں آپ کا نام بھی درج کیا ہے۔ لیکن فتح علی شاہ نے اپنے تذکرہ میں خود ان کی زبانی خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا شاگرد لکھا ہے، ممکن ہے دونوں بزرگوں سے استفادہ کیا ہو۔ بقا کی زندگی بہت بے لطف گزری۔ افلاس سے تنگ آکر تسخیر کواکب کے اعمال شروع کئے تھے لیکن سودائی ہو گئے۔ جب ہر طرف سے مایوسی نے آگھیرا تو ۱۲۰۶ھ میں عتبات عالیات کی زیارت کو چلے، رستہ میں موت نے اس ارمان کو بھی نہ نکلنے دیا۔ مصحفی نے آپ کو "جوانِ سراپا خلق و ظریف مزاج و قانع وش، طبع رخشش بطرف ہجو نیز مائل اُفتادہ" لکھا ہے۔ اور حکیم قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرہ میں یہ رقم فرمایا ہے کہ "رخشش شوخ طبعی و ظریف نہادی می پوید، بہ ہجو ہر کس بے محابا مبادرت می جوید۔ با سر آمدِ شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا و سخن سنجِ بے نظیر محمد تقی میر طرف شدہ تخطیہ نمودہ بہ ہجو الیشاں پرداختہ، سزائے کردارِ ناہنجارایں عزیزاں بواجبی در کنار نہادہ زبان زدِ خاص و عام ساختہ کہ مرزا بہ ہجو ہر کس بے ہیچ خیلے دلیر بودہ واز دستِ میر با ایں ہمہ قابلیت عنانِ جوہرِ قابل شناسی کبر و خودسریش در ربودہ ...."

آپ کا مختصر کلام ہماری نظر سے گذرا، جا بجا مضمون آفرینی اور پختگی پائی جاتی ہے۔ مصحفی نے ان الفاظ کے ساتھ آپ کے کلام کی داد دی ہے۔ "در شاہجہاں آباد یا میر و در لکھنؤ با مرزا رفیع معرکہ گیری ہا وقتِ طبع خود را ظاہر نمود۔" مجموعۂ نغز میں یہ الفاظ درج ہیں "اگرچہ گرد مضامین قدما میگردد اما بغایت درست فکر، خوشگو، شیریں گفتار، معانی جو است" لہٰذا ہم یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ آپ کا کلام ضرور اس قابل ہے کہ آپ کو دوسرے درجہ کے شعراء میں جگہ دی جائے جو شخص

میر اور سودا جیسے شاعرانِ پختہ کار سے نبرد آزما ہوسکے اور اپنی قابلیت و شاعری کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھائے اُس کے عمدہ شاعر ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ پھر جو کلام موجود ہے اُس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ شگفتہ گو اور رنگین طبع شاعر تھے۔ چنانچہ نواب شیفتہ گلشنِ بیخار میں رقم طراز ہیں" درمراتبِ نظم طبعے شگفتہ و رنگیں و طرزے بامزہ و شیریں داشتہ" بقا کا شعر ہے:۔

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے ہیں ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

میر صاحب نے خدا جانے سُن کر کہا یا توارد ہوا:۔

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

اِس پر بقا نے بگڑکر یہ قطعہ کہا:۔

میر نے گر ترا مضمون دوآبہ کا لیا اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کردے اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو

ایک اور موقع پر کہا ہے:۔

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر اور بستی نہیں یہ دلی ہے

میر و مرزا دونوں کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں:۔

میر و مرزا کی شعر خوانی نے بس کہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن ایک تُو تُو کہے ہے اِک ہی ہی

یعنی ایک ہجو کہتا ہے اور ایک مُخرِبیہ اشعار کہتا ہے۔ ایک اور قطعہ کہا ہے:۔

مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم مُلّا فنِ سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اب ہجووں کی ریسماں سے دونوں کو باندھ باہم مَیں نے کیا ہے پُورا

میر تقی میر کی نسبت فرماتے ہیں:۔

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر اِس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیواں پکارتے پھرئیے ہر گلی کوچے "کلام شاعر کا"

بقا کے کلام میں تشبیہات بھی خوب ہیں، فرماتے ہیں:۔

خالِ لب آفتِ جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا دام دانے میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

خواہش سود تھی سودے میں محبت کے ولے — سر بسر اس میں زیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

کچھ تعین نہیں اس راہ میں جوں ریگِ رواں — جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے

یہ رخِ یار نہیں زلفِ پریشاں کے تلے — ہے نہاں صبحِ وطن شامِ غریباں کے تلے

بعض اشعار میں مبالغہ بھی پایا جاتا ہے، مثلاً :-

اتنا ہوا ضعیف کہ میرے مزار پر — جو برگِ گل پڑا ہے سو چھاتی کا سل بنا

آج کل چھاتی کی سل کہتے ہیں۔ بعض قطعات بھی خوب ہیں، مثلاً :-

گر قتل کیا بقا کو خوباں — تو بات یہ منہ سے مت نکالو

پنہاں ہی بھلا ہے خونِ عاشق — جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

(دیگر)

شب فرقت میں یار کی ہر چند — در پئے نالہ و فغاں ہیں ہم

نالۂ بے اثر یہ کہتا ہے — مرغِ گم کردہ آشیاں ہیں ہم

الغرض آپ کا کلام ایک کشش رکھتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ گلِ رعنا، مجموعۂ نغز اور انتخاب حسرت موہانی میں مجموعۃً مشکل سے سو شعر ہماری نظر سے گزرے، اگر دیوان دیکھنے کا موقع مل جاتا تو ہم اپنی رائے اس سے کہیں بہتر ظاہر کرتے۔ بہر حال ذیل میں منتخب اشعار حوالۂ ذیل ہیں:-

ہم نفس کوئی نہ دیکھا بیکسی کے دن بقا — آشنا صورت مگر معنی میں وہ بیگانہ تھا

دستِ ناصح جو مرے جیب کو اس بار لگا — پھاڑوں ایسا کہ پھر اس میں نہ رہے تار لگا

پہنچی اس بت کو خبر نالۂ تنہائی کی — مدعی کون کھڑا تھا پسِ دیوار لگا

مرضِ عشق تمہارا تو یہ طوفاں ہے کہ میں — جس سے مذکور کیا اس کو یہ آزار لگا

جس کا ملاح بنا عشق وہ کشتی ڈوبی — اس کے کھیوے سے تو بیڑا نہ کوئی پار لگا

مرغِ زیرک تھے تہِ دام نہ آئے ہرگز — اڑ گئے ہم سرِ صیاد پہ منقار لگا

قضا نے حال کُل جب صفحۂ تقدیر پہ لکھا — مری دیوانگی کا ماجرا زنجیر پہ لکھا

کعبہ تو سنگ و خشت سے اے شیخ مل بنا — کچھ سنگ بچ رہا تھا سو عاشق کا دل بنا

ان آنکھوں کا نت گر یہ دستور تھا — دوآبہ جہاں میں یہ مشہور تھا

میں تو آیا تھا بقا باغ میں سن جوشِ بہار — پہ یہ ہنگامِ خزاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

اس کف میں دیکھ ساغرِ نازک شراب کا — دریا میں سرنگوں ہے پیالہ حباب کا

غم میں اُس زلف و رُخ کے ہم ہیہات | رات کو دن کیے ہیں دن کو رات

لاؤں جو شکوۂ شبِ ہجراں سخن کے بیچ | جوں شمع پھر زباں نہ سماوے دہن کے بیچ

اب جنوں یُمنِ قدم سے ترے اک آن کے بیچ | پڑ گئی لاگ مرے دست و گریبان کے بیچ

کھُب گئی چشم میں عجب سے کمرِ یار کی طرح | رگِ گل دل میں کھٹکتی ہے مرے خار کی طرح

گردوں پہ گیا دور میں اُس لب کے مسیحا | یعنی کہ اب اُس کا نہ رہا کام زمیں پر

رکھتا ہے یوں وہ زلفِ سیہ فام دوش پر | صیاد جس طرح سے رکھے دام دوش پر

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں | اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

ساقی کو دو نوید بہار آئی باغ میں | سودے نے پھر کیا ہے خلل سا دماغ میں

اے عشق تو ہر چند مرا دشمنِ جاں ہو | مرنے کا نہیں نام کا اپنے میں بقا ہوں

تجھ سے چشم سے امیدِ وفا جو رکھیں | چاہیئے اشک سے پہلے ہی وہ منہ دھو رکھیں

بلبل سے کہا گل نے کر ترک ملاقاتیں | غنچے نے گرہ باندھیں جو گل نے کہیں باتیں

آہیں افلاک میں رل جاتی ہیں | محنتیں خاک میں رل جاتی ہیں

عشق نے منصب لکھی جس دن مری تقدیر میں | داغ کی نقدی ملی صحرا ملا جاگیر میں

یہ گل اندام جو صرفے سے ٹک اک ناز کریں | کام لیں زلف سے کاکل کو بس انداز کریں

بیوفائی کا تو کیا ذکر ہے یا غیرِ وفا | پر تعجب نہیں گر تم کو گماں یہ بھی ہو

راہ تکتا ہے مرا لختِ جگر آنکھوں کی | گر وہ چل نکلے تو پیچھے سے رواں یہ بھی ہو

مجھ سے کب تک اس دلِ صد چاک کا پیوند ہو | اب یہ دیوانہ الٰہی خاک کا پیوند ہو

نہ دے زخمِ دلِ ناوک پہ حکم بخیۂ مژگاں کو | کہے کب سوزنِ عیسیٰ رفو گل کے گریباں کو

نہ ہووے حلق تر بیمار کا تیرے دمِ آخر | چھڑاوے خضر بھی گر منہ میں اُس کے آبِ حیواں کو

تو نے اس طرح سے اے چرخ گرایا ہم کو | کہ موئے پر بھی کسی نے نہ اُٹھایا ہم کو

رشکِ گلشن ہے ترے عکس سے یار آئینہ | تو یہ سمجھے ہے کہ ہے باغ و بہار آئینہ

پیوند ہوا رُخ سے ایسا خطِ جانانہ | تھا بارِ چمن گویا یہ سبزۂ بیگانہ

کیوں ہم جلوں کی راکھ دباتے ہو ہاتھ سے | آ جائے گا کوئی شررِ انگشت کے تلے

روتا ہے کیوں طبیب، مگر آج اپنی نبض | دیتی ہے مرگ کی خبر انگشت کے تلے

سپاہِ عشرت پہ فوجِ غم نے جو مل کے مرکب ہم اُٹھائے | اُدھر تو نالہ کا تاشہ کھڑکا ادھر فغاں نے علم اُٹھائے

سبب رقیبوں کے، بزم میں اب گئی وہ آپس کی ہم نشینی — ہم آن بیٹھے تو اٹھ گیا وہ، وہ آن بیٹھا تو ہم اُٹھ آئے
تہی کف آئے تھے ہم عدم سے چلے بھی یاں سے تو دست خالی — نہ توشہ واں سے یہاں تھا آیا نہ ساتھ یاں سے دام اُٹھائے
بقا جو راہی ہوئے عدم کے تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا — یہ راہ ہستی کی پُر خطر ہے چلو یہاں سے قدم اُٹھائے

جس کو کہتے ہیں مسافر جرسِ محمل ہے — محنتِ راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے
موج سے بیش نہیں ہستی و ہمی کی نمود — صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے
آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی — یہ یقیں جانیو اُس کو کہ مرا قاتل ہے

کیا کریں سینہ جو ناصح سے چھپاتے نہ پھریں — داغ سے داغ ہیں کچھ اپنے گریباں کے تلے
ہاں میاں سچ ہے تمھاری تو بلا ہی جانے — جو گزرتی ہے مرے دل پہ خدا ہی جانے
دل کی وا شد پہ عبث آہ نے کھینچی تکلیف — کھولنے عقدے تو غنچوں کے صبا ہی جانے
تیرے بیمار کو کب ہووے شفا جس کے طبیب — نہ تو کچھ درد کو پہچانے نہ دوا ہی جانے
دل سے نکلے کہیں پا بوسیِ قاتل کی ہوس — کاش وہ خوں کو مرے رنگِ حنا ہی جانے
پوچھ اس دل سے جو ہے کاٹ تری ابرو کا — جوہرِ برّشِ شمشیر سپاہی جانے

تھے ہم استادہ ترے در پہ وے بیٹھ گئے — تو نے چاہا تھا کہ ٹالے، نہ ٹلے، بیٹھ گئے
غیر بد وضع ہیں محفل سے شتاب اُن کی اُٹھو — پاس ایسوں کے تم اے جان بھلے بیٹھ گئے
ناتواں ہم ہوئے اتنے کہ تری محفل تک — در سے آتے ہوئے سو بار چلے بیٹھ گئے
گھر سے نکلا نہ تو اور منتظروں نے تیرے — در پہ نالے کئے اتنے کہ گلے بیٹھ گئے
اشک اور آہ کی شدت نہ مٹی گر چہ بقا — گھر کے گھر اس میں ہزاروں کے جلے بیٹھ گئے

اگر مشفق و مہرباں ہے تو تو ہے — بلائے دل، آشوبِ جاں ہے تو تو ہے
فلک پر چڑھا مجھ کو اے نشۂ مے — کہ اس بام کی نردباں ہے تو تو ہے
ندامت ہو لے داغ چھاتی سے میری — گئے دل کا اب اِک نشاں ہے تو تو ہے

یاد میں تڑپے ہے یہ کس ابروئے خمدار کی — آج کچھ ناخن بہ دل ہے آہ اس بیمار کی
آ کر بزیرِ مژگاں یوں دل کا لخت دم لے — جوں آن کر مسافر زیرِ درخت دم لے
چھوڑ کر آنسو کو لختِ دل گیا ہمراہ آہ — ناؤ خشکی میں چلی آبِ رواں بیکار ہے
قسم معصومِ دشتِ کربلا کی یہ وہ دورہ ہے — بقا گر مانگیئے پانی تو گزرے تیر گردن سے
عشق [illegible] ہے کس [illegible] — عاشق [illegible]

ہمسری مت صبا سے کرلے آہ!
تو نے بھی کچھ گرہ کشائی کی؟

ہوتا ہے شیشۂ دل چور اُس کی گفتگو سے
یارب یہ پندِ ناصح یا سنگِ محتسب ہے

دل سے وہ نگاہ بِیر گزری
پر شکر کہ جی کی خیر گزری

گریہ سے بعدِ مرگ یہ طوفان آب ہے
گنبد مرے مزار کا مثلِ حباب ہے

رُخ اُس کا صفائی ترے تلوے کی نہ پاوے
خورشید ہزار اپنے تئیں چرخ چڑھاوے

ماہِ نَو انجم کے عقدے کس طرح سے وا کرے
ہوں جہاں لاکھوں گرہ واں ایک ناخن کیا کرے

رُباعی

آوارۂ وادیِ طلب کو افلاک
ہر گاہ کریں جور و تعدی سے ہلاک

پیوندِ زمیں کر کے بھی آرام نہ دیں
بھر شیشۂ ساعت میں بھریں اُسکی خاک

دَورِ سیاست

(از حضرتِ احسان دانش کاندھلوی)

اے خوشا وقتیکہ روحوں میں حرارت آگئی
لیکے پیغامِ عمل بادِ سیاست آگئی

اہلِ نخوت میں سوا نیزے پہ اُترا آفتاب
سر پہ ہر ناپاک باطن کے قیامت آگئی

ہر عقیدے کی رگوں میں گرم ہے خونِ جہاد
مضمحل ایماں کے چہرے پر بشاشت آگئی

نرم کرنیں مشرقِ مِلت میں ہیں تنویر زن
رات کے تاریک ماتھے پر صباحت آگئی

میان میں سوتی ہوئی تیغوں نے لی انگڑائیاں
برچھیوں سے کھیلتی روحِ شجاعت آگئی

اب ملے گا ہر کس و ناکس کو اِک درسِ شعور
پیرہن پہنے صحافت کا صداقت آگئی

صاحبِ زر لرزہ بر اندام ہیں، مزدور شاد
اہلِ شر محسوس کرتے ہیں کہ شامت آگئی

اُٹھ رہی ہیں جلدی جلدی تیرگی کی چلمنیں
پرچمِ زرّیں لیئے صبحِ بغاوت آگئی

موت نے سمجھا دیا ہے زیرکوں کو رازِ زیست
تلخیوں میں زندگانی کی حلاوت آگئی

پنڈت جواہر لال سے خطاب

(از جناب سروش لائلپوری)

اے انتخابِ روزگار، اے جانِ نہرو خانداں
اے ناخدائے آرزو، اے نازشِ ہندوستاں

اے پیکرِ ایثار، خورشیدِ سپہرِ زندگی
اے مرکزِ حبِّ وطن، شیدائے جہدِ جاوداں

اے رہبرِ راہِ صفا، شمعِ شبستانِ وفا
اے نغمہ سنجِ حرّیت، دردآشنائے بیکساں

اے بندۂ حق آشنا، دانائے اسرارِ خودی
اے روحِ پیکارِ عمل، اخلاق آموزِ جہاں

اے خسروِ اقلیمِ دل، پیغمبرِ جمہوریت
اے مردِ میدانِ سیاست مصلحِ عظمت نشاں

اہلِ وطن کو غفلتوں کے خواب سے چونکائے جا
درماندہ حالوں کو کئے جا ارتقا کا راز داں

افسردہ روحوں تک پیامِ زندگی پہنچائے جا
سحرِ جمود و مرگ کا یکسر مٹائے جا نشاں

خونِ رگِ ملّت کو سوزِ قلب سے کھولائے جا
پیمانۂ جوشِ عمل چھلکائے جا ہر ایک آں

پھر ہند کو مہر و مروّت کا سبق سکھلائے جا
رنج و کدورت کا اُڑائے جا ہر اک دل سے نشاں

احساسِ ذلت سے دلِ ہندوستاں برمائے جا
طوقِ غلامی کو بنائے جا وبالِ دوشِ جاں

ہر عقدۂ دشوارِ قومِ ناتواں سلجھائے جا
عزم و تدبّر کی دکھائے جا کرشمہ کاریاں

بھارت میں ایمان و یقیں کی روشنی پھیلائے جل
کفر و جہالت کی کئے جا دور سب تاریکیاں

تہذیبِ مغرب کی حقیقت سے نقاب اُٹھائے جا
شیرازۂ باطل کئے جا منتشر ہر ایک آں

جورِ حکومت سے کبھی ہرگز ملال آگیں نہ ہو
فصلِ بہار آتی ہے گلشن میں پسِ دورِ خزاں

ظلم و تعصب کا شجر دنیا میں پھل سکتا نہیں
کاغذ کی ناؤ ہوتی ہے بس کوئی دم کی میہماں

حق و صداقت کے لئے ہی فتحِ کامل وقف ہے
لائے گی رنگ آخر تری سعیِ مسلسل بیگماں

عرشِ معلّےٰ سے سروش اِک دن یہ مژدہ لائیگا
"اے نہروِ عالی گُہر آزاد ہے ہندوستاں"

پھر ہند میں نورِ مسرت چارسُو لہرائے گا
فردوس کے چہرے پہ بھی آبِ ندامت آئے گا

ہماری تعلیم

اُس کا ماضی اور مستقبل

(از مسٹر پرشوتم لال چودھری، ایم۔ اے)

زمانۂ ماضی کی شمع سے مستقبل کا چراغ روشن ہوتا ہے، تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ہمارا ماضی شاندار تھا۔ حال خستہ ہے۔ مستقبل بھی ماضی کی طرح شاندار ہو۔ اِس وقت ہمارے ملک کے ہر فرد بشر کی یہی دلی خواہش ہے۔ ہمارے رہبر اعظم مہاتما گاندھی کی تعلیمی اسکیم مُلک کے سامنے ہے، ماہران و مُدبّران اس پر کافی غور کر رہے ہیں، چند صوبوں میں عملی طور پر بھی اس اسکیم کی آزمائش کی جا رہی ہے۔ تاہم اب تک اہل الرائے اصحاب کا ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو اس اسکیم کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایسے اصحاب کو چاہیئے کہ ہندوستان کے گذشتہ زمانہ پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں پھر مہاتماجی کی اسکیم کی اہمیت یقیناً اُن کے ذہن نشین ہو جائیگی۔

سب سے پہلے اُس زمانہ پر نظر ڈالئے جب ہندوستان میں ہندوؤں کا دور دورہ تھا۔ اُس زمانہ کو ہم تین حصّوں میں منقسم کر سکتے ہیں، ویدک زمانہ، بدھ مذہب کے عروج کا زمانہ، اور آخری ہندو راجاؤں کا عہد، جس میں بنگال کے سین و پال خاندان کے حکمران اور راجہ ہرش وردھن شامل ہیں۔ ویدک زمانہ میں ہندوستان کی تعلیمی حالت بہترین تھی۔ چاروں وید، برہمن۔ سوتر اُپنشد، ارنیکا وغیرہ اسی زمانے کی مشہور تصانیف ہیں۔ کانٹ اور افلاطون جیسے مشہور عالم فلاسفروں کی تصانیف انھیں کتابوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ویدوں اور اُپنشدوں کی فلاسفی اس قدر گہری ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بدھ مذہب کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کی تعلیم نے اور بہت سے میدانوں میں قدم بڑھایا۔ مہاراجہ اشوک کے زمانے میں سولہ فنون رائج تھے، علم طب، فن مصوری و سنگ تراشی کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر دی جایا کرتی تھی۔ حیوانات کے لئے ہسپتال کھُلے ہوئے تھے۔ ڈرامہ۔ نظم، افسانہ وغیرہ میں بڑے بڑے نامور عالم یہاں موجود تھے۔ کالیداس کا نام کبھی نظر انداز نہیں ہو سکتا ہے آریہ بھٹ و بدراہ میہر نے علم ریاضی کو جو فروغ دیا اس کا ذکر تاریخ میں ہمیشہ امر رہیگا۔

فنِ تعمیر و علم موسیقی کے شائقین سمدر گپت اور ہرش وردھن جیسے مہاراجہ ہوئے قنوج۔ بنارس اور پشاور اُس زمانے کے بڑے مشہور تعلیمی مرکز تھے۔ اسی عہد میں شنکر اچاریہ اور بھوبھوتی جیسے عالم پیدا ہوئے۔ بہار میں نالندہ یونیورسٹی کی شہرت دور دراز مقامات تک پھیلی ہوئی تھی۔ راجہ دھرمپال نے وکرم شیل نامی یونیورسٹی قائم کی تھی، جس میں ایک سو سات مندر اور چھ کالج تھے۔ سین خاندان کے راجاؤں نے بنگال میں نودیپ نامی یونیورسٹی قائم کی تھی۔ اسی زمانہ میں ویدانت ستوتر۔ بھگوت گیتا، اور الجبرا، جیومیٹری پر پنڈت بھاسکر کی تصانیف شائع ہوئیں۔ غرض ہندو راجاؤں کا زمانہ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔

تعلیم کو جو ترقی اس زمانے میں ہوئی اس کے بعد کبھی نہیں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے کھلے ہوئے میدانوں اور جنگلوں میں اسکول لگا کرتے تھے۔ ضرورت پر یا موسم کے لحاظ سے اسکول کسی سایہ یا سائبان کے نیچے بھی لگائے جاتے تھے۔ اُستاد کی امداد کے لئے بڑے لڑکے چھوٹے لڑکوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ اسی رواج کی تقلید میں مسٹر اینڈریو بیل نے انگلینڈ میں مانیٹوریل سسٹم جاری کیا ہر ایک طالب علم کے لئے عملی فنون کا سیکھنا لازمی تھا۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم خاص و عام کے لئے نہیں تھی وہ صرف اُن طلباء کے لئے مخصوص تھی جو قابلیت کے لحاظ سے اوروں پر ترجیح دیئے جانے کے مستحق تھے۔ ان کو مختلف مضامین کے ماہران کے پاس جانا پڑتا تھا۔ اکثر بیس اکیس ماہران تعلیم ایک ہی جگہ رہا کرتے تھے۔ ان کی مجلس کو پریشد کہتے تھے، جس کا تمام خرچ راجہ و دیگر فیاض طبع متمول اصحاب برداشت کیا کرتے تھے۔ تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ لڑکوں کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا بھی معقول انتظام تھا۔ تمام مصارف مُلک کے امراء و رؤسا برداشت کیا کرتے تھے۔ طلباء کو حصولِ تعلیم کے لئے بارہ سے اڑتالیس برس تک اپنے گرو کے پاس رہنا پڑتا تھا، اُن کی زندگی پاک اور بلند بنائی جاتی تھی، عطر و تیل کے استعمال، تاش وغیرہ کے کھیل۔ مستورات کی صحبت، منشیات و مسالہ جات وغیرہ دنیوی لذات سے اُن کو پرہیز کرنا پڑتا تھا۔ صبح و شام ہون و سندھیا کے موقع پر اُن کی حاضری لازمی تھی۔ تعلیمی فضا کو پراگندہ کرنے والے طلباء کو رسّی یا بانس کے ڈنڈوں سے جسمانی سزا بھی دی جاتی تھی۔ جگہ جگہ تعلیمی مرکز قائم تھے۔ تعلیم محض دماغی ہی نہیں بلکہ اخلاقی اور عملی بھی ہوا کرتی تھی۔ نوجوانوں کی تربیت میں مذہبی جسمانی اور اخلاقی تعلیم کا حصہ ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا تھا کہ طالب علم کو صرف دماغی نشو و نما ہی حاصل نہ ہو بلکہ اُن کی قوت ارادی بھی مضبوط ہو۔ مختصراً یہ کہ طالب علم کی قوتِ ارادی کو مضبوط کرنا پچھلے زمانہ کی

تعلیم کا ایک خاص مقصد تھا۔ وتساین رشی نے اپنے کام سوتر میں چونسٹھ کلاؤں کا ذکر کیا ہے جو اُس وقت ہندوستان میں عام طور پر جاری تھیں۔ اُن میں سے خفیہ زبان کی خط و کتابت، پہیلیوں کا حل، پھولوں کے زیورات اور نقلی پھول بنانا اور ایسے ہی بہت سے فنون کے نام درج ہیں۔

۱۲۰۶ء سے ۱۷۶۴ء تک ہندوستان میں مسلمانوں کا دور دورہ رہا۔ ان بادشاہوں کا سلوک اس بارے میں تسلی بخش نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ یہ تمام تعلیمی مرکز نیست و نابود ہو گئے۔ جہالت کی تاریکی چاروں طرف چھا گئی۔ مگر اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ہمارے یہاں وِدیاپتی، چنڈی داس، میرا بائی جیسی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں۔ سترھویں صدی میں اورنگزیب نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے تمام ہندو علماء و ماہرانِ فنون کو اپنے دربار سے خارج کر دیا۔ اس حکم نے ہندوستان میں تعلیم کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا۔

اہل برطانیہ کی آمد سے ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۱۳ء تک تو کسی انگریز حکمراں نے اِس طرف توجہ نہیں کی۔ مسیحی پادری البتہ اپنا وعظ انگریزی زبان میں دیا کرتے تھے۔ جب اُن کو اس کام میں دقت محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ ہندوستان کے باشندے انگریزی زبان سے واقف نہ تھے۔ اور پادریوں کے لئے یہاں کی زبانوں کا سیکھنا امر محال تھا۔ تو پادری ولیم کیرے اور اُن کے رفقاء نے ۱۸۱۳ء میں کمپنی کو برطانوی سرکار کی مدد سے ہندوستان میں تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ایک لاکھ روپیہ خرچ کرنے پر آمادہ کیا۔ ۱۸۳۵ء میں راجہ رام موہن رائے اور ڈیوڈ ہیر کی کوششوں سے انگریزی تعلیم جاری کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کی زیر نگرانی ہندو کالج کھولا گیا۔ مگر اس سے قبل ہی الگزینڈر ڈف وغیرہ اصحاب کی کوششوں سے بنگال و مدراس و بمبئی میں عیسائی مشن کی طرف سے کالج قائم ہو چکے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے پبلک تعلیمی کمیٹی (جو ۱۸۳۳ء کے پاس شدہ انڈیا ایکٹ کی رو سے قائم کی گئی تھی) کے پہلے صدر ہو کر ہندوستان آئے۔ انھوں نے اس پر جو مشہور نوٹ لکھا ہے وہ ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اُنھوں نے برٹش گورنمنٹ کا یہ مقصد قرار دیا کہ ہندوستان میں مغربی علم و ادب و سائینس کی ترقی و تکمیل کے لئے جس قدر بھی روپیہ مہیا ہو سکے اُس کا بہترین استعمال صرف انگریزی تعلیم ہی پر کیا جائے۔ اس نوٹ کے بعد ہندوستان میں تعلیم کے متعلق حکومت برطانیہ کا نقطۂ نگاہ تبدیل ہو گیا۔ اور تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان قرار دی گئی، عدالتی زبان بھی انگریزی مقرر ہوئی۔ سرکاری ملازمت کے لئے انگریزی کی واقفیت لازمی کر دی گئی، اعلیٰ تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ بہت سے ہائی اسکول و کالج کھولے گئے مگر ابتدائی

تعلیم کو نظرانداز کیا گیا۔ خیال یہ تھا کہ اونچی تعلیم کی اشاعت سے ابتدائی تعلیم میں خود بخود ترقی ہو گی۔

۱۸۵۴ء میں اس پالیسی میں کچھ تبدیلی کی گئی۔ چارلس وُوڈ نے اپنے ایک نوٹ میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ پرائمری اسکولوں کی تعداد بڑھائی جائے اور ایک محکمہ قائم کیا جائے جس کے ذریعہ اسکولوں کو مالی امداد دی جائے۔ ملک میں یونیورسٹیاں بھی قائم کی گئیں۔ ۱۸۸۲ء میں لارڈ رِپن کی حکومت نے مسٹر وُوڈ کے مذکورہ بالا نوٹ کو عملی جامہ پہنایا۔ اعلیٰ تعلیم ملک کے دولتمند لوگوں کے ذمہ کر دی گئی۔ البتہ گورنمنٹ نے کچھ مالی امداد دینے کا وعدہ کیا اور ابتدائی تعلیم کو فروغ دیا گیا۔

۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی اور دو سال بعد ایک یونیورسٹی ایکٹ پاس کیا۔ اس کی رو سے یونیورسٹی سینیٹ کے اسّی فیصدی ممبران سرکار نامزد کرتی تھی۔ ہر منظور شدہ اسکول و کالج کو طلباء سے مقررہ فیس لینا پڑتی تھی، رعایتی طلبا بہت کم ہوتے تھے، اور اُن کی انتہائی تعداد مقرر کر دی گئی تھی۔ یونیورسٹی کا چانسلر گورنر مقرر کیا گیا۔ جو اسکول و کالج اِن دفعات کی پابندی نہ کرتے تھے اُن کے طلباء امتحانات میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اُسی سال مسز بیسنٹ نے یہ شکایت کی کہ اِس ایکٹ کے ماتحت مدراس یونیورسٹی نے نوّے فیصدی طلباء کو میٹریکیولیشن کے امتحان میں اور بہتّر فیصدی طلباء کو انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شریک ہونے سے روک دیا۔ اِس قانون سے ملک میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ لارڈ کرزن کی حکومت پر شدید نکتہ چینی کی گئی۔ اور یہ خیال مضبوط ہو گیا کہ حکومت برطانیہ انگریزی تعلیم کو اس لئے ترقی نہیں دینا چاہتی کہ اس کی بدولت ہندوستان کے باشندوں کو اپنی گری ہوئی حالت کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۱۱ء میں مسٹر گوپال کرشن گوکھلے نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں لازمی پرائمری تعلیم کا بل پیش کیا، مگر گورنمنٹ نے مضحکہ انگیز وجوہات کی بنا پر اُس کو نامنظور کر دیا۔ ۱۹۱۶ء میں مسٹر وی جے پٹیل نے بھی اسی قسم کا ایک مسودۂ قانون بمبئی کونسل میں پیش کیا، جس کے ذریعہ وہ صوبے کی مشہور میونسپلٹیوں کو جبریہ ابتدائی تعلیم جاری کرنے کا اختیار دینا چاہتے تھے۔ مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا۔

جنگ عظیم کے بعد یعنی ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کے عرصہ میں حکومت کے کچھ صوبوں نے اپنے ماتحت میونسپلٹیوں کو ابتدائی تعلیم جاری کرنے کا اختیار دیا۔ یہ محکمہ صوبہ کے ایک وزیر کی زیر نگرانی کام کرتا تھا مگر اِس مد میں خرچ کے لئے جو روپیہ دیا جاتا ہے وہ محکمہ آبکاری کی آمدنی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تعلیم کی ترقی ہو تو منشّیات کا استعمال بھی عام ہو۔ اس کے بعد تعلیم کا مسئلہ حل کرنے کے لئے

کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔

امسال سات صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے برسراقتدار ہوجانے کے بعد مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ پھر ملک کی توجہ اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کی ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ مہاتما جی نے ملک کو جو مشورہ دیا ہے وہ نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ اس اسکیم کا بنیادی اصول وہی ہے جو ہندوؤں کے زمانہ میں رائج تھا یعنی تعلیم مفت اور لازمی ہو اور اس کا بار والدین پر نہ پڑے۔ دستکاری کی تعلیم حاصل کرکے طلبار خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔ اس اسکیم کی تفصیلات طے کرنا ذاکر حسین کمیٹی کے سپرد کردیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کمیٹی نے اس اسکیم کی مکمل خانہ پُری کرکے اُس کو کم خرچ اور بالانشین بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی تفصیلات پر غور کرتے وقت طلبار کی جسمانی و مذہبی تعلیم کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ دستکاری کی تعلیم سے جسمانی تعلیم کی کمی پوری نہیں ہوسکتی۔ یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔ ساتھ ہی مذہبی تعلیم بھی ضروری ہے۔ ہندوستان میں بے شمار مذاہب کے ہوتے ہوئے بھی طلبار کو کچھ ایسے عام مذہبی اصول کی تعلیم دیا جانا ضروری ہے جو انھیں رواداری و شرافت کا سبق سکھائیں۔ مہاتما جی کی اسکیم کا وہ حصہ سب سے زیادہ ناموزوں سمجھا جاتا ہے جس میں اُنھوں نے اعلیٰ تعلیم کا دارومدار امرا و رؤسا کی فیاضی پر رکھا ہے۔ اس مسئلہ پر ماہران تعلیم میں سخت اختلاف رائے ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ زمانہ میں جس قدر ضرورت ابتدائی تعلیم کی ہے اُتنی اعلیٰ تعلیم کی نہیں۔ اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا فروغ ملک کے امیر و متموّل اصحاب کے ذمّہ کردیا جائے۔ مگر حسب ضرورت گورنمنٹ کی طرف سے بھی معقول مالی امداد دی جائے۔ اُستادوں کی موجودہ تنخواہوں میں مزید کمی کی گنجایش ہے یا نہیں؟ اس بات پر بھی اختلاف رائے ہے۔ تاہم اگر تعلیم کا پُرانا طریقہ ہی رائج کرنا ہے تو حکومت کو چاہیئے کہ استادوں کی خاص خاص خانگی ضروریات کا بار خود برداشت کرے جس سے وہ پیٹ کے دھندے سے نجات پاکر قومی تعلیم کے تعمیری کام میں بے فکری اور سرگرمی سے حصّہ لے سکیں تعلیم نسواں کا سوال بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سوال لڑکوں کی تعلیم سے بھی زیادہ اہم و نازک ہے لیکن یہ بات ماننا پڑے گی کہ ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم انگریزی لڑکیوں کی تعلیم سے قطعی جداگانہ ہونا چاہیئے۔ انھیں سب باتوں کا خیال رکھکر اگر اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مقبول عام نہ ہو، اور ملک کا ہر فرد و بشر اس نیک کام میں ہاتھ بٹانے کی کوشش نہ کرے۔ بہرکیف وہ دن مُبارک ہوگا جب ملک جنگ آزادی کے زمانہ میں اس اسکیم کی اہمیت کا اندازہ کرکے اپنے مستقبل کے چراغ کو گجرات کی اس شمع سے دوبارہ روشن کرنیکی کوشش کریگا۔

صبحِ انتظار

(از منشی گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری، بی، اے، ایل ایل، بی۔ وکیل)

سمٹ چکا ہے اندھیرا سارا، سیاہیِ شب بدل رہی ہے
اُفق پہ سونا برس رہا ہے، فلک پہ چاندی پگھل رہی ہے

نسیم آتی ہے مست و بیخود، فضا سے اٹکھیلیاں سی کرتی
ہر ایک گُل کو ہنساتی جاتی، ہر ایک غنچے کا رو پھرتی

سپیدیِ صبح نے ہر اک شَے کو نقرئی سا بنا دیا ہے
خزانہ فطرت کے پاس جتنا تھا، گویا سارا لُٹا دیا ہے

فلک پہ وہ سبز پتیوں میں کسی کا جلوہ مچل رہا ہے
اُفق پہ مشرق کی سمت گردوں تمام سونا اُگل رہا ہے

سنہری کرنوں نے زرد پھولوں کے حُسن کو جگمگا دیا ہے
بساطِ خاکی کے ذرّے ذرّے کو مہرِ تاباں بنا دیا ہے

چہک رہی ہیں، پھدک رہے ہیں، پرندے سب چہچہا رہے ہیں
خوشی میں بھولے ہیں اپنی ہستی کہ مست ہیں اور گا رہے ہیں

تمام عالم چمک رہا ہے، چمک رہا ہے دمک رہا ہے
مگر مرے دل میں شعلۂ غم بھڑک رہا تھا، بھڑک رہا ہے

تمام عالم پہ نُور چھایا، تمام عالم میں نور برسا
مری نظر میں جو تم نہیں ہو تو مجکو ہر سمت ہے اندھیرا

بہار میں بھی جو مجھکو فرحت جنوں نہیں ہے، تو کچھ نہیں ہے
جو تم نہیں ہو سکوں نہیں ہے، سکوں نہیں ہے، تو کچھ نہیں ہے،

قطعہ

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سُنایا
یہ شعرِ نشاط آور و پُرسوز و طربناک

مَیں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

اقبال

زمینداری کی قدامت

(از بابو راج بہادر صاحب لمگوڑہ، ایم۔ اے، ایل ایل بی)

صوبۂ متحدہ کے سرکاری وزیر جناب رفیع احمد قدوائی صاحب کو بھی جو لگان د مالگذاری کے محکموں کے انچارج اور خود ایک زمیندار پیشہ خاندان کے رکن ہیں، زمینداری کی تاریخی قدامت کے بارہ میں بہت کچھ شک وشبہ ہے۔ سطور ذیل میں ہم کوشش کریں گے کہ ویدوں کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک زمینداری کے متعلق تاریخی حالات ناظرین زمانہ کے روبرو پیش کریں تاکہ کم سے کم یہ دھوکا نہ رہے کہ زمینداری کا طریقہ صرف انگریزی راج کی اُپج ہے۔

ویدوں میں دیہی انتظامات کے متعلق "مکھیہ" کا لفظ بار بار ملتا ہے۔ اُس وقت کی کوئی تاریخی کتاب مجھے نہیں ملی مگر اس لفظ نے آپ ہی سارا بھید کھول دیا۔ اب بھی "نمبردار" کا لفظ جو فارسی زبان کے نام بردار سے بگڑ کر بنا ہوا لفظ ہے، قریب قریب وہی معنی ظاہر کرتا ہے۔ کسانوں میں بھی "مقدم" "(مکھیہ) چُننے کا رواج بہت سے مقاموں پر اسلامی زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ خود "مکھیا" لفظ بھی "مکھیہ" ہی کا بدلا ہوا رُوپ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اب اُس کا استعمال صرف فوجداری انتظامات کے تعلق سے باقی رہ گیا ہے۔ پھر بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ اب بھی جہاں تک ہوسکتا ہے وہ مکھیا گانوں کے رہنے والے زمینداروں ہی میں سے خود اُنھیں کے ہاتھوں چُنا جاتا ہے جیسا کہ قانون فوجداری کے قاعدوں سے ظاہر ہے۔ مجھے تو نمبردار، مقدم اور مکھیا یہ تینوں اُسی ویدوں والے مکھیہ لفظ کے حصے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

واقعی تاریخ تو ہمیں براہمن نامی مقدس کتب (ویدوں کی تفسیر وتشریح) کے زمانہ سے ملتی ہے جسے میں پروفیسر رام دیو (گورو کُل کانگڑی) کی تاریخ کی بنا پر آج عوام کے روبرو پیش کر رہا ہوں یاد رہے کہ یہ تاریخ کسی زمیندار کی لکھی ہوئی نہیں، بلکہ ایک ایسے غیر جانبدار شخص کی لکھی ہوئی ہے جس کی بے لوثی اور حُبّ وطن میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ موصوف اپنی "بھارت ورش کا اتہاس" نامی کتاب کی [illegible]

حصّہ دینا پڑتا تھا۔ پھر صفحہ ۱۶۵ و صفحہ ۱۶۷ پر اُنھوں نے دیہات اور شہروں کے سنگٹھن کی بڑی ہی دلچسپ صراحت کی ہے۔ لکھا ہے کہ اُس زمانہ کے گانوں اور شہر بہت منظم معلوم ہوتے ہیں۔ شہروں میں زیادہ تر حکمران اور تجارتی طبقہ کے لوگ راجاؤں کے قلعوں کی پناہ میں رہتے تھے اور کسان طبقہ کی بود و باش دیہاتوں میں تھی۔ چونکہ "براہمن گرنتھ" سماجی قاعدوں کی کتابیں نہیں بلکہ ویدوں کی تفسیریں ہیں، پس موضوع بہت واضح نہیں ہے مگر سمرتیوں میں تو بہت صاف ذکر ہے۔

منو سمرتی کے ساتویں ادھیائے میں بہت ہی صاف بیان ہے۔ وہاں راجہ کو کسان کے اُپج کا چھٹا، آٹھواں اور بارھواں حصّہ لینے کا حق دیا گیا ہے۔ اور زمیندار کے لئے بہت صاف طور پر "گرام آدھی پت" (گانوں کا مالک) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ درختوں، شہد، گھی، خوشبو کی چیزیں، دوائیں، رس، جڑ، پھل، پتّے، ساگ، تن، چمڑا، بانس، بید کا بنا ہوا سامان، مٹی کے برتن اور پتھر کی اشیاء کی بکری سے جو منافع ہو اُس کا چھٹا حصّہ وصول کر لینے کا اختیار ہے۔ ندی کی اُترائی لینے کا بھی ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی کم ہوتی تھی اور جنگلات کے محکمے زیادہ تھے۔ اس لئے اس فہرست میں ان سارے محاصل کا ذکر ہے جو آج بھی سائر وغیرہ کے نام سے لئے جاتے ہیں۔ اِسی سمرتی میں اول اوّل زمیندارانہ حقوق میں کاشت کے لئے بلا لگانی زمین کے ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ کیا ہم اسے سیر کا ابتدائی زمانہ نہیں کہہ سکتے؟

مہابھارت اور بُدھ زمانوں کے درمیانی وقفہ میں پہونچکر تو یہ بات بہت ہی صاف ہو جاتی ہے۔ ہمارے لائق مؤرخ نے شکرنیتی نامی کتاب کی بنا پر اپنی تاریخ جلد دویم کے صفحہ ۱۹۵ و صفحہ ۱۹۶ پر بہت صاف لکھا ہے کہ آراضی کے محاصل کی شرح اراضی کی پیداوار کے مطابق مختلف ہونی چاہیئے۔ شکرنیتی کے اقتباسات بھی نٹ نوٹ کی شکل میں دیدیئے گئے ہیں، اور لکھا ہے کہ "اُن زمینوں پر جو تالاب، نہر، کنواں، برکھا، یا ندی سے سینچی جاتی ہیں، اُن کی اُپج کے مطابق آدھا، تہائی یا چوتھائی محصول لگانا چاہیئے۔ جو زمین اوسر یا بنجر ہو اُس کی اُپج کا چھٹا حصّہ ہی لینا چاہیئے۔"

"اراضی کا یہ محصول ہر کاشتکار سے الگ الگ نہیں لیا جاتا تھا، بلکہ گانوں بھر کی زمین کا محصول ایک ہی دولتمند شخص سے وصول کر لیا جاتا تھا۔ محاصل کی ساری ذمہ داری اُسی شخص پر ہوتی تھی اور کسان لوگ اُسی کو اپنے اپنے لگان کا حصّہ دیدیا کرتے تھے۔" پھر قابل مؤرخ نے شکرنیتی کا ترجمہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "محاصل کے طے ہو جانے پر اُسے پورا کا پورا گانوں کے ایک دھنی آدمی سے لے لینا چاہیئے یا گانوں کے کسی ایک آدمی کو ضامن بنا کر اُس سے ایک مقررہ مدّت کے بعد لگان لینے

رہنا چاہیئے۔" شکرنیتی میں زمیندار کے لئے "دھنک" (دولتمند) کا لفظ مستعمل ہوا ہے، اور باتیں منوسمرتی ہی کے وقت کی معلوم ہوتی ہیں۔

لگان وصول کرنے والے تنخواہ دار ملازم الگ تھے جن کی تنخواہ کے متعلق شکرنیتی میں لکھا ہے کہ اُن کا مشاہرہ وصول کئے ہوئے لگان کا ۱/۶، ۱/۸، ۱/۱۰، ۱/۱۲ یا ۱/۱۶ ہوتا تھا۔ شری پرکاش صاحب ٹھیک لکھتے ہیں کہ زمینداری اور چیز ہے اور مشاہرہ والی تحصیلداری یا کلکٹری اور چیز۔ ہمیں تو شکرنیتی اور آج کے زمانہ میں فرق یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب تنخواہیں بڑی بڑی اور نقد روپے میں ہیں کسی بھی زراعتی ملک میں زیادہ نقد تنخواہوں کا ہونا اُس کے لئے بہت سے دُکھوں کا سبب بنتا ہے، کیونکہ ہمارے ملک میں تو سدا ہی پیسہ کی کمی رہتی ہے۔ تاریخ مذکور کے صفحہ ۲۰ پر شکرنیتی کا ترجمہ یوں دیا ہوا ہے:-

"سرکار کو کسانوں کی آمدنی دیکھکر ہی اُن پر لگان لگانا چاہیئے۔"

"راجہ کو زمینداروں سے لگان اس طرح لینا چاہیئے جیسے مالی پیڑوں سے پھول توڑتا ہے تاکہ زمینداروں کا ناش نہو، لگان کوئلے کے بیوپاریوں کی طرح نہ لینا چاہیئے۔"

اب مؤرخ اپنے الفاظ میں یوں لکھتا ہے:-

"کوئلے کے بیوپاری کوئلہ بنانے کے لئے لکڑی کو جلا کر اُس کا ناش کر دیتے ہیں، مگر مالی ہمیشہ پھولوں کو اِس طرح چُنتا ہے کہ اُس سے درخت کو کسی طرح نقصان نہ پہونچے۔ لگان جمع کرنے کی یہ تشبیہ اس قدر عمدہ ہے کہ شہنشاہ اکبر کے وزیر ابوالفضل نے اسے اپنی آئین اکبری میں درج کیا ہے، بقول شکراچاریہ جی اُس وقت رعیت داری نہیں بلکہ زمینداری کے رواج کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ زمیندار خود کسان ہیں۔ وہ جتنی زمین پر کاشت کرتے ہیں اُس پر اُن کا آزادانہ حق ہے۔"

مغل حکومت کے زمانہ سے آج تک کے تاریخی حالات اتنے مشہور ہیں کہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرے مکان میں خود اُس وقت کے شاہی پروانے موجود ہیں جن میں "مالگذار" اور "تعلقہ" کے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ کیا مذکورہ بالا صراحت سے یہ واضح نہیں ہو گیا کہ زمینداری سسٹم کسی نہ کسی صورت میں بہت قدیم ہے اور جب سے یہ رواج ہے اُسی وقت سے زمینداروں کو سیر کرنے کا حق ہے؟

---

*

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

علامہ اقبال کے آبا و اجداد کشمیری پنڈت سپرو خاندان کے رُکن تھے، مگر دو تین سو سال ہوئے وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے ایک شعر میں اُسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی　　برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

آپ کا خاندان خوشحال، فقیر دوست اور تصوف پسند تھا، اور یہ تمام باتیں آپ کو ورثہ میں ملی تھیں۔

آپ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں پہلے مکتب میں بیٹھے پھر مدرسہ میں داخل ہوئے اور پانچویں جماعت کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ اسی طرح مڈل، اور انٹرنس کے امتحانات بھی وظیفہ کیساتھ پاس کر کے، اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہو کر ایف۔ اے پاس کیا۔ بعدہٗ گورنمنٹ کالج سے فلسفہ و حکمت، انگریزی و عربی میں امتیاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ جس کے صلہ میں دو طلائی تمغے انعام اور وظیفہ بھی ملا۔ عربی و فارسی کی تکمیل آپ نے شمس العلماء مولوی سید میر حسن مرحوم سے کی تھی، اور چونکہ فلسفہ و حکمت سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لئے پروفیسر آرنلڈ کے زیر ہدایت اس کی بھی تکمیل کرتے رہے۔ اور ایم۔ اے کی ڈگری بھی امتیاز خاص کے ساتھ لی اور اُسکے صلہ میں بھی آپ کو تمغہ ملا۔ جس کے بعد آپ اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ و اقتصادیات کے لکچرار مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد گورنمنٹ کالج میں فلسفہ و انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانہ میں آپ نے ایک کتاب "علم الاقتصادؔ[1]" کے نام سے اُردو میں تصنیف فرمائی۔

یورپ کا سفر | چونکہ تحقیق و مطالعہ کتب کا شوق آپ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اس لئے آپکی طبیعت ہمیشہ مزید قابلیت حاصل کرنے کے لئے بیقرار رہتی تھی۔ چنانچہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر مزید تکمیل تعلیم کے ارادہ سے آپ ۱۹۰۵ء میں انگلستان تشریف لے گئے، اور تین سال تک کیمبرج یونیورسٹی میں رہ کر فلسفہ و اخلاق کا مزید مطالعہ کر کے فضیلت کی ڈگری حاصل کی۔ جس کے بعد آپ جرمنی تشریف لے گئے۔ جہاں "فلسفۂ ایران" پر ایک تحقیقی مضمون لکھ کر میونخ یونیورسٹی سے "ڈاکٹر آف فلاسفی" کی فرسٹ کلاس ڈگری لی۔ یہ مضمون فصیح و بلیغ انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اور لندن میں شائع

[1] اس پر زمانہ میں ایک مفصل تنقید شائع ہوئی تھی۔

ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔

جرمنی سے لنڈن واپس آکر وہاں کے اسکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخل ہوئے اور اسی کے ساتھ بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اسی دوران میں آپ نے لنڈن میں "مذہب اسلام" پر چھ لکچر دئے جو بہت مقبول ہوئے۔ انھیں دنوں میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ پر آپ چھ ماہ کیلئے لنڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کے قائمقام پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ جس کے بعد جولائی ۱۹۰۸ء میں آپ انگلستان سے ہندوستان واپس آئے۔ آپ نے دوران قیام یورپ میں اسپین و فرانس کی بھی سیر و سیاحت کی، اور واپسی پر لاہور میں باقاعدہ بیرسٹری کرنے لگے۔

آپ کو سیاسی میدان سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی بلکہ آپ کا مذاق عالمانہ اور فلسفیانہ واقع ہوا تھا۔ تاہم احباب آپ کو مجبور کر کے ۱۹۲۶ء میں پالٹیکس کے میدان میں کھینچ لائے۔ اور پنجاب کونسل کے انتخابات میں بہ حیثیت امیدوار کھڑا کیا۔ اسمیں آپ کو شاندار کامیابی ہوئی۔ چونکہ آپکو مزدوروں اور کاشتکاروں سے ہمیشہ سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ اس لئے آپ کونسل میں ان طبقوں کی ہر دم حمایت کرتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے بانیاں مذاہب اور بزرگانِ دین پر نامناسب حملوں کے خلاف پنجاب میں ریگولیشن نافذ کرایا، جو ابتک قائم ہے۔ تلوار کو قانونِ اسلحہ سے مستثنےٰ کرانے اور انسدادِ شراب نوشی کے لئے آپ نے کوشش کی اور ایک تقریر میں وصولی مالگذاری کے سلسلہ میں جو زیادتیاں ہوتی ہیں، اُن پر روشنی ڈالی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں میسور یونیورسٹی نے آپ کو چند لکچر دینے کے لئے میسور مدعو کیا۔ جہاں آپ کا ہندو مسلم انجمنوں نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ حیدرآباد بھی تشریف لے گئے اور اعلیحضرت حضور نظام سے شرفِ نیاز حاصل کیا۔ ۱۹۳۷ء میں آئین جدید کے ماتحت انتخابات ہوئے تو آپ بھی پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ نے آپ کو "سر" کا خطاب عطا فرمایا۔ ۱۹۳۵ء میں ریاست بھوپال نے آپ کے لئے تاحین حیات پانسو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ جس سے آپ یک گونہ فکرِ معاش سے آزاد ہو گئے۔ اس اثنا ر میں آپ نے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس اور بعض دیگر اسلامی جلسوں کی صدارت کی۔

شاعری اقبال کی شاعری کا آغاز طالب علمی ہی کے زمانہ سے ہوتا ہے۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں جب آپ لاہور آئے تو نقاد سوسائٹی کی بدولت طبع رسا پر مزید صیقل ہوئی۔ اور آپ کی شاعری کا شہرہ طلبار کے حلقہ سے نکل کر عوام تک پہونچا۔ آپ نے کچھ دنوں مرزا داغ سے اصلاح لی، بعدہٗ آپ کو کسی سے

مشورہ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن نکتہ چینوں کے اعتراضات پر آپ ہمیشہ توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا حسرت کے اُردوئے معلیٰ میں جو سلسلہ مضامین آپ کے متعلق شائع ہوا۔ اُس سے آپ نے بخوبی فائدہ اُٹھایا۔

بہرحال اقبال کی شاعری کو پانچ دَور میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دَور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک رہا۔ جب آپ کی اکثر نظمیں شیخ عبدالقادر صاحب کے مشہور رسالہ مخزن میں شائع ہوتی رہیں اس دَور کی سب نظمیں حبِ وطن میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور آپ انھیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں سُنایا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلی نظم جو آپ نے ۱۸۹۹ء میں انجمن کے سالانہ جلسے میں پڑھی "نالہ یتیم" تھی۔ "ہندوستان ہمارا"۔ "ہمالہ" اور "نیا شوالہ" نامی نظمیں اسی دَور کی یادگار ہیں۔ اس دَور میں اقبال خالص ہندوستانی تھے۔ "ہندوستان ہمارا" پر آپ نے اپنی نظم کا صحیح اور مستند اڈیشن رسالہ زمانہ کو اشاعت کے لئے عنایت فرمایا تھا۔ چنانچہ دفتر زمانہ میں آپکے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ابھی تک محفوظ ہے اور اس پرچہ میں ہدیۂ ناظرین ہے۔

دوسرا دَور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۳ء تک رہا۔ جب وہ "قومی" شاعر کے بجائے "اسلامی" شاعر بنگئے۔ "وطنیت" کو "بت" سمجھنے لگے۔ انھیں دنوں کا شعر ہے ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

بہرحال اقبال کا نظریہ اب یہ ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کو وطن سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ سارا جہاں ان کا وطن ہے۔ خضرراہ، شمع و شاعر اور طلوع اسلام وغیرہ اسی دور کی نظمیں ہیں۔ اسرارِ خودی، رموز بیخودی اور پیام مشرق میں اسی دور کا کلام ہے۔

چوتھا دَور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک رہا۔ جب اُنھوں نے اردو شاعری سے کنارہ کش ہوکر اس کو بالائے طاق رکھدیا۔ زبورِ عجم، جاوید نامہ، مسافر، اسی زمانہ کی یادگار فارسی مثنویاں ہیں۔

پانچواں دَور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء یعنی تا دم آخر رہا۔ اس دور میں اقبال کی طبیعت پھر اُردو نوازی کی طرف مائل ہوئی۔ چنانچہ بال جبریل اور ضربِ کلیم نامی مجموعہ کلام اسی زمانے میں شائع ہوئے۔

اقبال کے ابتدائی کلام میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ صحیح معنی میں یک ہندوستانی شاعر ہیں۔ ہندوستان اُن کی نظروں میں جنت نشان ہے۔ انھیں ہندوستان کی ہر چیز پیاری اور دلآویز نظر آتی ہے۔ حُبِ وطن میں سرشار ہوکر وہ کس والہانہ خلوص کیساتھ کہتے ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ بوستاں ہمارا

اقبالؔ کا یہ ترانۂ وطن آج تک ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اسی طرح وطن کے غم میں گھل کر ایک جگہ کہتے ہیں ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان مجھکو کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

جب ہندوستان کے شمال میں قدرت کی تعمیر کردہ سدِ سکندری یعنی کوہستان ہمالیہ کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ مترنّم ہوتے ہیں ؎

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اقبالؔ کے اکثر کلام میں حکیم قاآنی جیسا وجد آور ترنم اور الفاظ میں آبِ رواں کی سی روانی ہے مثلاً وہ بہار کا خیر مقدم کس رنگین پیرایہ میں کرتے ہیں ؎

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار
مست ترنّم ہزار ۔ طوطی و دُرّاج و سار ۔ برطرفِ جوئبار ۔ کشتِ گل و لالہ زار ۔ چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

ستاروں کا جو گیت لکھا ہے، اُس کے الفاظ کی روانی میں کسقدر کیف آور ترنم ہے ؎

ہستیِ ما نظامِ ما مستیِ ما خرامِ ما گردشِ بے مقامِ ما زندگیِ دوامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما، می نگریم و می رویم
بیشِ تو نزدِ ما کمے سالِ تو نزدِ ما دمے اے بکنار تو یمے ساختہ بہ شبنمے
ما بہ تلاشِ عالمے، می نگریم و می رویم

اللہ اللہ! اوپر کے بند کے اس ٹکڑے میں "اے بکنار تو یمے ساختہ بہ شبنمے" اِنسان کو خودشناسی اور جد و جہد کا کسقدر زبردست سبق دیا گیا ہے۔

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اقبالؔ زراعت پیشہ لوگوں اور مزدوروں کے بیحد ہمدرد تھے۔ دراصل وہ موجودہ نظامِ اقتصادیات میں ایک انقلاب عظیم کے حامی تھے۔ آجکل جبکہ کانپور میں مالکان کارخانجات اور مزدوروں کے درمیان زبردست کشمکش ہو رہی ہے۔ اقبالؔ کے مندرجۂ ذیل

نعرۂ انقلاب خاص قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب ——— از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام ——— آنچناں زہرے کہ از وے مار ہا در پیچ و تاب

انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

ایک جگہ مزدوروں کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر اس طرح نادری حکم سُناتے ہیں ؎

اُٹھو! مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو ——— کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے ——— کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ ——— جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی ——— اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے ——— میرے لئے مٹی کا حرم اَور بنا دو

آجکل ہندوستان میں جسے دیکھئے تقلیدِ مغرب کی رَو میں بہا چلا جاتا ہے۔لیکن اقبال مرحوم جو مغربی تہذیب و تمدن کا غور سے مطالعہ فرما چکے تھے، اس کے سخت مخالف ہیں۔ اور اہلِ مغرب کی مادہ پرستی سے سخت بیزار ہیں۔ چنانچہ طنزیہ لہجہ میں فرماتے ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے ——— کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی ——— جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

یک جگہ مغربی تہذیب سے بیزار ہوکر اس طرح آہنگِ فریاد بلند کرتے ہیں ؎

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ ——— فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ ——— معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

ہندوستان کے چار شاعر اپنی خصوصیات کے لئے مشہور ہیں۔ امیر خسروؒ کے الفاظ کی روانی، بیاختگی اور ترنم، میر تقی میر کا سوز و گداز، خواجہ میر درد کا تصوف اور مرزا غالب کا فلسفہ و حکمت۔ ان قدرت نے ان چاروں کی خصوصیات کو جس شخص واحد کی طبیعت میں سمو دیا ہے، وہ محمد اقبال ہیں۔ روانی و ترنم کے نمونے تو ہم اوپر نذر کر چکے ہیں۔ سوز و گداز کی مثال بھی ملاحظہ فرمایئے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے ——— قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

نجیت کے لئے دِل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا ــــــ یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں
دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب ــــــ کیا لُطف انجمن کا جب دِل ہی بُجھ گیا ہو

اقبالؔ کا کلام تصوّف میں بھی بے نظیر ہے۔ خصوصاً جہاں وہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کی تشریح کرتے ہیں تو پڑھنے والے میں ایک شانِ خودی و خودداری پیدا ہوجاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش ــــــ زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ــــــ ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

بھگوت گیتا میں اسی بات کی تلقین ہے کہ انسان کے افعال و اعمال صلہ کے خیال سے بے نیاز ہونے چاہئیں، یعنی کام کئے جاؤ چاہے معاوضہ ملے یا نہ ملے۔ لیکن دُنیا کی کیفیت یہ ہے کہ جو پوجا پاٹ کی جاتی ہے وہ مُکتی کے شوق میں اور جو سجدہ ہوتا ہے وہ حور و قصور کے خیال میں، اسی بات پر ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے ــــــ اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اقبالؔ کے مجموعۂ کلام سے اسی قسم کی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

فلسفہ و حکمت میں اقبالؔ مولانا رومؒ کے مقلد ہیں۔ اور ان کا فلسفہ جدوجہد اور سعی و عمل کا پیغام ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو چمکائے اور اپنی خودی کو فروغ دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو خدائی پر قابض ہوسکتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ــــــ خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

دیکھئے سُست کار اور غافل انسان کو کس طرح درسِ عمل دیتے ہیں ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا ــــــ دانہ تو کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
کانپتا ہے دِل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا ــــــ ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہوگیا ــــــ مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں ــــــ تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو ــــــ کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں ناآشنا رہنا ــــــ جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا | خودی کا رازداں ہوجا، خدا کا ترجماں ہوجا
مصافِ زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر | شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا
گذر جائیں گے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں میں | گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا
یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر | زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

اقبال کو ریاکار و مکار مذہبی رہنماؤں سے سخت نفرت تھی۔ اور وہ ہمیشہ ریاکار پیرانِ طریقت کے خلاف لکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ حریص لیڈروں کی بابت فرماتے ہیں ؎

جن کو سالار میسر ہوں شکم کے بندے | یہی قوموں کی ترقی کی حقیقت معلوم
ہر گھڑی رنگ بدلتا ہو نیا جن کا ضمیر | حُریت کا بھی سمجھ سکتے ہیں کیا وہ مفہوم؟

مکار صوفیوں اور سیہ کار پیروں پر بھی خوب لے دے کی ہے، فرماتے ہیں ؎

میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے | قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام
مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں | بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی | اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ابتدا میں اقبال پُرخلوص وطن پرست شاعر تھے مگر ۱۹۱۰ء کی جنگ بلقان کے بعد اُن کی طبیعت نے یک لخت پلٹا کھایا۔ اور وہ وطنیت سے نفور ہو کر عالمگیر اسلامی اخوت کے قائل ہوگئے۔ چنانچہ جہاں وہ پہلے ہندوستان کو سب سے اچھا سمجھتے تھے۔ اب بیساختہ کہنے لگے کہ ؎

نہ میں اعجمی و ہندی، نہ عراقی و حجازی | کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

آخر کار اقبال کو وطنیت سے اِس درجہ بیزاری ہوگئی کہ وہ یہ شعر کہنے پر مجبور ہوگئے ؎

اِس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور | ساقی نے بنا کی روشِ لُطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور | تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

نوحۂ اقبال

از اختر بریلوی

آہ دُنیا سے اُٹھ گیا اقبال شاعرِ باکمال و بااقبال
خوش بیاں، خوش نصیب، خوش قسمت نیک خو، نیک طبع، نیک خصال
نکتہ رس، نکتہ سنج، نکتہ شناس آدمی صورت و فرشتہ مثال
دُوربیں، زیرک و فہیم و ذکی آئینہ دارِ حال و استقبال
حق رس و حق شناس و حق آگاہ باہُنر، باخبر، بلند اقبال
فہم و ادراک و فطنت و دانش اِس ہمہ داں کے تھے یہ راس المال
تھا جہاندیدہ و مآل اندیش دولتِ علم و فن سے مالا مال
مغربی فلسفہ سے تھا آگاہ مشرقی نکتوں سے بھی واقف حال
نازشِ دودمانِ نیک دلاں فخرِ اوتاد و صوفی و ابدال
آشنائے رموزِ درویشاں واقفِ جادۂ حرام و حلال
اُسکی شہرت سے گونجتا تھا جہاں مشرق و مغرب و جنوب و شمال
تھا وجیہہ و شکیل و کوہ وقار صاحب رعب و داب و جاہ و جلال
جسم خاکی میں اُس کے تھی شاید طاقتِ بوترابؓ و روحِ بلالؓ
تھی طبیعت میں اس کی ہمواری صفتِ خاص اُس کی استقلال
خضرِ ملت تھا ناخدائے وطن قوم کے حق میں تھا وہ گویا ڈھال
خاص عنصر تھے اُس کے جود و سخا تھا نہ کوتاہ اُس کا دستِ نوال
اُس کے افعال نیک و صالح تھے قابلِ رشک اُس کے تھے اعمال
نقش ہیں دِل پہ اہلِ دانش کے اُس کے پند و نصائح و اقوال
ایشیا اُس پہ رشک کرتی ہے اُس کی معدوم ہے جہاں میں مثال
شاعری اُس پہ ختم ہے واللہ کچھ نہیں اس میں جائے قیل و قال

شاعرِ اعظم ایشیا کا تھا — ہند ہی میں گڑی ہے اُس کی نال
اُس کے دم سے فروغِ اُردو تھا — اُس کے اُٹھنے سے آگیا ہے زوال
اُس سے دعویٰ کرے تقابل کا — نہ ہوئی آج تک کسی کی مجال
خوب ہوتا تھا اُس کا استنباط — اور اُس سے بھی بڑھ کے استدلال
عارضِ تابناکِ اُردو پر — تھا وہ پیشِ نظر چمکتا خال
شاعری میں نہ پاؤ گے اُس کی — رنجِ شامِ فراق و عیشِ وصال
تھا خیال اُس کا ارفع و اعلےٰ — بال کی وہ نکالتا تھا کھال
اُس یل شاعری کا کیا کہنا — ہیچ تھے اُسکے آگے رستم و زال
سُن کے اُس کا کلام آتا ہے — وجد صوفی کو محتسب کو حال
ہجر سے اُس کے غمگساروں کی — ہو گئیں روتے روتے آنکھیں لال
رہ گیا شاہبازِ سدرہ نشیں — اُس کے دم توڑنے سے بے پروبال
خاک کو بھی نہ اُس کی پہونچیں گے — ایڑیاں لاکھ رگڑیں گر نقّال
اُٹھ گیا اُس کا سایہ دُنیا سے — پرِ عنقا ہے آج اُس کی مثال
سب ہیں غمگین اُس کے مرنے سے — صاحبِ جاہ اور اہلِ کمال
سوگ میں اُس کے ہیں کہیں و مہین — اُسکے ماتم میں ہیں اناث و رجال
میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا — روح نے اُسکی جھاڑے جب پروبال
حوریں غرفوں سے تاکتی تھیں اُسے — اور کہتی تھیں سب تعالےٰ تعال
بات کل کی یہ ہے کہ تھا ہر سُو — رونق افروزِ دہر اُس کا جمال
آج عالم ہے اُس کے ماتم میں — کل کی باتیں ہوئیں ہیں خواب و خیال
کس طرح وہ جئے گا اُس کے بعد — زندگی جس کی ہو گئی ہو وبال

نازشِ بزمِ ایشیا نہ رہا
لُٹ گیا شاعری کا بیت المال

لہ اُردو۔ سعہ آ۔

اقبال

حضرت طالب چکوالی بی۔ اے، ایل ایل بی

اے کہ تُو نے واکئے عالم پہ اسرارِ حیات — اے کہ تُو نے کر دیا شاداب گلزارِ حیات
اے کہ تُو نے آسماں کے راز ہم سے کہہ دئے — بزمِ انجم کر دیا تُو نے ہی بازارِ حیات

نغمۂ "ہندوستاں" نکلا تھا تیرے ساز سے — اہلِ گلشن نے سبق سیکھا تری آواز سے
آہ کیا جادو تھا جو تجھ پر کیا احباب نے — اے مفکر! ہم کو بھی آگاہ کر اس راز سے

اے تیری حریت نوائی ہے "حصارِ دیں" میں تنگ — طبعِ رنگیں ہے طلبگارِ نگارِ شوخ و شنگ
اے کہ عالم کو تجھے دینا تھا پیغامِ عمل — تنگ نظری کے گوارا کر لئے کیوں رنگ ڈھنگ

اُس پہ بھی تُو ہند کا تھا شاعرِ جادو نوا — اب نہ سن پائینگے محفل میں تری رنگیں صد
جا رہے ہیں کیسے کیسے عندلیب اِس باغ سے — برق صورت اس کا اب اقبال بھی جاتا ر

علامہ سر اقبال

ڈاکٹر اقبالؒ وہ روحِ سخن — اِس جہاں سے ناگہاں جاتا رہا
بن گئی بزمِ سخن ماتم کدہ — شاعرِ معجز بیاں جاتا رہا
ہو رہی ہے آج اُردو سوگوار — شاید اُس کا پاسباں جاتا رہا
کس قدر حیران ہیں اہلِ سخن — آج اُن کا ہم زباں جاتا رہا
گلستانِ ہند ہے سنسان آج — بلبلِ ہندوستاں جاتا رہا
معرفت کہتی ہے آج اسلام کا — نکتہ داں و راز داں جاتا رہا
آج ہیں سب مضطرب جس کیلئے — وہ خدا جانے کہاں جاتا رہا

ذرہ ذرہ محوِ ماتم ہے کہ "حیف
شاعرِ جادو بیاں جاتا رہا"

حفیظ الرحمٰن حسین پنجابی

تنقید کتب

مسلمانوں کا روشن مستقبل[1]

عرصہ سے مسلمانوں پر افسردگی اور مایوسی کا دَور طاری ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے مگر اس کتاب کے مصنف نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی مایوسی کا دَور اب ختم ہو رہا ہے اور اُن کا اچھا زمانہ آرہا ہے۔ اِس کے لئے مصنف نے بالعموم اہلِ ہند اور بالخصوص مسلمانوں کی گذشتہ تین صدیوں کی اقتصادی اور تمدّنی۔ تعلیمی اور سیاسی تاریخ لکھی ہے۔ اسمیں ایک بڑی جدّت یہ ہے کہ دس۱۰ بنیادی حقوق قائم کرکے اُنکی تفصیل کی گئی ہے اور تین۳ سو سال کے تین۳ دور کرکے ہر دور کی جانچ ان دس۱۰ حقوق کے معیار سے کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے کو ہر زمانہ کے متعلق اندازہ ہوجائے، کہ اسمیں بالعموم اہلِ ہند اور بالخصوص مسلمانوں کے حقوق کس حد تک محفوظ رہے اور کہانتک تلف ہوئے۔ یہ حقوق باعتبار اہمیت حسب ذیل ہیں:۔

روٹی۱ کا مسئلہ، حفاظت۲ جان و مال، عدل۳ و انصاف، مذہبی۴ حفاظت، تہذیب۵ و زبان، تعلیم۶، حقوق۷ ملازمت، یکساں۸ شہری حقوق و مساوات، حقوق۹ ملکیت یعنی آزادی، سیاسیات۱۰۔

ان حقوق کی بنا پر اول مسلمانوں کی سلطنت کے آخر زمانہ کی جانچ کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اس وقت اہلِ ہند کی مالی حالت کسقدر عمدہ تھی، ملکی حفاظت میں ان کا کسقدر حصہ تھا۔ بغیر کسی خرچ اور بلا امتیاز قوم و ملت کے عدالتوں میں انصاف ہوتا تھا۔ جملہ اقوام کے مذاہب اور انکی تہذیب و زبان کی حفاظت تھی۔ تعلیم عامہ کے حصول کے کسقدر مواقع تھے۔ سب کو یکساں طور پر ملازمت اور شہری حقوق حاصل تھے۔ اور رعایا کو ملکی امور میں کہانتک دخل تھا۔ دوسرا دَور ایسٹ انڈیا کمپنی کی صد سالہ حکومت کا قرار دیا گیا ہے، جسمیں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان سے کسقدر زرکشی کی گئی۔ یہاں کی صنعت و حرفت برباد کرکے ملک کو تباہ کیا گیا۔ ہندوستانیوں کو تمام بڑے عہدوں سے خارج کیا گیا۔ قدیم طریقہ کی تعلیم عامہ کو ختم کرکے اُسکی جگہ نام نہاد علوم جدیدہ کی تعلیم جاری کی گئی۔ جسکی غرض مذہب عیسوی کی اشاعت تھی یا ہندوستان میں غلامانہ ذہنیت

---

[1] مصنفہ مولانا سید طفیل احمد سابق ایم۔ ایل سی، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۲۵ صفحات، اچھی طباعت، خوبصورت جلد۔ قیمت فی جلد ۲/۸ ۔ ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس بدایوں (یو۔ پی)

پیدا کرنی تھی۔ اِس سلسلہ میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کی عمدہ تاریخ دی گئی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ سلطنت جانیکے بعد سے بالعموم اور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے بالخصوص مسلمان بالکل بجھ گئے تھے مگر اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ باوجود مختلف حالات کے ۱۸۷۰ء تک علمائے کرام وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کی مذہبی اور تمدنی اصلاح کرتے رہے۔ دینی مدارس قائم کرکے وسیع پیمانہ پر اشاعتِ علوم اور مذہبی تبلیغ میں مصروف رہتے تھے۔ نیز مذہبی حفاظت کے لئے منظم طور پر جانبازیاں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بے جان یا مردہ ہو گئے تھے۔ مجاہدین کے یہ حالات پڑھ کر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ بالآخر ۱۸۷۰ء سے وہ وقت شروع ہوا جبکہ حکومت نے مسلمانوں کے بارہ میں اپنی پالیسی بدلی اور اُن کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور سر سید احمد خان صاحب نے مسلمانوں کی تمدنی، مذہبی اور تعلیمی اصلاح کی عظیم الشان تحریک شروع کی۔ اس وقت سر سیّد نے جدید تعلیم اور ملازمت میں مسلمانوں کی پسماندگی دیکھکر اُن کی حالت پر مرثیہ خوانی شروع کی جو ایک عارضی علاج تھا۔ مگر مصنف کے نزدیک اُسے مستقل طور پر اختیار کر لینے سے مسلمان اپنے کو دیگر اقوام ہند سے ہر اعتبار سے کمزور سمجھنے لگے اور ان پر روز بروز زیادہ افسردگی چھاتی گئی۔

سر سیّد کی تحریک کے تینوں شعبہ جات یعنی اصلاح تمدن، مذہب اور تعلیم کے تاریخی حالات نہایت جامع مگر مختصر طور پر دئے گئے ہیں، جن کے پڑھنے سے تحریک سر سیّد کے بارہ میں پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں علیگڈھ کالج قائم ہونیکے وقت سے لیکر یونیورسٹی بننے تک کے مفصل حالات درج ہیں۔

تمام مندرجہ بالا حالات اول پانچ ابواب میں دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد باقی ماندہ پانچ ابواب سیاسیات کے لئے مخصوص ہیں۔ جنمیں سب سے اول ہندوستان میں سیاسی احساس پیدا ہونے کی تاریخ ہے۔ پھر سر سید احمد خاں کے سیاسی کارناموں کے سلسلہ میں اُن کی تصنیف "اسباب بغاوت ہند" سے دکھایا گیا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے صد سالہ عہد میں اہلِ ہند کے بنیادی حقوق کس حد تک پامال ہوئے تھے۔ جسکی وجہ سے اُنھوں نے مجبور ہو کر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا کیا۔

اس کے بعد اس پچیس۲۵ سالہ دَور کے مفصل حالات دئے گئے ہیں جسمیں کہ علیگڈھ کے تین۳ انگریز پرنسپلوں نے مسلمانوں کی سیاست اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے خاص سانچہ میں ڈھالا اور مسلمانوں کو حکومت اور برادرانِ وطن سے ڈرا ڈرا کر انھیں بزدل بنایا۔ اور اُن میں غلامانہ ذہنیت پیدا کی۔ دراصل اس باب کو صحیح طور پر کتاب کا قلب کہا جا سکتا ہے جس کا مطالعہ ہر ہندی مسلمان کو کرنا چاہیئے۔

مسلم لیگ کو قائم ہوئے چار پانچ سال ہو چکے تھے جبکہ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ سے نکلی اور مسلمانوں کی سیاست کا اچھا زمانہ شروع ہوا۔ تب سے مسلمانوں کا قدم میدانِ سیاست میں روز بروز بڑھتا گیا۔ اور مسلم لیگ کے علاوہ خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء، جماعت احرار، خدائی خدمتگار اور شیعہ پولٹیکل کانفرنس قائم ہوئیں۔ ان تمام جماعتوں کے نشو ونما اور ترقی کے مفصل حالات مع سالانہ اجلاسوں کی تجاویز کے دئے گئے ہیں اور مسلمانوں کی سیاست کے تدریجی ارتقاء کو فلسفیانہ طریقہ سے دکھایا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح ٹرکی میں نوجوانوں نے وہاں کا سیاسی مسئلہ حل کر کے اپنے ملک کو اتحادیوں کے چنگل سے نکالا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کی ایک مقدس جماعت نے ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل کر دیا ہے جس سے ہندوستان انجام کار آزاد ہو کر رہے گا۔

باب دہم میں جو آخری ہے تاج برطانیہ کے اسی سال کے عہد میں ہندوستان کے دس بنیادی حقوق کی جو حالت رہی اُسے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں مشکل سے کوئی قومی مسئلہ ایسا ہوگا جس پر فاضلانہ تبصرہ نہ کیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ اعداد و شمار سے دکھایا گیا ہے کہ سیاسی جدو جہد کرنے سے ہر حق میں سے کتنا حصہ مل گیا اور کتنا باقی ہے اور کتنے عرصہ میں پورے حقوق ملنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اِس باب میں مسلمانانِ ہند کے تین سو سال کے حالات پر پورا تبصرہ کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ مسلمان ملک کی آزادی کی جنگ میں کسی قوم سے پیچھے نہیں رہے۔ اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جسمیں مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت سیاسی جدوجہد میں پیش پیش نہ رہی ہو۔ اور وجوہ و دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ نہایت کٹھن منزلوں سے گذرنے اور سخت آزمائشوں میں پڑنے پر بھی ان میں کافی زندگی باقی رہی۔ البتہ نصف صدی کیلئے ان کا آفتاب اقبال کسوف میں آگیا تھا۔ جس میں سے وہ روز بروز نکل رہا ہے اور اب تمام سامان ایسے جمع ہو گئے ہیں۔ جس سے اُن کا مستقبل بیّن اور بدیہی طور پر روشن نظر آرہا ہے۔

مصنف نے مسلمانوں کی ذہانت میں تبدیلی، ہندو مسلمانوں کی مشترک سیاسی اور اقتصادی پارٹیوں کے وجود میں آنے اور مسلم عوام کی پوچھ گچھ ہونے، سیاسیات میں علماء دین کی شرکت کو مسلمانوں کے روشن مستقبل کے آثار سے تعبیر کیا ہے۔ ہندوستان کی آئندہ سیاسی جنگ کے متعلق مصنف "روشن مستقبل" نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ جس قسم کی پُرامن جنگ ہندوستانیوں نے

۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۸ء میں لڑی اور جس کے بعد کانگریس نے سات صوبوں میں انتخابات میں اکثریت حاصل کر کے جدید آئین کے تحت میں کانگریسی حکومت قائم کی۔ یہی پُر امن جد و جہد ہندوستانیوں کو کامل آزادی کے درجہ تک پہونچائے گی۔ اور اس کا انحصار رعایا کی واحد سیاسی جماعت یعنی کانگریس کی قوت پر ہوگا۔ اس سیاسی قوت میں مسلمانوں کا حصّہ کیا ہوگا؟ اسکی بابت لکھا ہے کہ جمہوریت کے متحدہ مقصد میں اِس کا سوال باقی نہیں رہتا لیکن یہ پیشگوئی صحیح طور پر کی جا سکتی ہے کہ اس ایثار اور بے نفسی کی دوڑ میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں رہینگے۔ کتاب کی اشاعت کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ دلدل سے نکال کر جمہوریت کا صحیح اصول سمجھایا جائے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ کتاب اپنے مقصد کو پورا کرے گی اور مسلمان ٹھنڈے دِل سے اس کا مطالعہ کریں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ قابل مصنف اس کتاب پر نظر ثانی کرنے کے بعد اُسکا دوسرا ایڈیشن "ہندوستان کا روشن مستقبل" کے نام سے جلد شائع کر سکیں۔ کیونکہ جس طرح مسلمانوں میں فرقہ وارانہ خیالات کے لوگ موجود ہیں، اُسی طرح دوسری قوموں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جن کو قوم پرستی اور جمہوریت کا صحیح مفہوم بتایا جائے۔ اسوقت حکومت کے سامنے مدارس کے نصاب میں تبدیلی کرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔ بالخصوص جو تاریخیں ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں اور اُن سے جو فرقہ وارانہ خیالات پیدا کئے جاتے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کی جگہ لینے کے لئے "ہندوستان کا روشن مستقبل" جیسی کتابیں لکھی جائیں۔ (ن)

دِلّی کا سنبھالا[1]

یہ لاجواب کتاب غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل کی "دِلّی کا مرقع" ہے۔ جسمیں مشہور و معروف ماہرین علوم و فنون کی جیتی جاگتی قلمی تصویریں پیش کیگئی ہیں۔ اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ جمنا جی کے نرمل جل اور اُجلی دھار" میں دُھلی ہوئی ٹھیٹ دہلی کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی پاس بیٹھا ہوا بیان کر رہا ہے۔

اسمیں غدر سے پہلے دہلی کے مشہور و معروف علماء، فضلا اور اُستادوں میں سے تقریباً ساٹھ کا حال مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ شروع میں دِلّی کی گذشتہ تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ:-

"صاحب سُنی سُنائی بات ہے، بڑوں نے کہی ہمارے کان پڑی، آپ تک پہونچادی، پانچ پت آباد ہوئے، چار کا پتہ چلتا ہے، پانچویں کا نشان نہیں ملتا۔ پانی پت، سونی پت، مارپت، باگپت، خیال ہے کہ پانچواں پت جو لاپتہ ہے، دہلی بن گیا۔ راجہ اننگ پال اس راجدھانی میں

[1] قیمت ایک روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

راج راج رہا تھا کہ فرشتۂ اجل نے فرمانِ قضا دیا۔ اولاد نرینہ نہ تھی، نواسہ پر تھوتی راج جو آجیکا راجہ تھا، وارثِ تاج و تخت ہوا۔"

درحقیقت خواجہ محمد شفیع دہلوی نے یہ کتاب لکھکر بڑا احسان کیا ہے۔ ایسی پیاری زبان کہاں پڑھنے میں آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ جس فن کے استاد کا تذکرہ کیا ہے، اسی فن کا تلازمہ بھی استعمال کیا ہے، جس سے آج بیسویں صدی میں بیٹھے ہوئے، فسانہ عجائب اور سروش سخن کی زبان کا لطف آجاتا ہے۔ محمد بیگ ضلع جگت کے استاد کا کمرہ ملاحظہ ہو:۔

"زمانہ بھر کے آزاد منش، تیز طبع، حاضر جواب جمع ہیں۔ زبان درازی فقرہ بازی کا بازار گرم، ہر ایک کی زبان تیز طرار، تیغ بُراں، خنجر آبدار۔ آداب محفل نرالے ہیں۔ اس بزم کے انوکھے آنیوالے ہیں۔ دعا سلام کا یہاں نام نہیں، تہذیب کا یہاں کام نہیں، نہ آداب اخلاق سے سروکار، نہ مغلظات سے اُن کو عار۔ آزاد ہیں، پابند نہیں۔ ان کے قول و فعل پر کوئی قید و بند نہیں، جو منہ میں آتا ہے سو کہتے ہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ فقرہ چست ہو بندش درست۔ الفاظ چبھتے ہوئے، جواب کھبتا ہوا، برجستہ۔ ایک طرف آزاد منش رند مشرب بیٹھے ہیں، ایک طرف مست مولا مستان۔ اِس محفل میں امتیاز مراتب نہیں۔ امیر بھی ہیں، غریب بھی۔ فقیر بھی ہیں، رئیس بھی۔ سب ایک حمام میں ہیں اور ایک رنگ میں۔ میدانِ تمسخر میں سمندِ زبان گامزن ہے، ضلع پھبتی جگت کی جولانگاہ میں کلیلیں کرتا پھرتا ہے۔ کسی نے فقرہ کسا اور سمندِ ناز پر تازیانہ ہوا۔ ترارا بھرا، آسمان کے تارے توڑ لایا۔ ایسا جواب دیا کہ سب لاجواب ہوگئے۔ محفل سے تحسین و آفریں کا غلغلہ آسمان تک پہونچا۔ ساکنانِ کرۂ خاک کی داد فلک الافلاک پر فرشتوں نے دی۔"

ایک اور بزم مئے کا خاکہ یہ ہے :۔

"تاجدار مکان ہے۔ سامنے لبریز حوض، حوض کے بیچ میں فوارہ جام مئے کی طرح چھلک پڑتا ہے۔ گرداگرد تنوار روشنی کی گئی ہے۔ مکان جگمگا رہا ہے۔ آگے پائیں باغ۔ لالہ جام در دست گلاب گلابی لئے۔ نونہالانِ چمن مست و مخمور جھوم رہے ہیں، سبزہ کا منہ چوم رہے ہیں، چشم میخوار نرگس بیمار لڑکھڑا رہی ہے۔ بادِ بہاری مستانہ وار آرہی ہے۔ بزم مئے ہے، جام و مینا سجے ہیں۔ گلہائے خوشرنگ و خوشبو کے انبار۔ عطردان کھلے دھرے ہیں۔ گلاب پاش بھرے رکھے ہیں۔ عود سوز سلگ رہے ہیں۔ دھواں مستانہ وار اٹھتا ہے۔ اور مینا کا طواف کرتا

گذر جاتا ہے۔ شمع کے گرد پروانہ، مست مستانہ، سرگشتہ و دیوانہ، آگ سے کھیل رہا ہے۔

اب آتش کا دور چل رہا ہے۔ شعلہ آشام دو آتشہ اور سہ آتشہ سے دل کی لگی بجھا رہے ہیں، کدورت کا یہاں نام نہیں۔ انقباض کا کام نہیں۔ صاف دل پاک درون جمع ہیں، کھل کھیل رہے ہیں، جن سے دل کھلی ہے وہی موجود ہیں۔ پہلے ساقی کے نام کی زمین پر گرائی، پھر شغل شروع ہوا۔ جوان سفید رنگ کی پی رہے ہیں۔ سال خوردہ سُرخ۔ ساقی سیم ساق مزاج داں، طبع شناس، گلاب و بید مشک ملا کر لایا ہے۔ حسینانِ مخمور چشم خدمت کو حاضر، مطربِ خوشنوا ساز سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔"

دِلّی اور لکھنؤ میں اب تو کچھ نہیں رہا ہے۔ مگر کسی زمانہ میں یہاں فن قصہ گوئی کے بڑے اُستاد موجود تھے۔ جنھیں اصطلاح میں "داستان گو" کہتے تھے۔ دِلّی والے داستان گویوں کا اسلوب بیان ملاحظہ فرمایئے :-

"صاحبان! ایک عرصہ کی بات ہے۔ مدتیں گذر یں زمانہ ہوگیا۔ ہماری جوانی تھی۔ پاؤں پر منگل سوار تھا۔ سر پر سنیچر۔ دِل میں آئی کہ چلو ہم بھی جہاں گشت بنیں۔ "سیروا فی الارض" پر عمل کریں۔ ذرا دنیا دیکھیں۔ سامانِ سفر تیار کر چل کھڑے ہوئے۔ نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی۔ نکل گھر سے راہ سیدھی جنگل کی لی۔ چلا چل چلا چل۔ راہ کی عمر کوتاہ اور چلنے والے کی عمر دراز۔ ایک مقام پر پہونچے۔ کہ نام تھا اس کا وحشی نگر۔ بانگڑ پور تعلقہ جہالت آباد۔ شہر میں قدم رکھتے ہی دماغ جہالت سے پراگندہ ہوگیا۔ لوگ گندہ دہن، کم رو، چھوٹے چھوٹے سر، حماقت مآب، جانگلو، احمق، خرنا مشخص۔ طبیعت تو وہاں پل بھر بھی ٹھہرنا گوارا نہ کرتی تھی، پر کیا کرتا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ آفتاب سر بام تھا، جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ رات سر پر آرہی تھی، ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی سرا ہے؟ تو عجب ادائے استغنا سے فرماتے ہیں: "ہم تو گھر میں رہتے ہیں"۔ میں نے عرض کی خدا آپ کو گھر میں رہنا مبارک کرے۔ میں مسافر ہوں، تو ارشاد ہوا، جمعرات کو آنا۔ قسمیہ آگ ہی تو لگ گئی۔ دِل میں آیا اتنا جُتیاؤں کہ ساری عمر یاد کرے۔ اجنبی جگہ سمجھ کر چپ ہوگیا۔ دِل میں ٹھان لی، یا قسمت یا نصیب، سرا ملے چاہے نہ ملے، اب کسی سے پوچھونگا نہیں، تھوڑی دُور گیا تھا، مقدر سامنے تھا، سامنے سرا دکھائی دی۔ شکر باری تعالیٰ بجا لایا۔ اور سیدھا بھٹیاری کے پاس گیا۔ کالی کلوٹی بیگن لوٹی خنگری سی ایک عورت،

میلے دسمال کے رنگ کے کپڑے پہنے چولہے کے آگے بیٹھی روٹی پکارہی تھی۔ ماتھے پر سے پسینہ بہ رہا تھا۔ یقین مانیئے وہ بھی کالا۔ گلوری منھ میں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ڈائن ابھی کسی کا کلیجہ کھاکر آئی ہے۔"

غرض شروع سے آخر تک کتاب زیرِ نظر بہت دلچسپ ہے۔ جو لوگ دِلّی کی ٹکسالی زبان سیکھنا ...یں۔ وہ اِس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ آخر میں مشاعرہ کی کیفیت بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ ...س کتاب کی اشاعت پر مکتبہ جامعہ ملیہ کو داد دیتے ہیں۔ اِس کا کچھ حصّہ ریڈیو پر بھی پڑھا ...کا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ، سرورق دلچسپ، ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۱۵۶ صفحات۔

ثمر دار باغبانی

ہندوستان زراعتی ملک ہے لیکن یہاں کے زراعت پیشہ طبقہ کی حالت حد درجہ خراب ہے۔ ...ھل دار درختوں کے باغ لگانے اور عمدہ قسم کی ترکاریاں بونے سے زراعت پیشہ ...ں کی آمدنی میں خاصہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اسکی مثالیں ملیح آباد کے باغات انبہ، دربھنگہ ...ظفرپور میں باغات آم ولیچی اور ناگپور میں باغات سنترہ موجود ہیں۔ لیکن اس فن سے ہمارے ...ت پیشہ طبقہ کو بہت کم واقفیت ہے۔ اِس لئے چودھری بھوانی داس صاحب بی۔ اے، مالک ...ش نرسری، مظفر گڈھ پنجاب نے باغات کے شوقین اصحاب کیلئے یہ کتاب لکھ کر ملک کی ...ئی کی ہے۔ اِس کتاب کے مختلف ابواب میں انتخاب زمین، ترتیب باغ، طریقہ کاشت ...، پودوں کا درمیانی فاصلہ، آبپاشی، کاٹ چھانٹ، آلات باغبانی کے متعلق مفصل ہدایات ...ج ہیں۔ اِس کی زبان بھی سلیس اور عام فہم ہے اور مختلف مضامین کو نقشوں اور تصویروں ...ریعہ بھی سمجھادیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آم، بیر، جامن، شہتوت۔ کھجور، انار، امرود، انجیر، ...، سنترہ، ناشپاتی، لوکاٹ، انگور، آڑو، کیلا، آلوچہ، فالسہ وغیرہ ہندوستان کے عام پھلوں ...روری حالات، اُن کے بونے کیلئے ضروری آب وہوا، قسم زمین، کھاد، بونے کا موسم، آبپاشی، تراش قلم لگانا، تخم بونا، ان کی بیماریاں، کیڑے وغیرہ، اور ان کے دفعیہ اور علاج کی ترکیبیں، تفصیل کے ساتھ بتادی گئی ہیں۔ اور یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ کس موسم میں اور کن حالات کے اندر ...سا پھل کیسی زمین میں بویا جائے۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۱۰۱ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ چودھری بھوانی داس بی۔ اے، آنریری مجسٹریٹ و مالک پرکاش نرسری مظفر گڈھ، پنجاب۔

رفتار زمانہ

وزیراعظم مسٹر چیمبرلین کی نئی پالیسی جو مسولینی اور ہٹلر کو بہر حال خوش کرنے کی ہے اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ روس کو دوسری طاقتوں سے علیحدہ کرکے بحال خود رہنے دیا جائے۔ نیز وسط یوروپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہر ہٹلر کی نظر کرم کا محتاج کرکے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے۔ کہیں بھی مقبول نگاہوں سے نہیں دیکھی گئی۔ مسٹر موصوف نے جب پارلیمنٹ میں یہ بیان کیا کہ ہمیں اس دھوکہ میں نہ رہنا چاہئے اور نہ دوسری چھوٹی اور کمزور ریاستوں ہی کو اس دھوکہ میں رکھنا چاہئیے کہ دست درازی ہونیکی صورت میں مجلس اقوام اُنھیں بچا سکیگی۔ اس بیان کے دو تین ہفتوں کے بعد ہی جرمن فوجیں آسٹریا میں داخل ہوگئیں۔ چیکوسلاویکیہ کی حالت بھی بہت نازک ہے کچھ خبر نہیں کہ جرمنی کب کیا کر بیٹھے۔ ریاستہائے بالٹک بھی ہٹلر کے غاصبانہ طرز عمل سے خائف ہیں اور اپنی سلامتی کی خیر منا رہی ہیں۔ جب ورسیلز کا صلحنامہ ہوا تو مفتوح سلطنتوں کے ٹکڑے کرکے اقلیتوں کے حقوق اور حکومت خود اختیاری کے اصولوں کے اصول پر نصف درجن ریاستیں علیحدہ علیحدہ قائم کردی گئیں۔ اب جرمنی اُس کا تُرکی بہ تُرکی جواب دینا چاہتا ہے۔ اُن ریاستوں یعنی چیکوسلاویکیہ وغیرہ میں اقلیتیں ہیں۔ لہذا جرمنی کہتا ہے کہ اُنھیں اصولوں کے بموجب ان سلطنتوں کے مزید ٹکڑے کرکے علیحدہ علیحدہ ریاستیں کیوں نہ قائم کردی جائیں۔ اس طرح جنگِ عظیم کے فاتحان اور صلحنامہ ورسیلز کے بانیاں پر "چاہ کن راہ چاہ درپیش" کا مسئلہ صادق آتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگلستان نے کیوں ایسی پالیسی روا رکھی۔ اس کے دو وجوہ ہیں اوّل یہ کہ ابھی برطانیہ جنگ کے لئے پورے طور پر تیار نہیں ہے اور ہٹلر و مسولینی کی دھمکیوں کو سچ سمجھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانیہ میں اسوقت برسر اقتدار پارٹی سرمایہ داروں کی ہے وہ نازیت اور فاسیت کو اشتراکیت کا شاطر اور کامیاب حریف خیال کرتی ہے، اور برطانیہ و فرانس کی رفاقت میں اِسقدر خلوص نہیں ہے جیسا کہ ہونا چاہئیے۔ فرانس کی موجودہ گورنمنٹ شاٹمپ، ڈیلبوس اور بلم کے ماتحت اشتراکیت کی طرف مائل ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ برطانیہ کی خارجہ پالیسی خفیہ طور پر یہی رہی ہے کہ یوروپ پر فرانس کا غلبہ مسلط نہ ہونے پائے۔ اس لئے برطانیہ فرانس کے حریف جرمنی کو ترقی پذیر ہونے میں درپردہ مدد دینے پر مجبور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے برطانیہ نے جرمنی کی توسیع اسلحہ کی کارروائی پر خاموش طور رضامندی دے کر اور بحری سمجھوتہ کرکے فرانس کو رضامند کیا کہ وہ رائن لینڈ

Communism. Self-Determination. Rights of Minorities.
Anti-feudal. Chautemps, Delbos, Blum.

میں جرمن فوجوں کے قابض ہوجانے پر (جو صلحنامہ ورسیلز کی سراسر خلاف ورزی تھی) درگذر کرے۔
یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ برطانیہ نے پولینڈ پر بھی اثر ڈالا کہ وہ جرمنی کے ساتھ معاہدہ کرلے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جرمنی اور پولینڈ کے درمیان ایک غیر مصافی معاہدے[1] پر دستخط ثبت کردئے گئے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ برطانیہ یہ نہیں چاہتا کہ جرمنی کے خلاف فرانس اور روس کے معاہدہ کے باعث جرمنی اور روس میں جنگ چھڑ جانے کی صورت میں فرانس کے ساتھ صلحنامہ لوکارنو کے ماتحت اُسے بھی جنگ میں شامل ہونا پڑے۔ اِس لئے اُس نے بلجیم کو یہ ترغیب دی کہ وہ صلحنامہ لوکارنو کی اُن دفعات سے گلو خلاصی کرلے جنکی روسے کسی کی طرف سے صلحنامہ ورسیلز کی خلاف ہونے پر دستخط کنندگان صلحنامہ لوکارنو ایک دوسرے کی مدد کرنا لازمی ہوگیا ہے۔ چنانچہ بلجیم نے اِس بات کا اعلان کردیا ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنی پوزیشن غیر جانب دار رکھے گا۔
برطانیہ کے خلاف یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے چیکوسلاویکیہ کی ہینلین پارٹی کی حوصلہ افزائی کی کہ وسط یوروپ کی ریاستوں کے شیرازہ کو ڈھیلا کردے۔ کیونکہ یہ ریاستیں فرانس کے زیر اثر تھیں۔
اب ذرا برطانیہ اور اٹلی کے معاملات پر غور فرمایئے۔ اِسمیں شبہ نہیں کہ اٹلی اسپین کی جنگ میں دراصل اسپین کے خلاف نہیں بلکہ برطانیہ کے خلاف جنگ کررہا ہے۔ کیونکہ اُس کا مدعا یہ ہے کہ بحیرہ روم میں برطانیہ کے خلاف پورا اقتدار حاصل کرلے۔ اُس پر بھی برطانیہ نے اٹلی سے سمجھوتہ کرلیا ہے، حالانکہ مسولینی اب بھی بہ بانگ دہل اِس بات کا اعلان کررہا ہے کہ وہ جنگ اسپین میں لازمی طور پر جنرل فرانکو کی فتح کا طالب ہے۔ برطانیہ میں برسراقتدار پارٹی کے امراء اس بات سے اپنی تشفی کرلیتے ہیں کہ جنرل فرانکو کے فتحیاب ہونیسے اسپین میں اشتراکیت کی علمبرداری باقی نہ رہیگی۔
برطانیہ اور امریکہ کے تعلقات پر سرسری نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔ برطانیہ کے موجودہ برسراقتدار امراء کی پارٹی جو کلائیوڈن گروپ[2] کے نام سے مشہور ہے، امریکہ کے پریسیڈنٹ روزویلٹ کے بالشویک رجحانات کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتی۔ امریکہ اور برطانیہ کے تواریخی تعلقات کے ماتحت ہمیشہ بُنیادی اختلاف رہا ہے گو جنگ عظیم کے آخر وقت میں برطانیہ نے امریکہ کو ملالیا تھا اور اِسوقت بھی جو اتفاق و یگانگت برطانیہ اور امریکہ کے درمیان ہے۔ اس کا اصلی باعث چین میں جاپان کی مداخلت ہے۔ کیونکہ امریکہ اور برطانیہ دونوں کا مفاد چین کی آزادی سے وابستہ ہے۔ امریکہ اور روس میں زیادہ گہرے تعلقات ہوجانے کا امکان ہے، مگر برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ وہ جرمنی، اٹلی اور فرانس کو ملاکر روس کو تمام طاقتوں سے علیحدہ کردے اور اس کی یہ بھی کوشش ہے کہ امریکہ کو روس سے

[2] Cliveden Group. [1] German Poland non-aggressive Pact

الگ کرکے اپنی رائے میں شامل کرلے۔

بہرکیف برطانیہ کی جدید پالیسی سے فرانس، امریکہ اور وسط یوروپ کی ریاستوں کو جو اعتماد برطانیہ پر تھا باقی نہیں رہا۔ اس کے دوسرے پہلو پر غور کیا جائے تو دراصل برطانیہ خود بے یار و غمخوار رہ گیا ہے اور عجب نہیں کہ تمام کوششوں کے باوجود بھی برطانیہ کو بالآخر جرمنی کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اُس وقت جرمنی کہیں زیادہ طاقتور ہوچکا ہوگا۔ اور بجز فرانس کے جو کسی طرح برطانیہ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ کوئی دوسری طاقت برطانیہ کا ساتھ نہ دیگی۔ چنانچہ برطانیہ کی جدید پالیسی کے خلاف انگلستان ہی میں بڑا شور و ہنگامہ برپا ہے اور تمام دیگر پارٹیوں نے مسٹر چیمبرلین کی پالیسی سے آزردہ ۔ متحد ہو کر پارلیمنٹ میں انکا اقتدار زائل کرنا چاہا۔ لیکن ٹریڈ یونین پارٹی خالص طور پر برسر اقتدار آنا چاہتی ہے اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ شامل ہوکر حکومت کرنا مناسب نہیں سمجھتی، ورنہ چیمبرلین پارٹی کا ابتک خاتمہ ہوگیا ہوتا۔

اُدھر جرمنی کے دانت چیکوسلاویکیہ پر لگے ہوئے ہیں۔ روس کو بھی جرمنی سے برابر اندیشہ لگا رہتا ہے اور وہ یقیناً چیکوسلاویکیہ اور ریاستہائے بالٹک کے معاملات پر جرمنی اور پولینڈ سے برسر پیکار ہونے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایسی صورت میں جاپان دوسری طرف اُس کے لئے مشکلات پیدا کردے گا۔

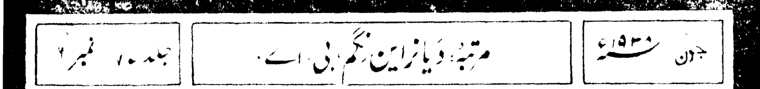
میکسیکو کی گورنمنٹ بھی اشتراکیت کی طرف مائل ہے اور جب برطانیہ نے اسپین کو اسلحہ جات اور دیگر سامانِ جنگ فروخت کرنے سے انکار کردیا۔ تو میکسیکو نے ہر طرح سے اسپین کی مدد کی۔ لہذا برطانیہ اشتراکیت کی حامی حکومت کو کس طرح پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا۔ اِس لئے جذبات کے اظہار کے لئے موقعہ کی تلاش تھی، چنانچہ حال میں برطانیہ پچھلے قرضے کی ادائیگی کا تقاضا کر بیٹھا۔ گو خود برطانیہ جنگ عظیم کے زمانہ کے امریکہ کے قرض کی ادائیگی سے معذور رہے۔ میکسیکو کی گورنمنٹ نے اِس تقاضے سے کبیدہ خاطر ہوکر برطانیہ سے تعلقات منقطع کرلئے ہیں۔ برطانیہ سے تعلقات منقطع کرنے پر میکسیکو کو تیل کی کانوں کے متعلق دوسرے ممالک سے کاروبار کی آزادی رہیگی۔ انگریزوں کے ہاتھوں سے میکسیکو کا بازار نکل گیا جس سے یانکی (Yankee) کے سرمایہ داران خوش ہیں۔

مشرق بعید میں چین اور جاپان کے مابین جو جنگ چھڑی ہوئی ہے اسکا خاتمہ نظر نہیں آتا۔ عارضی فتوحات کو زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیئے۔ جاپان غالباً خود بہت زیادہ پریشان ہے۔ اگر وہ جنگ کا سلسلہ جاری نہیں رکھتا۔ تو آیندہ کے لئے اُسکا دبدبہ مٹا جاتا ہے۔ لہذا اُس کے لئے اِس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔ کہ چین کے ساتھ جنگ کا سلسلہ جاری رکھے۔ اسلئے اگر یہ لڑائی برسوں چلتی رہے تو کوئی تعجب نہیں۔

The ZAMANA, June 1938.

زمانہ

ZAMANA



جون ۱۹۳۸ء

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔ اے۔

جلد ۷۰ نمبر ۶

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا

فی پرچہ سات آنہ

زمانہ کے پُرانے فائل

دفتر ہذا میں سنہ ۱۹۲۶ سے پُرانے فائل موجود ہیں۔ زمانہ کے تشنگانِ ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ پینتس ۳۵ سے اُردو زبان وادب کی کس قدر انہماک وسرگرمی سے خدمت کر رہا ہے۔ اِس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پُرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریداروں کیساتھ حسب ذیل رعایت کیجائیگی۔

۱۔ گیارہ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے ۲۸ روپیہ

۲۔ چار سال کے خریدار سے تین ۳ روپیہ فی فائل سالانہ

۳۔ ایک سال کے خریدار سے ۳ علاوہ محصول

نوٹ:۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہئیے

فائل سنہ ۱۹۲۸ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں۔ سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں۔

مینیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

واردات

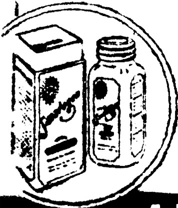
منشی پریم چند مرحوم کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ نہایت محدود تعداد میں شائع ہوا ہے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔ ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**



قوت مردانگی جاذب توجہ ہوتی ہے

جب ہم ہر وقت خود کو تھکا ہوا اور کمزور محسوس کرتے ہیں اُسی وقت ہم کو یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ طاقتور اور تندرست ہونا کیا چیز ہے سالہا سال کے تجربوں کے بعد ہوشیار سائینسدانوں نے یہ معلوم کرنے میں کامیابی حاصل کی کہ طاقت کن چیزوں سے پیدا ہوتی ہے اور اُس کے بعد اُنھوں نے ایک زود ہضم سفوف تیار کیا ہے جو وہی طاقت بخشتا ہے۔ جس کی جسم انسان کو ضرورت ہے، یہ سفوف سیناٹوجن کہلاتا ہے۔

اِس سفوف کے چند چمچہ چائے تھوڑے سے پانی میں ڈال کر دن میں دو تین مرتبہ استعمال کیجئے اور تھوڑے سے عرصہ میں آپ دیکھینگے کہ آپکے جسم میں طاقت کی رو بہہ رہی ہے۔ آپ بہت جلد خود کو طاقتور دیکھینگے حتیٰ کہ تندرستی اور شباب بڑھتے ہوئے ہونگے۔ لہٰذا آج ہی سیناٹوجن کی ایک شیشی خرید لیجئے۔



مسٹر ایم۔ وی۔ ایس۔ بی تحریر فرماتے ہیں:۔ مجھے عادت ہے کہ جب کبھی میں اعصاب کی کمزوری محسوس کرتا ہوں تو میں سیناٹوجن استعمال کر لیتا ہوں۔ اسلئے مجھے جو فائدہ ہوتا ہے وہ بہت حیرت انگیز ہوتا ہے سیناٹوجن استعمال کرنیکے تھوڑی ہی دیر بعد دوسرا آدمی معلوم ہونے لگتا ہوں اعصابی شکایتوں کیلئے صرف یہی ایک چیز ہے

SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

تمام دوا فروشوں اور بازاروں سے دستیاب ہوتی ہے۔

تیاری کے کسی مرحلہ میں سیناٹوجن کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا اور اسمیں کسی ذات یا مذہب کے خلاف کوئی شے نہیں ہے۔

زمانہ

جلد ۷ — جون ۱۹۳۸ء — نمبر ۶

فارسی اور سنسکرت کے تلفّظ میں مطابقت

(از مسٹر سلیم جعفر)

فارسی اور سنسکرت کا ماخذ ایک ہونے کی وجہ سے دونوں کے تلفظ کا یکساں ہونا بالکل فطری ہے۔ لیکن اپنے سامی ہمسایوں کا اثر قبول کر کے فارسی نے کسی قدر اپنا تلفظ بدل دیا ہے جس کا پتہ لگانے کے لئے ہمیں اُس کے طریق اِملا پر غور کرنا پڑے گا۔ اَوَستا کے رسم الخط میں زند اَوَستا اور پاژند یا پہلوی کے پڑھنے والوں کے سامنے اس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ مگر بالعموم فارسی خواں اس سے ناواقف ہیں اس لئے یہاں کچھ مختصراً عرض کیا جاتا ہے۔ اس خط میں لفظ کا ہر حرف ہی الگ الگ نہیں لکھا جاتا بلکہ حروف علت جن سے اعراب کا کام لیا جاتا ہے وہ بھی الگ الگ اور اُس حرف صحیح کے بعد ہی لکھے جاتے ہیں جو ان کا معمول ہے۔ اس کا اور رومن خط کا جس سے انگریزی خط نکلا ہے ایک ہی حال ہے۔ مثلاً لفظ زَدْ اوستا کے رسم الخط میں لکھنا ہو تو ےدو لکھا جائیگا، اس میں پہلا حرف زَ ہے، دوسرا فتحہ اور تیسرا دْ ساکن۔ اسی کو اگر زَدَ لکھنا ہو تو فتحہ کے لئے آخر میں ایک حرف اور بڑھانا اور یوں لکھنا پڑتا ہے ےدوىد۔

اب دو نمونے ملاحظہ فرمائیے:۔

اَوَستا = (۱) [illegible]

کمو شُ نَ اُو ثھ رَ آ ۂ رَ ہِ ے.

مَ زْ دَ اُدْ تَ رُوءِ دِ یِ تِ ے آ نُ رَ ہِ ے

مَ ہِنُ بِ ے اُشْنُ

ترجمہ = خوشنودی ہرمزد کی (نصیب ہو) لعنت ہو اہرمن پر۔

پاژند یا پہلوی = (۲)

آ ہُ رَ مَ زْ دَ کْھُ دَ و ا ےَ آ ژْ

ہَ مَ ا گُ نَ ا ہُ پَ تِ ےُ تَ

پَ سِشْ ےُ مَ اُنُ نُ و مُ

اَہُرمَزدَ کھُودائے اَژ ہَما گُناہ پَتِیَت پَشِیما نُومُ۔

ہمارے قواعد فارسی کے ہندوستانی مصنف ہمیں بتاتے ہیں کہ فارسی میں لفظوں کے شروع میں ایک الف آتا ہے جسے الف وصلی کہتے ہیں۔ جن لفظوں کے شروع میں یہ الف آتا ہے وہ مع اس کے اور بغیر اس کے دونوں طرح لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ اس کی مثالیں وہ یہ دیتے ہیں

اَگر۔ اَبَر۔ اَبا۔ اَبے۔ اِشکم۔ اِستم۔ اِشکرہ۔ اُشتر۔ اُشتُلم۔ اُعجوبہ۔
اَستر۔ اَسکرف۔ افراسیاب۔

اس الف وصلی کے بڑھانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ عربی میں کوئی لفظ ابتدا بالساکن نہیں ہوتا۔ غیر زبانوں سے عربی نے جو لفظ لئے ہیں اُن میں جب اسے اس قسم کے لفظوں سے سابقہ پڑا ہے تو اُس نے بوقت تعریب ایک الف بڑھا دیا ہے تاکہ تلفظ میں دقت نہ ہو۔ مثلاً Plato افلاطون Sponge اسفنج۔ عربوں کے اس قاعدہ کو ایرانیوں نے بھی اختیار کرلیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود ان کی زبان کے لفظوں میں بہت سے ایسے لفظ تھے جو ابتدا بالساکن تھے مثلاً مذکورہ بالا دو مثالوں میں سے پہلی مثال کے پہلے لفظ کے شروع کے دونوں حرف ملاحظہ کیجئے جو ساکن ہیں۔ لیکن ایرانیوں نے اس حذف و اضافہ میں بے اصولی سے کام لیا۔ انھوں نے اکثر وہاں الف گرا دیا جہاں لفظ کا پہلا حرف ساکن نہ تھا گو سہولت تلفظ جو عربی کا اصلی مقصد تھا

اسے ہاتھ سے نہیں جانے دیا یعنی حذف الف کے بعد انھوں نے اس کے مابعد کو اگر متحرک نہ تھا تو متحرک کر دیا۔ مثلاً اگر جس کو میں سنسکرت کا اَگْرَ (अग्र) سمجھتا ہوں، حذف الف کے بعد اس کا کاف مفتوح کر دیا۔ اُپَر۔ جس کا مترادف سنسکرت کا اُپَرِ (उपरि) ہے اسے مخفف کر کے بَرْ بنا دیا۔ عربی سے ب بمعنی معیت لی تو اُس کے آگے پیچھے دونوں طرف الف بڑھا کر اَبَا گھڑا۔ اور بے جس کا مترادف سنسکرت کا وِ (वि) ہے اس پر بے وجہ الف لگایا۔ درحقیقت اِن میں سے پہلے دو یعنی اَگَر اور اَبَرْ میں تو الف وصلی ہے ہی نہیں۔ عربی کی بے بمعنی معیت وغیرہ جب کسی لفظ کے شروع میں آتی ہے تو ہمیشہ متحرک ہوتی ہے۔ اسی طرح بے بذاتِ خود متحرک ہے اِن دونوں میں الف وصلی کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ اَستر سنسکرت کا اَشْوَتَرَ (अश्वतर) ہے۔ مگر اصول کی اصلیت بھول جانے کے بعد بے اُصولی نے اپنا کرشمہ دکھایا۔

اِشکم کے اشتقاق و ماخذ کا پتہ نہیں۔ اِشتم کا مادہ سُتَمْ ہے جو دسویں گَن (باب) میں ستانا کے معنی بھی رکھتا ہے۔ اِشکرہ کا مادہ اُس + کُرِ (उस + कृ) ہے۔ ان میں سے۔ اِستم میں الف وصلی ہے، لیکن اشکرہ میں الف اصلی ہے جسے استعمالِ عام نے گرا دیا۔

اُشتلم۔ اعجوبہ۔ اشتر اور افراسیاب میں پہلا ترکی ہے اور دوسرا عربی جس کی نسبت صاحب غیاث اللغات لکھتے ہیں "بضم ہمزہ بمعنی عجیب و انچہ مردم را در تعجب اندازد نہ بغیر ہمزہ۔ از مزیل الاغلاط"۔ یوں بھی یہ عجیبہ کی جمع ہے۔ اشتر سنسکرت کا اُشْٹْرَ (उष्ट्र) ہے۔ افراسیاب کی اصل ہے فْرَاںْ ھَرَشْیَ ([illegible]) شروع کے تینوں لفظوں میں الف اصلی ہے۔

مذکورۂ بالا مثالوں میں زیادہ تر وہ ہیں جن میں الف اصلی ہے اور استعمال عام نے گرا دیا۔ الف اصلی کے گرا دینے کا ثبوت انھیں چند مثالوں سے نہیں ملتا بلکہ اُفتادن۔ افروختن۔ افرودن افسردن۔ افشاندن۔ افشردن اور افگندن، جن کا اَف سنسکرت کے اَبھِ (अभि) کا مترادف ہے اور جن میں سے الف گرا دیا گیا ہے، سب اس کی تائید کرتے ہیں کہ فارسی الف گرا دیتی ہے۔

اِس صورت میں کثرت کو قلت پر ترجیح دینے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جو الف اصلی لفظ کے شروع میں آتا ہے فارسی اکثر اس کو گرا کر اس کے مابعد کو متحرک کر دیتی ہے۔ لیکن اگر ہم مذکورۂ بالا مثالوں ہی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوتے تو شاید اس الف وصلی کا ذکر بھی نہ کرتے، مگر دائرۂ تحقیقات تنگ نہ ہونے کی بنا پر چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ سنسکرت میں جو لفظ ابتدا ﺍﭘﺴﺎ گن ہیں ان میں فارسی

نے ایک الف بڑھایا ہے۔

اَبرو (بْھرُ = भ्रू) اخروش = خروش (کْرُشْ = क्रुश = مادّہ) استادن = ستادن
سْتھا = स्था = مادّہ) استارہ = ستارہ (سْتَرَ = स्तर) استاندن = ستاندن
(سْتینْ = स्तेन्)۔ استم = ستم (سْتَمْ = स्तम् = مادّہ) استوار (سْتھاور =
= स्थावर) اُستور = ستور (سْتھُورَ = स्थूर) استون = ستون (سْتھُونا = स्थूणा)
اَردشیر ऋषि - اَرش - ऋतत्वन -

درحقیقت ہمارے قواعد نویس نے مثالوں کے انتخاب میں غلطی کی ورنہ اس کے نظریہ کی تائید کے لئے فارسی میں بہت سے لفظ ملتے ہیں۔ غرض یہ کہ الف وصلی ثابت کرتا ہے کہ کسی نہ کسی زمانہ میں بعض فارسی لفظوں کا تلفظ ابتدا بساکن کیا جاتا تھا جیسا کہ آج کل بھی سنسکرت میں پایا جاتا ہے۔

واو معدولہ بھی ہمارے نظریہ کو ثابت کرتا ہے۔ اس کے تین محل استعمال بتائے جاتے ہیں،

(۱) "بیان ضمّہ و اتمام لفظ" جو کہ "تو۔ چو۔ دو" میں پایا جاتا ہے۔

(۲) عطف جیسے "کرد و گفت"

(۳) "اِشمام ضمّہ" جو کہ "خود۔ خویش" وغیرہ میں ملتا ہے۔

تو (त्वम्) اور۔ دو (द्वि) میں واو اصلی ہے۔ اور بیان ضمّہ و اتمام لفظ کے لئے نہیں بڑھایا گیا۔ بعض وقت ضرورتِ شعری یا اور کسی وجہ سے انھیں مخفف کر دیتے ہیں، اس وقت بیشک ان کی آواز تائے مضموم اور دال مضموم کی سی ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضرورت نہ ہو تو ان کے تلفظ میں واو کی آواز صاف صاف سُنائی دیتی ہے۔ اور آج کل کے ایرانی انھیں بالکل اس طرح بولتے ہیں گویا ان میں واو معروف ہے۔

واو عطف عربی سے لیا گیا ہے اور دو لفظوں کے بیچ میں آتا ہے تو اپنے ماقبل کو ضمّہ دے کر اس سے مل جاتا ہے۔ یہ تلفّظ پتا دیتا ہے کہ فارسی میں بھی سنسکرت کی سَندھی (सन्धि) کے آثار موجود ہیں۔ سنسکرت کا طریقہ ہے کہ جب دو لفظ ملائے جاتے ہیں اور اُن میں سے پہلے لفظ کا حرفِ آخر مفتوح (अ) ہو یا الف ماقبل مفتوح (आ) اور دوسرے لفظ کا حرفِ اول الف مضموم (उ) ہو تو دونوں تلفّظ مل کر اَو (ओ) ہو جاتا ہے۔ جیسے مَہا + اُپا دھیایَ (महा+उपाध्याय) کو مَہوپا دھیایَ (महोपाध्याय) بولتے ہیں۔

تیسرا محلِ استعمال سنسکرت سے نسبت کا بیّن ثبوت ہے۔ فارسی نے عربی کے اثر سے کیئے یا

سہولتِ[1] تلفظ کی غرض سے عرصہ سے لفظوں کو ابتدا لبساکن بولنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے اس نے خواب۔ خواہر۔ خواندن۔ خوردن وغیرہ میں سے حرف دوم سے اشمام کا کام لے کر اور خود اس کو ساکن کر کے حرف اوّل پر ضمّہ لگا دیا۔ اس قسم کے تمام لفظوں کے سنسکرت کے مادّوں میں سُو (स्व) پایا جاتا ہے۔ مثلاً خواب۔ خواندن اور خوردن کے مادّے بالترتیب سُوَپ (स्वप) سُوَن (स्वन) اور سُوَرْدْ (स्वर्द) ہیں۔ خواہر کا مترادف سنسکرت سُوَسْر (स्वसृ) ہے۔ اور خَے (مخفف خوے۔ پسینہ) کا مرادف سوِید (स्वेद) ہے جس کی دال بدل کر ے ہو گئی۔

ہائے مختفی تیسرا حرف ہے جو ہمارے خیال کی تائید کرتا ہے، اس کے چار محلِ استعمال ہیں جن کی مثالیں بالترتیب دندانہ۔ یکسالہ۔ گفتہ اور جامہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے میں یہ نسبت و شباہت کے لئے لگائی گئی ہے، دوسرے میں تشخیص و تعیین مدت کرتی ہے، تیسرے میں انتہا و اتمامِ حرکت کا کام دیتی ہے اور چوتھے میں بیانِ فتحہ کے لئے بڑھائی گئی ہے مگر معنی میں دخل نہیں دیتی۔ درحقیقت پہلی اور دوسری مثالوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں کی ہ سنسکرت کے کَ (क) یا کاف ماقبل مفتوح (अक) کا بدل ہے۔ گفتہ کی ہ سنسکرت کے وِسرگ (विसर्ग) کے جواب میں ہے، اس کو چاہئیے تو اتمام حرکت کے لئے مان لیجئے، سنسکرت تائید کرے گی۔ لیکن جامہ کی ہ کی نسبت کوئی بات تحقیق سے نہیں کہی جا سکتی۔ پلاٹس نے اپنے لغات "ہندوستانی۔ کلاسکل ہندی اور انگریزی" میں اس کا مادّہ یَم یا یَمْل بتایا ہے لیکن اس کی تائید نہ تو دھاتُ۔ پاٹھ سے ہوتی ہے اور نہ امرکوش سے۔ اگر پلاٹس کی تحقیق صحیح مان لی جائے تو اس میں بھی اسی قسم کی ہ ہو گی جو دندانہ اور یکسالہ میں ہے۔ ہائے مختفی جہاں درحقیقت اتمام حرکت کا کام دیتی ہے وہ الفاظ کہ (بیانیہ) چہ (کیا۔ استفہامیہ) نہ (نہیں) اور پاشنہ وغیرہ ہیں۔ یہ طریق اظہار تلفظ درحقیقت عربی سے لیا گیا ہے اگرچہ تقلید کلّی نہیں۔ شمالی افریقہ اور ہسپانیہ کے عرب غیر زبانوں کے اُن لفظوں میں جن کے آخر میں واو مجہول آتا ہے حرفِ ماقبل آخر کی حرکت ظاہر کرنے کو اگر وہ مضموم ہو تو ہ بڑھایا کرتے تھے، مثلاً کارلو (Carlo) کو معرّب کر کے قارلہ لکھتے تھے۔

تلفظ سنسکرت کی دونوں خصوصیتیں یعنی (۱) لفظوں کے پہلے حرف کا ساکن ہونا اور (۲) لفظوں کے حرفِ آخر کا بالعموم متحرک ہونا فارسی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس نے ہندوستانی زبانوں کی طرح ان پر پردہ ڈال دیا۔

---

[1] میں اس کو سہولتِ تلفظ ہی کے کرشمے سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس کا پتا ہندوستانی زبانوں میں بھی چلتا ہے۔ دیکھئے مضمون "حسن ارکان الفاظ" زمانہ بابت۔ فروری ۱۹۳۶ء

"مَیں کیا ہوں؟"

از جگدیش سہائے سکسینہ، بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

ہزار حیف اسیرِ طلسمِ دُنیا ہوں
فریب خوردۂ نیرنگیِ تمنّا ہوں

کبھی ہوں بزم طرازِ سرورِ عالم میں
کبھی رہینِ ستمہائے چرخِ مینا ہوں

گلے کا طوق ہے یہ الفتِ زن و فرزند
اِسی کو راحتِ قلبِ حزیں سمجھتا ہوں

کوئی رفیق ہے میرا نہ کوئی ہمراہی
سرائے دہر میں اِک رہروِ جریدہ ہوں

فدائے جلوۂ صورت ہوں وائے نادانی
جہاں میں آکے حقیقت کو بھول جاتا ہوں

مِرے وجود میں مضمر ہے حُسنِ لافانی
اُفق پہ زیست کے گو صبح کا ستارہ ہوں

کرے نہ رنج کوئی اپنی بے ثباتی کا
کہ مَیں پیامِ بقائے دوام لایا ہوں

نہ سمجھو خاک کے ذرّوں سے ہے مری تخمیر
بہارِ باغِ لطافت ہوں مرغِ سدرہ ہوں

کیا ہے ذوقِ اسیری نے ایسا وارفتہ
کہ اُڑ کے خود قفسِ عنصری میں آیا ہوں

نگاہِ دیدۂ تحقیق سے مجھے دیکھو
کہ جس کو بحر سے نسبت ہی مَیں وہ قطرہ ہوں

مرے جمال سے روشن ہے محفلِ عالم
مَیں وجہِ گرمیِ ہنگامہائے دُنیا ہوں

بجا ہے، گر مجھے کہئے خلاصۂ ہستی
کہ مَیں نظامِ دو عالم کا اصل منشا ہوں

کبھی ہوں مَیں اَرِنی گوئے وادیِ ایمن
کبھی و فورِ تجلّی سے برقِ سینا ہوں

فراق ہو تو مجسّم غمِ محبّت ہوں
وصال ہو تو سراپا جمالِ یکتا ہوں

طلسم خانۂ ہستی میں چشمِ بینا کو
نیاز و ناز کی نیرنگیاں دکھاتا ہوں

یہ کائنات حجابِ رخِ حقیقت ہے
مَیں بزمِ دہر میں ازدرونِ پردہ ہوں

مجھے کیا ہے مری خود فروشیوں نے عیاں
کہ ذرّے ذرّے میں دنیا کے جلوہ فرما ہوں

اگلے وقتوں میں شادی بیاہ اور سوسائٹی کی اخلاقی حالت

از دیا نراین نگم

شاعر کا قول ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہو، لیکن صحیح نقطۂ خیال سے دیکھئے تو اِن بزرگوں کو موجودہ زمانہ کے سامنے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ معاشرت، وضع قطع اور خیالات سب میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے، اور اگلوں کی بعض خوبیاں اب کمزوریوں میں شمار ہونے لگی ہیں، لیکن ہر زمانہ کی وضعداری وخوش باشی کا معیار خاص ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کے طور طریقوں کو اسی معیار سے جانچنا چاہیئے۔ مثلاً اگلے وقتوں میں برادری، کُفو یا کنبہ کا جتنا خیال تھا آج اُس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ شادی بیاہ کے متعلق اگلے زمانہ کی پابندیاں اب بہت کچھ ڈھیلی پڑ چکی ہیں۔ ساٹھ سال پہلے برادری کے باہر شادی بیاہ کا خیال ممکن نہ تھا، اب یہ معمولی بات ہوگئی ہے، اور سول میرج کا رواج شروع ہوگیا ہے۔ آگے چلکر اس میں اور ترقی ہوگی۔

سوشل تقریبات کی وقعت میں بھی عام طور پر فرق آگیا ہے۔ ختنہ۔ عقیقہ۔ کن چھیدن۔ مونڈن، مکتب یا ودیا آرنبھ وغیرہ رسمیات جس دھوم دھام سے پہلے منائی جاتی تھیں جس شوق سے عزیزا قارب، یار آشنا اِن تقریبات میں جمع ہو جاتے تھے اس کا آج کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ایسے موقعوں پر دعوت۔ جلسہ۔ داد و دہش اور مہمان نوازی، سب میں لوگ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی موقعے لباس و زیور کے دکھاوے کے ہوتے تھے، جاڑے میں ہر براتی کے پاس دو شالہ ہونا ضروری تھا غریب رشتہ داروں کے لباس کی فکر کرنا پڑتی تھی۔ بعد میں انگریزی تعلیم نے کوٹ۔ پتلون۔ کالر ٹائی کا رواج پھیلا کر نئی پیچیدگیاں پیدا کردی تھیں ورگواب دھوتی کرتا یا پاجامہ ہی سے کام چل جاتا ہے۔ لیکن پچاس ساٹھ سال اُدھر کوئی شریف اس وضع سے گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ لکھنؤ میں تو کوئی شخص چوگوشیہ یا دو پلی ٹوپی کے ساتھ گلے میں تہ کیا ہوا

---

۵ ۲-مئی ۳۸ء کو یہ مضمون لکھنؤ براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہوا تھا۔ ڈائرکٹر صاحب اسٹیشن مذکور کی اجازت سے اب یہ "زمانہ" میں شائع ہو رہا ہے۔ (ا-ز)

رومال یا دوشالہ ڈالے بغیر نظر نہ آتا تھا۔ شریفوں کی وضع قطع سے ریاست و تمکنت کا اظہار ضروری تھا۔ اُن کی بول چال، نشست و برخاست میں بھی ایک خاص سلیقہ نمایاں رہتا تھا۔ غرض اُن کی ہر بات میں تکلّف تھا۔ غریب بھی اپنے رنگ میں مست تھے، اور امیروں کا کہنا ہی کیا۔ اس انداز سے چوک کی سیر کو نکلتے کہ "گلے میں منّت کے طوق پڑے ہیں، بازو میں امام ضامن بندھا ہوا ہے، چُست انگرکھا زیب بدن، چوڑیدار پاجامہ پنڈلیوں سے چپکا ہوا، نکّے دار ٹوپی سر پر آلپین سے رُکی ہوئی۔ مصاحبین ساتھ، خدمتگار کے ہاتھ میں خاصدان اور بغل میں بٹیروں کی کابک دبی ہوئی۔" حُقّہ کا اس قدر رواج تھا کہ گلی کوچہ اور میلوں ٹھیلوں میں جگہ جگہ حقّہ پلانے والے موجود، کوئی محفل حقّہ سے خالی نہ تھی۔ وکیل مختار صاحبان کچہری میں بھی اپنا پیچوان ساتھ رکھتے تھے۔ اور پالکی گاڑیوں میں بیٹھے حقہ نوش فرماتے ہوئے کچہری آتے جاتے تھے۔

مردوں میں زیور کا رواج عام تھا۔ دس بارہ سال کی عمر تک کان میں بالیاں، ہاتھ میں جوشن پہونچیاں، گلے میں تعویذ کنٹھا، موہن مالا، اور پاؤں تک میں کڑے اور چھلّے پہننا معمولی بات تھی، اور جوشن، زنجیر مالا اور انگوٹھیاں تو مُسن لوگ بھی تقریبات وغیرہ میں پہنا کرتے تھے۔

عورتوں کا زیور و لباس اس سے بھی بھاری تھا۔ ایک انگریز لیڈی نے نصیر الدین حیدر کی ایک چہیتی بیگم کا حال یہ لکھا ہے کہ "اس کا سڈول نقشہ دیکھکر مجھے بار بار ٹامس مور کی ہیروئن "لالہ رُخ" کی یاد آتی تھی۔ اس کی پوشاک سرخ کمخواب کی تھی، بال بال میں موتی پروئے ہوئے تھے، زلفیں بکھری تھیں، پیشانی پر ایک چھوٹا سا جھومر لٹک رہا تھا جس میں بڑے بڑے موتی اور زمرد جڑے تھے۔ کانوں میں بہت سی بالیاں تھیں جن میں بیشمار لال و زمرد و موتی جڑے تھے۔ گلے میں موتی کے متعدد مالاؤں کے علاوہ کئی ہار اور کنٹھے تھے۔ ناک میں نتھ تھی جس میں دو بڑے بڑے موتی پڑے تھے اور بیچ میں بیش قیمت زمرد تھا۔"

اگلے زمانہ میں عورتوں کے کان کئی کئی جگہ سے چھدے ہوتے تھے۔ اگر اتفاق سے کسی عورت کے نیچے کی لو فقط ایک یا دو جگہ سے چھدی ہو تو یار لوگ اس پر یہ پھبتی کستے کہ "بھانڈوں کے ساتھ نلپنے والا لونڈا معلوم ہو رہی ہے"۔ بیگمات کا ذکر ہی کیا۔ اُن کی لونڈیاں باندیاں بھی طرحدار اور ماما ئیں مُغلانیاں بھی ضلع جگت میں طاق ہوتی تھیں۔

مگر معمولی لوگوں کو یہ سج دھج نصیب نہ تھی، تاہم ہر عورت کم سے کم چاندی کے زیور سے لدی اور سُرمہ۔ مِسّی اور کنگھی چوٹی سے آراستہ رہتی تھی۔ بات یہ ہے کہ عوام میں بیفکری کا دَور دورہ تھا، زندگی کی ضروریات کم تھیں، دنیا کا غم بھی اتنا نہ تھا، خبر رسانی کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ دنیا بھر کے حادثوں کی روزمرّہ خبر ہوتی رہے، ٹیکس کا بھی کوئی بار نہ تھا، غرض ایک محدود دنیا تھی جس میں رونا دھونا تو کبھی کبھار مگر روزمرّہ ہنسی ٹھٹّھا میں وقت کٹتا تھا۔ آئے دن گھروں میں کسی نہ کسی بہانہ سے پکوان پکّا کرتے، دعوتیں ہوتی رہتیں اور ڈھولک بجا کرتی تھی۔ اب زندگی کا معیار بلند ضرور ہو گیا ہے لیکن خوشحالی اور بیفکری رخصت ہو گئی ہے

انیسویں صدی کے خاتمے کے ساتھ یہ حالت ختم ہو گئی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ نے اور بھی انقلاب برپا کر دیا۔ اب ہندوستان کی پُرانی وضعداری کا بالکل خاتمہ سمجھئے، نئے خیالات، نئے نظریئے اور نئی باتیں رواج پا رہی ہیں۔ سادگی۔ صفائی۔ اور ستھراپن کا نیا تصوّر قائم ہو رہا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر، سادگی پسند کی جانے لگی ہے۔ اگلے زمانہ میں کس سج دھج اور دھوم دھام سے براتیں نکلتی تھیں۔ ہاتھی گھوڑے۔ اونٹ، پالکی۔ نالکی۔ رتھ بہل۔ باجا گاجا۔ آرائش۔ آتشبازی اور رقص و سرود کے تمام لوازمات کے ساتھ براتیں شاہی جلوس کے ڈھنگ پر ترتیب دی جاتی تھیں۔ ہزاروں روپیہ نقد و جنس کی صورت میں لُٹا دیا جاتا تھا۔ کانپور میں ایک ماڑواڑی صاحب کی برات نکلی تو روپے پیسے گنّیوں کی اس قدر بارش کی گئی کہ میونسپلٹی کی بیسیوں لالٹینیں چکنا چور ہو گئیں۔ غدر کے بعد ہی ایک کالیستھ رئیس کے یہاں لکھنؤ سے برات آئی تو اُنھوں نے شہر بھر کے بنیوں اور حلوائیوں کو حکم دیدیا کہ تین دن تک جس قدر سامان و مٹھائی لوگ لینا چاہیں اُس کی قیمت وہ خود ادا کر دیں گے۔ جابجا کنوؤں میں شکر کی بوریاں ڈلوا دی گئیں۔ آج کل یہ باتیں حماقت و جہالت میں داخل سمجھی جائیں گی۔ لیکن اُس وقت یہی نام و نمود کا ذریعہ تھیں۔

رسمیات میں بڑی پابندی برتی جاتی تھی۔ اور شادی بیاہ رشتہ داروں اور برادری والوں کے مشورہ کے بغیر طے نہ ہوتی تھی۔ حسب و نسب کا لحاظ مقدم تھا۔ بات کا بھی بڑا پاس تھا اور یہ مثل تو اب تک مشہور ہے کہ زبان ہی سے لوگ بیٹا بیٹی ہار جاتے ہیں۔ غرض زبان کا بڑا لحاظ تھا۔ ایک مرتبہ جو بات طے ہو گئی ہو گئی۔ قرارداد وغیرہ کے مطالبات بھی مقررہ اُصولوں سے باہر نہ ہوتے تھے۔ کل مرحلے بذریعہ خاندان اپنی اور اپنے ہمعصروں کی رائے

سے طے کر دیا کرتے تھے، چھوٹوں کا تعمیل کے سوا اور کوئی فرض نہ تھا۔ آج گھریلو معاملات میں آزادی رائے اور ذاتی حقوق پر زور دیا جا رہا ہے، لیکن ہمارے حق طلب اور آزاد خیال نوجوان کچھ اگلے وقتوں سے زیادہ خوش و خرم زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں!

جب تک بچپن کی شادیوں کا رواج رہا، والدین کو ایک خاص پوزیشن حاصل رہی سمدھیوں کی غیر معمولی عزت کی جاتی تھی۔ بات بات پر لڑکی والے سمدھی کو نذرانے دیتے اور ہر وقت اُن کی آؤ بھگت کرتے رہتے تھے۔ اب بقول شخصے داماد اپنے قبضہ میں ہو جائے تو سمدھی کمبخت سے واسطہ رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

کم سنی کی شادی کا ہندو مسلمانوں دونوں میں عام رواج تھا۔ میرے ایک ڈپٹی کلکٹر دوست کی جو اب پنشن لے کر ایک ریاست کے منیجر ہو گئے ہیں، نو برس کی عمر میں شادی ہوئی تھی۔ بیوی ان سے بھی دو سال چھوٹی تھیں۔ چنانچہ شادی کے دوران میں ایک گلدستے کے پیچھے ننھے میاں بیوی میں خوب دھول دھپّا ہوا۔ وہ تو خیر سے اُن کے والد بزرگوار نے ڈانٹ ڈپٹ کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔ ورنہ خدا معلوم کیا نوبت پہونچتی۔ کمسن دولھا اکثر دو دو تین تین سال تک اپنی بیبیوں سے شرمایا کرتے تھے

براتیوں کے دماغ بھی ڈھونڈھے نہ ملتے تھے۔ "لنکا میں سبھی باون گز کے" یہ مثل انھیں پر صادق آتی تھی۔ "لڑکی والوں کی سب چیزیں ناقص" یہ ایک معمولی اصول تھا۔ براتیوں کو ہر قسم کی فرمایش کا حق تھا۔ اور خدمتگاروں کو بھی گالی سے بات کرنے میں تکلف نہ ہوتا۔ سواری کے گھوڑوں بیلوں کے لئے دانہ گھاس کے علاوہ سیروں گھی اور روٹیاں طلب کی جاتیں اور دینا پڑتی تھیں۔ بعض بعض براتیوں کو فی کس آٹھ آٹھ دس دس آدمیوں کا کھانا دینا پڑتا تھا۔ دعوتوں میں تکلف و نمایش کو بڑا دخل رہتا تھا۔ کھتریوں میں سمدھیوں کے سامنے ایک پتّل کے بجائے کئی کئی پتّل لگانے کا رواج تھا۔ لطف یہ کہ کُل کھانا سامنے آجانے پر مہمان اُسے ہاتھ لگائے بغیر صرف ملاحظہ فرما کر اُٹھ جاتے تھے اور تمام کھانا نائی باریوں کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ کانیکبج برہمنوں کی براتی چال مشہور تھی۔

برادری والوں کو اپنی اہمیت جتانے کے یہی موقع ہوتے تھے۔ "بھات" کی دعوت تمام جھگڑوں کی جڑ تھی مگر شکر ہے اب اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ برہمنوں میں تو یہ مشہور مثل ہے کہ "آٹھ قنوجیا نو چولھے" لیکن کم و بیش سبھی ذاتوں میں اس طرح کے جھگڑے برپا

ہوا کرتے تھے۔ کوئی کہتا کہ "میں فلاں شخص کے ساتھ نہ کھاؤں گا" اور "فلاں مہمان میرے ساتھ بیٹھنے کے لایق نہیں ہے۔" غرض اس قسم کے جھگڑے ہندو براتوں کے معمولی واقعات تھے۔ ایک برات میں تو یہ جھگڑا اس قدر طول پکڑ گیا کہ دولھا کا کام ہی تمام کر دیا گیا اور شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

جن فرقوں میں شراب کی ممانعت نہ تھی اُن کے یہاں سرور کی حالت میں خوب مزیدار باتیں ہو جاتیں، اور بعض اوقات مناظرہ، مباحثہ بلکہ مجادلہ تک کی نوبت آ جاتی۔ لڑکے شعرخوانی اور بیت بازی کرتے تھے اور بڑے بوڑھے بھی اُن کی پارٹیوں میں پڑ کر اُنھیں لڑاتے، پیٹھ ٹھونکتے اور لطف اُٹھاتے تھے۔

ناچ کا رواج مہذب سوسائٹی نے اب بالکل اُٹھا دیا ہے، لیکن چالیس پچاس سال اُدھر رنڈی بھانڈوں کے ناچ سے سب کو دلچسپی تھی۔ تقریبات میں مہمانوں کے لئے انھیں انعام دینا بیوہار میں داخل تھا۔ عزیزوں کے نام لے لے کر گالیاں بھی گائی جاتی تھیں۔ مستورات بھی اِن گالیوں سے مستثنیٰ نہ رہتی تھیں اور لطف یہ کہ انھیں بھی گالیوں کے عوض انعامات دینا پڑتے تھے۔ کبھی کبھی رنڈیوں کو انعامات دیتے دیتے یار لوگوں میں مقابلہ ہو جاتا تھا۔

شادی کی تعداد میں مردوں کو پوری آزادی تھی۔ کُلین، برہمنوں میں دس بارہ بیاہ کر کے تمام عمر سُسرال کی روٹیوں میں کاٹ دینا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

عورتوں کا اخلاقی معیار جداگانہ تھا۔ مسلمانوں میں بھی ازدواج بیوگان کی رسم بند سی ہو گئی تھی مگر دولتمند لوگ بے تکلف کئی کئی شادیاں کر لیتے تھے۔ رنڈیوں کا ملازم رکھنا اور اُن سے تعلق رکھنا بھی کوئی عیب نہ تھا۔ بیویاں اِن باتوں کو مردوں کے لئے جائز سمجھنے لگی تھیں اور بعض تو شوہر کی عشق بازیوں پر علانیہ فخر کیا کرتی تھیں۔ ایک بڑی بوڑھی کا ذکر ہے کہ اُنھوں نے شوہر کی وفات کے بعد اُس کی داشتہ کو بڑی خاطر مدارات سے زندگی بھر اپنے ساتھ رکھا۔ کانپور کے ایک پُرانے رئیس کا ذکر ہے کہ وہ اپنے عیش پسند و جواں مرگ بیٹے کی رنڈی کو تاحیات اس کی پوری تنخواہ جاری رکھنے کو تیار تھے بشرطیکہ وہ گھر میں مرحوم کی بیوہ کی طرح رہے۔ ایسے بھی لوگ تھے جن کو اپنے نقد و سعادتمند اولاد کی بدشوقی کی شکایت رہتی تھی۔ غرض اگلے وقتوں میں سوسائٹی نے مردوں کو عیش اُڑانے کی پوری اجازت دے رکھی تھی۔ البتہ من چلی عورتیں اُس وقت بھی اپنے حقوق منوا کر رہتی تھیں۔ ایسی حالت میں دو بیویوں والے شوہر کی جو گت

ہوتی ہے اس کے اکثر لطیفے مشہور عام ہیں۔

مردوں کی دنیا بالکل جداگانہ تھی، گھر کی عورتوں سے وہ قطعی الگ تھلگ رہتے تھے۔ عورتیں اب بھی "مستورات" کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، مگر اُس وقت اُن کو واقعی زنانہ مکان کی چار دیواری میں بالکل بند پردہ میں رہنا پڑتا تھا۔ گھر والوں تک سے پردہ ہوتا تھا۔ لڑکے یا چھوٹے بھائی کی بیوی سامنے نہ آسکتی تھی، اور تو اور خود بیوی کو اپنے میاں سے حجاب کرنا پڑتا تھا۔ علانیہ بے تکلفی تو بہت دنوں تک جائز نہ سمجھی جاتی تھی، اور کیا مجال جو کوئی بڑی بوڑھی کسی میاں بیوی کو بات چیت کرتے دیکھ لے۔ نئی بیوی کو پلنگ تک اُس وقت جانے کا موقعہ ملتا تھا جب سارا کنبہ محو خواب ہو جاتا۔ اُس کے لئے صبح منھ اندھیرے سب کے جاگنے سے پہلے بستر سے اُٹھ آنا بھی لازمی تھا۔ عرصہ تک شوہر بھی بے تکلف زنانخانہ میں نہ جا سکتا تھا، اور لڑکے کے بیاہ کے بعد کوئی باپ اطلاع کئے بغیر گھر میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔

ہندو مسلمان دونوں میں عورتیں اور مرد علٰحدہ علٰحدہ کھانا کھاتے تھے۔ عورتوں کو مردوں کے بعد کھانے کا موقعہ ملتا تھا بچے والی عورت کے ساتھ البتہ رعایت ہو جاتی تھی۔ بڑوں کے سامنے کوئی شخص اپنے بچے کو نہ گود میں لے سکتا تھا اور نہ اُس سے بات چیت کر سکتا تھا۔ زیادہ اولاد خوش نصیبی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ عورتوں کو یہی دعا دی جاتی تھی کہ "دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو"

مشترکہ خاندان اپنی پوری شان کے ساتھ قائم تھا۔ فرد واحد کی کوئی حیثیت نہ تھی ایک کماتا سب کھاتے۔ بھائی بہن۔ بیٹے بھانجے۔ سالے بہنوئی سب خاندان کے ضروری رُکن تھے۔ بیٹے بھتیجے میں کوئی فرق نہ تھا۔ خاندان کے یتیم، بیواؤں کی پرورش اور لاوارث لڑکیوں کی شادی کا بوجھ خاندان کے ہر شخص پر رہتا تھا۔

انکسار و تکلف کو بڑا دخل تھا، خطوط میں لمبے چوڑے القاب و آداب لکھنے کا عام رواج تھا سب لوگ اپنے کو "کمترین" "احقر" "عاصی" وغیرہ لکھنے کے عادی تھے۔ اپنے گھر کو غریب خانہ کہنا اور دوسرے کے مکان کو دولت خانہ کے نام سے یاد کرنا تہذیب میں داخل تھا۔ نشست برخاست میں رُتبے کا بڑا خیال رہتا تھا، سواری میں داہنے بائیں کا پورا لحاظ ہوتا تھا۔ چھوٹوں کو بڑوں کے سامنے بات کرنے کی جراُت نہ تھی، اُن کے سامنے ہنسی مذاق درکنار حقہ۔ پان تمباکو کا استعمال بھی ناجائز تھا۔ پان پہلے بڑوں کو تقسیم کئے جاتے، پانی پہلے چھوٹوں کو پلایا جاتا تھا۔ غرض ہر بات

کے لئے اُصول اور قاعدے مقرر تھے، اور انھیں کے مطابق عمل ہوتا تھا۔ بڑے بوڑھوں کے سامنے جو بات کہی جاتی لحاظ رکھکر اختصار کے ساتھ کہی جاتی۔ رائے کا اظہار ہمیشہ معذرت کے ساتھ ہوتا تھا، مثلاً ذاتی رائے کے اظہار سے پہلے اس قسم کا فقرہ کہ "میری رائے ناقص" یہ ہے۔ ضروری تھا۔

نوجوان اپنی نشست و برخاست بزرگوں سے علحدہ رکھتے اور بزرگ بھی ان کی صحبتوں سے دُور ہی رہتے تھے۔ اتفاق سے کبھی کسی کا گذر ہوگیا تو سنّاٹا سا چھا جاتا تھا، اور لوگ بڑے میاں کے سامنے بھیگی بلی بن کر دوزانو ہوکر چپ چاپ بیٹھ جاتے تھے۔

مہمانداری میں بڑا اہتمام ہوتا تھا، معمولی لوگ بھی مہمانوں کے لئے قسم قسم کے کھانے تیار کرانا ضروری سمجھتے تھے اور اس بات کا بڑا خیال تھا کہ مہمان کو گھر میں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ اگر کوئی چیز بازار سے منگانی ہوتی تو سات پردے میں چھپا کر لائی جاتی۔ سسرال جاکر پیٹ بھر کھانا معیوب تھا، اس کے متعلق بڑے مزیدار لطیفے مشہور ہیں۔

خیر یہ تو معمولی باتیں تھیں، اگلے وقتوں کی سب سے زیادہ قابل قدر چیز عام وضعداری قواعد کی پابندی اور فرض شناسی تھی۔ ایک دفعہ جس سے جس قسم کا سلوک ہوگیا، مرتے دم تک وہی برتاؤ قائم رہا۔ اگلے لوگ زبان کے سچّے اور بیوہار کے بڑے پکّے تھے۔ اب تو تحریر کی بھی وہ وقعت نہیں جو اگلے وقتوں میں زبان کی تھی۔ قول سے منحرف ہونا شرافت پر بٹّہ لگانے کے برابر تھا۔ اِسی زبان ہی سے لوگ بیٹی بیٹے ہار جاتے تھے۔"

مذہبی چھوت چھات اور کھانے پینے میں پرہیز آج سے کہیں زیادہ تھا لیکن دلوں میں رواداری کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے عزیزوں کو اپنا عزیز سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کے رسم و رواج اور طریقوں کے مطابق برتاؤ کرتے تھے۔ مثلاً کوئی مسلمان اپنے ہندو دوست کے داماد سے ملتا تو اُنھیں مراسم کو ملحوظ رکھتا تھا جو ہندوؤں میں رائج ہیں، اور ہندو دوستوں کی لڑکیوں کے یہاں کے پانی تک کا روادار نہ تھا۔ لڑکے شہر اور محلّہ کے بزرگوں کا خالی نام نہ لیتے تھے، بلکہ کوئی نہ کوئی رشتہ جوڑ کر انھیں مخاطب کرتے تھے۔ دہلی۔ بہار۔ آگرہ و اودھ وغیرہ کے قدیم خاندانوں میں ابھی تک یہی طریقہ رائج ہے لیکن اب یہ وضعداریاں مٹتی جاتی ہیں۔

تیوہاروں میں بھی چنداں تخصیص نہ تھی۔ ہولی۔ دیوالی۔ دسہرہ۔ محرم۔ چہلم وغیرہ سے۔

سبھی لوگوں کو برابر دلچسپی تھی، اور فقیر فقرا کے ساتھ یکساں اظہارِ عقیدت ہوتا تھا۔

رفاہِ عام کا خیال بھی موجود تھا۔ شوالہ۔ مندر۔ مسجد۔ سرائے۔ کنواں وغیرہ بنوانے کا عام دستور تھا۔ وطن کا موجودہ تصور تو تھا نہیں لیکن لوگ اپنے مولد و منشا کی بڑی قدر کرتے تھے، اور پیدائش یا ابتدائی تربیت کے مقام کو اپنا اصلی وطن سمجھتے تھے۔

حکیم اور وید اپنے پیشہ کو روپیہ پیدا کرنے کا ذریعہ نہ سمجھتے تھے۔ فیس کا رواج نہ تھا بلکہ اکثر دوا بھی مفت ملتی تھی۔ ہاں ذی اثر اور دولتمند لوگ اُن کے گذر اوقات کا خیال رکھتے تھے۔

تاش گنجیفہ۔ شطرنج۔ چوسر سے عام دلچسپی تھی۔ ناچ مجرے ہوا ہی کرتے تھے۔ پردے کے رواج نے شاہدانِ بازاری کو بڑا موقعہ دیدیا تھا، اور اربابِ نشاط کو شرفا کی صحبتوں میں خاصہ دخل مل گیا تھا۔ شہروں میں بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ کبوتر بازی سے عام لوگوں کو شوق تھا۔ دیہات میں تیتر لڑانا، بلبل اور طوطے پالنا لوگوں کا عام مشغلہ تھا۔ کشتیاں۔ تیراکی اور پٹہ بازی وغیرہ سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ آگرہ۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ بنارس وغیرہ میں برسات کے زمانہ میں باغوں کی سیر اور جھولے کی دعوتوں کا عام رواج تھا۔ غرض لوگ مزے کی زندگی بسر کرتے تھے اور بہت سی باتیں جو اب معیوب سمجھی جاتی ہیں جائز تھیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اُن کا کوئی اخلاقی معیار نہ تھا۔ بعض کمزوریوں کے باوجود اگلے لوگوں میں چند خاص خوبیاں تھیں جو اب نظر نہیں آتی ہیں۔ اس لئے ہم کو انھیں کمتر سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ بھی نہ بھولئے کہ اگر آج ہم اپنے پیشروؤں کا مضحکہ اُڑائیں گے تو آنے والی نسل ہماری دھجیاں بھی اڑا کر رکھدے گی۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

قطعہ

عالم میں ہیں ہزاریوں تو گورے کالے — اِس پر بھی بہت شاذ ہیں حکمت والے
پھرتی ہیں جہالتیں نہ جانے کتنی — کاندھوں پہ عبائے علم و دانش ڈالے

مجوشؔ

کلامِ فراق

از حضرت فراقؔ گورکھپوری - ایم - اے

عشق فسردہ ہی رہا غم نے جلا دیا تو کیا
سوزِ جگر بڑھا تو کیا دل سے دُھواں اُٹھا تو کیا

پھر بھی حیاتِ عشق میں حُسن کی وہ کسک کہاں
پھر دلِ بیقرار میں دَرْد دبا دیا تو کیا

پھر بھی تو شبنمی ہے آنکھ پھر بھی تو ہونٹ خشک ہیں
زخمِ جگر ہنسا تو کیا غنچۂ دل کھِلا تو کیا

پھر بھی تو بیخودانِ غم رازِ سکوں نہ پا سکے
تو نے نظر کی لوریاں دے کے سلا دیا تو کیا

پھر بھی مری صدائے درد تیرے لئے سکوت ہے
ہِل گیا آسماں تو کیا کانپ اُٹھی فضا تو کیا

عشق کی غفلتیں نثار چھیڑ نہ اے خیالِ یار
تو نے جگا دیا تو کیا غم نے اُٹھا دیا تو کیا

کون سا فرق آگیا گردشِ روزگار میں
عشق تڑپ اُٹھا تو کیا اشک ٹپک پڑا تو کیا

صبر طلسم در طلسم ضبط فریب در فریب
اشک بھی تھم گیا تو کیا دل بھی سنبھل گیا تو کیا

اور اُلجھ کے رہ گیا قصۂ حیات و موت کا
زیست کے راز کھولتی بحثِ فنا بقا تو کیا

منزلِ بیخودیٔ عشق موت کو بھی نہ مِل سکی
جائے گی اتنی دُور تک عمرِ گریز پا تو کیا

دیکھ فضائیں جاگ اُٹھیں زندگی جگمگا اُٹھی
سازِ جنونِ عاشقی چھِڑتے ہی سو گیا تو کیا

عمرِ دوام مِل گئی عالمِ سوز و ساز کو
مجھکو مٹا دیا تو کیا دل کو بُجھا دیا تو کیا

عذرِ ستم کی جان تھی رنجشِ بے سبب تری
جُھک بھی گئی نظر تو کیا آ بھی گئی حیا تو کیا

اب تو تری صدا بھی ہے میری صدائے بازگشت
آج سوالِ عشق پر آئی بھی اِک ندا تو کیا

اور اُداس کر دیا رنگِ سکوتِ ناز نے
وجہِ ملال پوچھتی نرگسِ آشنا تو کیا

دیکھنے والے کو ترے حسرتِ دید رہ گئی
پردہ سا اُٹھ گیا تو کیا جلوہ سا ہو گیا تو کیا

تھیں مری بیقراریاں محرمِ عشوۂ نہاں
ہوش نہ تھے بجا تو کیا دل نہ ٹھکانے تھا تو کیا

وہ تو کسی کا بامِ ناز راہِ جنوں سے مِل گیا
کاٹتی یہ چڑھائیاں عقلِ شکستہ پا تو کیا

دیکھ رہا ہوں اور کچھ حُسنِ کرشمہ ساز میں
ناز تو کیا ادا تو کیا عشوہ تو کیا حیا تو کیا

سُود و زیاں کے لفظ بھی وہم و گماں ہیں سر بسر
حُسن بھی پا سکا تو کیا عشق بھی کھو سکا تو کیا

اپنی نگاہ کے فریب رازِ نشاطِ عشق ہیں
دیدۂ شوق بھی ترے حُسن کو دیکھتا تو کیا

غربت و گمرہی کا نام گوچۂ یار رکھ دیا
گو تھیں تمام منزلیں عشق کے زیر پا تو کیا

کوئی مزاج داں نہ تھا گردشِ روزگار کا
حُسن تھا شادماں تو کیا عشق اُداس تھا تو کیا

پھر بھی تری نگاہ یاد آ ہی گئی فراق کو
بارِ نیاز و نازِ عشق حُسن سے اُٹھ سکا تو کیا

خریداریِ حُسن

از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔اے

رہیں حُسن کی ہم خریداریوں میں
بکیں عشق کی گرم بازاریوں میں

گذر جائے گی اِن حسینوں کے دم سے
حیاتِ دو روزہ پرستاریوں میں

ہر اِک غم کے لذت چشیدہ رہیں گے
حسینوں کی پیہم دل آزاریوں میں

ہوئی عشق ورزی ہے طینت میں داخل
کٹیں گے نہ دن سہل انکاریوں میں

جفاؤں سے چھوٹے گریباں سے اُلجھے
نہیں اہلِ دل رہتے بیکاریوں میں

نہ آیا الہوس دیکھکر ہم کو خنداں
جفاؤں کی ان گرم بازاریوں میں

لکھا یا تھا نام اپنا روزِ ازل ہی
غمِ عشق کی ناز برداریوں میں

ملا ہے ہمیں وہ بھی محبوب ایسا
نہ اقراریوں میں نہ انکاریوں میں

ترے ہاتھ رنگ دیں گے ہم خونِ دل سے
بہارِ محبّت کی گُل کاریوں میں

تری سرد مہری کی ہو گی تلافی
وفا کی مری گرم بازاریوں میں

دکھا ہم کو زاہد نہ ظاہر نمائی
ریاضت کہاں ہے ریا کاریوں میں

چھُپایا ہے ظلمات میں آبِ حیواں
نہ جا تو ہماری سیہ کاریوں میں

محرومؔ اور فلسفۂ غم

از مسٹر جے کرشن چودھری ایم اے، ایل ایل بی

محرومؔ کی شاعری کا سب سے پُرزور نغمہ اُس کا بیانِ غم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم کے اثرات اُس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکے ہیں۔ اور اُسکی تخیلات کی دُنیا کو آہ و فغاں سے معمور کر دیا ہے۔ انگریزی کے شہرۂ آفاق شاعر شیلیؔ کے اِس نظریہ میں کہ "ہمارے سب سے زیادہ شیریں گیت وہ ہیں جو انتہائی جذبۂ غم کا بیان کرتے ہیں" محرومؔ کی ہر دلعزیزی کا راز پنہاں ہے۔

شاعر انسان کے جذبات کا ترجمان ہے۔ اس کا درجہ اتنا ہی بلند اور رفیع ہوتا ہے جتنا کہ وہ انسانی دِل کی گہرائیوں اور پوشیدہ جذبات کے آشکارا کرنے میں ہمارا ممد و معاون ہوتا ہے۔ محبتؔ، حسدؔ، رشکؔ۔ خوشی اور غم کے جذبات یوم تخلیق سے ہمارے دِل کی گہرائیوں میں پیوست ہیں محبت سے بڑھکر نہیں تو اس جذبہ کے قریب قریب غم کا جذبہ انسان کے دِل میں تلاطم بپا کر دیتا ہے۔ اور کوئی جذبہ اتنی شدت سے اِنسان کے دل پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ خوشی کے جذبات چند لمحات تک رہتے ہیں۔ لیکن دُکھ درد کے جذبات جان گُسل اور دیرپا ہوتے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ زمانہ خود بخود زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ لیکن ذراسی نئی تکلیف اُن کو پھر ہرا بھرا کر دیتی ہے۔ اور دُنیا میں قہقہوں کیساتھ آنسوؤں کی جھڑی بھی ہے۔ ایک شاعر کے لئے یا باالفاظ دیگر ایک حسّاس شخص کے لئے دُنیا میں آنسوؤں کی فراوانی ہے، اُس کا قہقہہ بھی آنسوؤں سے آزاد نہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

بارانِ غم سے جب گلِ آدم بھگو چکے ۔ اک قطرہ عیش کا بھی ملایا تبرکاً

اسواسطے میرے خیال میں جو شاعر ہمیں اِس اولیں فطری جذبہ سے لذت اندوز کراتا ہے وہ ہمارے دِل کے عمیق اور نازک تاروں کو چھیڑتا ہے۔ یقیناً ایسے شاعر کا کلام دیرپا ہوتا ہے۔ شاعر کا کام ہمیں محض ہنسانا یا تفریح طبع کا سامان پیدا کرنا نہیں، یہ تو ایک معمولی درجہ کا مذاحیہ نویس بھی کر سکتا ہے، اگر شاعر کے کلام میں سوز نہیں، جذبات کی فراوانی نہیں، دِل کی شکست کی آواز نہیں یا درد و کرب کی تصویر نہیں، تو وہ شاعری نہیں۔

غالبؔ کے کلام کی جاذبیت کی یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے کو اُس کے کلام میں اپنی پُرحسرت اور

پُردرد زندگی کی ایک تصویر نظر آتی ہے۔ ہر شعر اُس کو حسب حال دکھائی دیتا ہے۔ کون ہے جسے دُنیا میں کانٹوں سے الجھنا نہیں پڑا، جسے درد و غم، حسرت و یاس سے پالا نہیں پڑا، جسے آنسوؤں کے موتی پُرونے نہیں پڑے۔ کیا غالب کا ذیل کا شعر اُن کے واسطے آہنگ بے ہنگام ہو سکتا ہے؟ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونو ایک ہیں ۔۔۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اِس شعر میں سوز کا ایک سمندر ہے بے پایاں۔ اور تسکین قلب کا ایک سرچشمہ ہے ابدی اور روح پرور، زندگی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

غالب موت کو قاطع آلام سمجھتا ہے۔ لیکن محروم کا زاویہ نگاہ موت کے متعلق قدرے مختلف ہے محروم اُس کی تباہ کاریوں، اُس کی جفاکشیوں اور اُس کے مظالم کو ایک سہمے ہوئے بچے کی طرح دیکھتا ہے۔ موت محروم کی نظر میں دُنیا کے رنج و محن کا آخری، تاریک اور نہایت ہی خوفناک انجام ہے جس سے بچنے کیلئے وہ بچے کیطرح سعیٔ لاحاصل کرتا ہے۔ کبیر کی طرح اُس کے دل سے موت کے لئے خوش آمدید کی آواز نہیں نکلتی ؎

جا مرنے سے جگ ڈرے میرے من آنند ۔۔۔ کب مریہوں کب پا یہوں پورن پرمانند

کبیر اپنے محبوب کے وصل کی امید سے موت سے بغل گیر ہونا چاہتا ہے۔ ٹیگور موت کو اپنے مالک کا پیغامبر خیال کرتا ہے۔ اور خوشی کے ترانے گاتا ہے۔ لیکن محروم کے دل میں یہ خوشی کا ولولہ نہیں۔ گو اُس نے کسی کسی جگہ موت کے متعلق گیتا کے نظریہ کو نظم کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گیتا کی تعلیم نے محروم کے دماغ پر تو اثر کیا ہے لیکن دل پر نہیں۔ "موت" کے عنوان سے آپ اُنکی نظم پڑھیئے۔ موت کے مظالم کی حسرت بھری تصویریں کھینچی ہیں۔ اور اُن کے آخیر میں گیتا کی فلاسفی سے دل کو تسکین دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بعینہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کہ سانپ کے ڈر سے سہمے ہوتے بچے کو کوئی بھولا ہوا منتر یاد آجائے۔ دراصل محروم نے موت کو شاعر کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا ایک عام آدمی کے خیال سے دیکھا ہے۔ اور اِس پہلو سے اس کی تصویریں نہایت قابل قدر ہیں۔

مارا کسی غریب کو تو نے وطن سے دُور ۔۔۔ ماں باپ سے بہت پرے، بھائی بہن سے دُور

لاشہ کوئی پڑا ہے، مزار و کفن سے دُور ۔۔۔ دست صدائے شیون، و شور و محن سے دُور

پھولوں کی آہ ناز بھری انجمن سے دُور ۔۔۔ گھونٹا گلا ہزار کا صحنِ چمن سے دُور

موت کی وادی کی کیا ہی پُر حسرت تصویر ہے؟

موت کی اِس قسم کی دردناک تصویریں میرے خیال میں اُس ذاتی صدمہ کا نتیجہ ہیں، جو محروم کو

عین عالم شباب میں اپنی بیوی کی موت سے پہونچا ہے۔ یہ صدمہ عین اُسوقت ہوا، جب اوائل شباب کی مسرتوں کے اُمید و آرزو کے گلبن کھلتے ہیں۔ اور حسرت و یاس کے خار پہلو میں نہیں کھٹکتے ایسے وقت میں اپنے حبیب کی موت اپنی آرزوں کی موت معلوم ہوتی ہے اور یہ درد اتنا جگر سوز ہوتا ہے کہ اس کا اثر ساری زندگی پر چھا جاتا ہے۔ جس کا کوئی مداوا نہیں، کوئی تسکین نہیں، کوئی اُلفت کا کا سامان نہیں۔ آپ محروم کی نظمیں جو "طوفانِ غم" کے نام سے لکھی گئی ہیں پڑھئے۔ آپ کو شاعر کی شدتِ غم کی حقیقت اور اُس کے بیانِ غم کی چابکدستی معلوم ہوگی۔ میں نے اِس حصۂ نظم کو کئی دفعہ پڑھا ہے۔ اور ہر دفعہ میں درد و غم کے طوفان سے چیخ اُٹھا ہوں ؎

کسی کے پھول جو گنگا میں ہم بہا کے چلے — جگر پہ آہ! نئے داغ اور کھا کے چلے
وہ پھوٹ پھوٹ کے روئے کنار گنگا پر — کہ نہر پہلو تے دریا میں اک بہا کے چلے
گھٹا نہ آہ ذرا بھی تو سوزِ پنہانی — پلٹ پلٹ کے نہائے، نہا نہا کے چلے
چلے ہیں ویسے ہی جیسے کہ آئے تھے محروم — وطن کو بادلِ غم دیدہ بھر بھرا کے چلے

موت کے مقابلہ میں اِنسان کی ہستی کتنی بے مقدار ہے، فرماتے ہیں ؎

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن — رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں
محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے، کہ ہم — جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں
کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی — اشکوں کو کیا کروں کہ وہ خود سر بلا کے ہیں

یہ صدمہ اُن کے لئے سوہانِ روح بن گیا ہے۔ اور یہی اُن کی شاعری کی روح ہے

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لُطفِ خواب سے — ساز یہ بیدار ہوتا ہے، اِسی مضراب سے (اقبال)

بہر حال کچھ تو طبیعت کی افتاد اور کچھ اس روح فرسا صدمہ کی وجہ سے محروم کی شاعری انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ کہیں دوستوں کی وفات پر آنسو بہائے ہیں۔ کہیں انکی جو کبھی جاہ و حشمت کے مالک تھے اور موت کے بیرحم ہاتھوں سے گوشۂ خاک میں سو گئے، پُر ارمان زندگی اور پُر حسرت موت کی داستانِ عبرت چھیڑ دی ہے۔ کہیں انجام گل۔ سبزۂ نو۔ شمع و سحر کے زیر عنوان غیر فانی زندگی کا تذکرہ ہے، اور کہیں فریادِ یتیم۔ شکوۂ صیاد، بلبل کی فریاد۔ چڑیا کی زاری۔ مچھلی کی بیتابی۔ کوآہو کا بیل، اور اِسی قسم کی دوسری نظمیں اِنسانی ستم و تغافل کے شکار، بے زبانوں کے درد و غم کی داستانیں ہیں۔ محروم کی آنکھیں ہر وقت دوسروں کے غم میں آنسو بہاتی ہیں۔ اُن کا دل ہر دم ہمدردی سے لبریز رہتا ہے اور اُنکا تخیل اُن کے دکھ درد کی تصویریں کھینچنے میں وقف ہے۔ کون ہے جو اِن نظموں کو پڑھے اور درد کے احساس

سے تڑپ نہ اُٹھے۔" کوآہو کا بیل" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ختم ہونے نہیں پاتا وہ سفر ہے اپنا ہم چلے جاتے ہیں دن رات جگر ہے اپنا
کاش! اسی راہ میں آپڑتا عدم کا رستہ اُلٹا افسوس! نصیبا ہی مگر ہے اپنا
تیل ٹپکے ہے پڑا کو لہو سے قطرہ قطرہ خشک ہوتا ہے ادھر لو ہو سے قطرہ قطرہ
مرغزاروں میں نہ جاکر کبھی سبزہ دیکھا بہتے دریا کا نہ سرسبز کنارہ دیکھا
چار دیواری ہی سی تیلی کے گھر کی دیکھی اور اِس قید دوامی میں بھلا کیا دیکھا

اب "یتیم کی فریاد" سنیئے ؎

گہن قسمت میں تھا اپنی، وگرنہ نور برساتے کسی کے مطلع امید پر مثلِ قمر ہم بھی

.. ..

جگہ دیتا ہے۔ باغِ دہر پھولوں میں نہ کانٹوں میں اُڑا لے چل تو اپنے ساتھ اے برگِ خزاں ہم کو

.. ..

وہ لاغر ہیں کہ احسان موت کا بھی اُٹھ نہیں سکتا عدم کی سمت کوئی بے اجل کردے رواں کوئی

بُلبُل کی فریاد سے ایک آدھ شعر سنیئے ؎

اِس قید سے رہائی ممکن اگر نہیں ہے میرا بھی کچھ تو چاہا پروردگار ہوتا
شاخِ نہال پر یا پنجرہ مرا لٹکتا پنجرے میں یا ہجوم سروچنار ہوتا

اِنسانی جوروجفا کی داستانیں چڑیا کی زاری اور مچھلی کی بیتابی میں دی گئی ہیں۔ ایک دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

نزدیک نسلِ اِنسان ہرگز کوئی نہ آئے اپنے جگر پہ ہرگز تیغِ ستم نہ کھائے

.. ..

حیرت میں ہوں نہنگ قضا ہے کہ آدمی جاندار پر ہیں دانت بلا ہے کہ آدمی

خوابِ جہانگیر اور نورجہان کا مزار بھی اِسی رنگ میں خوب نظمیں ہیں۔ جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

منتظر محفلِ عشرت ہے شہا جاگ کہیں او صبوحی کشِ مستانہ ادا! جاگ کہیں

لیکن "نورجہان کا مزار" دردوغم کا ایک مرقع ہے، اور سارا پڑھنے کے قابل ہے۔ ذیل کے اشعار میں غضب کا درد بھرا ہے ؎

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی ہوتی ہو، مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

ٹوٹا ہوا اک ساحل راوی پہ مکاں ہے دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

اُنھوں نے فطرت کی رنگینیوں کی تصویر بھی کھینچی ہے، لیکن اُنمیں بھی درد و غم کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ قدرت کا انتہائی نکھار اُن کے فطرتی جذبۂ غم پر تازیانہ کا کام کرتا ہے "کنارِ راوی" پڑھئے۔ آپ کو اِس امر کی حقیقت کا علم ہو گا ؎

ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں
گلشنِ دہر میں فراغ کہاں چین دیتے ہیں دِل کے داغ کہاں

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

- - - - - - - - - - - -

آنکھ کھولی ادھر ستاروں نے جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے
گو اشارے کئے ہزاروں نے آنکھ کھولی نہ غم کے ماروں نے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

- - - - - - - - - - - -

میکدوں میں چراغ روشن ہیں نورِ مئے سے ایاغ روشن ہیں
کرمکِ شب چراغ روشن ہیں یا مرے دِل کے داغ روشن ہیں

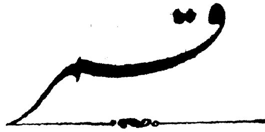
"رخصتِ سرما" میں بھی اِسی قسم کے جذبات پائے جاتے ہیں ؎

مگر آہ! جس چمن کا میں ہوں عندلیب نالاں ہوئیں مدتیں کہ اسمیں نہ کبھی بہار آئی
جو گری فلک سے شبنم، رہی تا سحر وہ گریاں جو صبا کہیں سے آئی تو لئے غبار آئی

جب غم کے ہاتھوں زندگی دو بھر ہو گئی ہو تو عہدِ طفلی کی یاد بے طرح دِل کو تڑپاتی ہے۔ بچپن ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ بے حد شیریں اور بے حد مختصر! "سندھ کو پیغام" پڑھئے ؎

طفلی وہ مری، اور وہ معصوم اُمنگیں لے واے! وہ دِل خوش کن موہوم اُمنگیں
وہ کھیلنا مرا تری امواج سے دن بھر وہ چھیڑ مری بلبلے کے تاج سے دِن بھر
خورشید جہاں تاب کا وہ چھب سے نکلنا محروم کا وہ شوق سے بستر سے اُچھلنا
نورانی دوپٹے میں کرن کا وہ نکھرنا سو ناز سے آمس کا وہ عروسانہ اُترنا

———•••———



از میر طاہر کاشمیری ڈراماٹسٹ

قمر! تو نور کا منبع، خدائے کیفِ ضیا
ترے ظہور کی دنیا کمالِ حسن جلا
ضیا فروشی سے تیری جہاں کی سیم تنی

ہے بے نیازِ حدود و قیود تیری چمک
شبابِ عمر کا حاصل ہو تیری ایک جھلک
فقیر ہے ترے در کا فروغِ حسنِ شبی

ہے تیری گود میں پلتی نشاطِ روحِ بشر
تری نگاہوں میں مضمر ہے مرہموں کا اثر
فنائے درد و صعوبت ہے تیری جلوہ گری

ترے جہان میں ہے بے صدا سُروں کی صدا
کمالِ نغمۂ خاموش تیرا حسنِ ضیا
ہر اک شعاع میں تیری ہے زورِ نغمہ گری

تری دمک میں ہے بیداریِ عروسِ خیال
تری جبیں پہ جھلکتا ہے شاعری کا کمال
لطیف جذبوں کی مادر ہے تیری سادہ روی

رُباعی

جب فکر نے راہ پر لگایا مجھکو
حکمت نے جب آئینہ دکھایا مجھکو
ذرات سے لے کے تا بہ انجم واللہ
جز اپنے کوئی نظر نہ آیا مجھکو

جوش

اہلیا بائی

مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی

مرہٹہ سرداروں میں ملہار راؤ ہلکر کا نام تاریخ ہند میں بہت ممتاز ہے۔ یہ سترھویں صدی کے آخر میں پیدا ہوا تھا۔ ابھی چار پانچ برس ہی کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں کی اپنی سسرال والوں سے اَن بن ہوگئی اور وہ اپنے کمسن بچے کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی۔ ملہار راؤ اپنے ماموں کیساتھ کھیتوں میں کام کیا کرتا تھا اور کئی برس تک اسی کام میں لگا رہا۔ ملہار راؤ کے متعلق ایک عجیب و غریب روایت ہے جس نے گویا اُس کی کایا پلٹ کردی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز وہ بہت دیر تک دھوپ میں کام کرتا رہا۔ جب تھک کر چور ہوگیا۔ تو آرام کرنے کے خیال سے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ ایک تو محنت کی تکان اور پھر آرام دہ سایہ اور ٹھنڈی ہوا، تھوڑی ہی دیر میں نیند آگئی۔ اسی اثناء میں اُس کا ماموں اپنا کام ختم کرکے گھر جانیکو تیار ہوگیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ملہار راؤ کا پتہ نہ تھا۔ سوچا کہ لڑکا گھر چلا گیا ہوگا۔ گھر پہنچا تو وہاں بھی نظر نہ آیا۔ اُس کے ماموں اور ماں دونوں کو تشویش ہوئی۔ دونوں کھیت پر پہنچے، اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد اُس کو ایک درخت کے نیچے سوتے پایا۔ مگر اُنھوں نے ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھا۔ ایک کالا ناگ ملہار راؤ کے چہرہ پر سایہ کئے تھا۔ اِن لوگوں کے پہنچتے ہی سانپ وہاں سے چل دیا۔ اِس واقعہ نے اُس کے ماموں کو یقین دِلا دیا کہ ملہار راؤ "بڑا آدمی" ہوگا۔ اُس نے ملہار راؤ کو فوج میں بھرتی کرا دیا۔ فوج میں اُس نے ایسی نمایاں خدمات انجام دیں کہ پیشوا اُس پر لٹو ہوگیا۔ ملہار راؤ بہت جلد فوج کا کمانڈر ہوگیا اور مالوہ کا علاقہ اُس کو فوجی مصارف کے لئے دیدیا گیا۔

اہلیا بائی، ۱۷۳۵ء میں مالوہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ اُسکے والدین غریب کاشتکار تھے برسوں تک اُن کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جس کی وجہ وہ بہت افسردہ اور مُلول خاطر رہتے تھے۔ اولاد کی اُنھیں بڑی تمنا تھی۔ جب اہلیا بائی پیدا ہوئی تو وہ بیحد خوش ہوئے۔ ایک پنڈت کو زائچہ بنانے کے لئے بُلایا تو اُس نے اہلیا بائی کے باپ سے کہا کہ تمہاری بیٹی کی شادی کسی راجہ کیساتھ ہوگی، اور وہ خود بھی بہت مشہور حکمران ہوگی۔ اہلیا بائی کے باپ کو پنڈت کی بات کا یقین نہ ہوا۔ وہ کہنے لگا کہ

ایک غریب کسان کی بیٹی اتنے بڑے مرتبہ پر کیسے پہونچ سکتی ہے؟

جب اہلیا بائی کی عمر نو برس کی ہوئی تو باپ کو اُس کی شادی کی فکر ہوئی۔ لیکن اُسے کوئی خاطرخواہ لڑکا نظر نہ پڑا۔ اُسی زمانہ میں چند مرہٹہ سردار جو ایک لڑائی سے واپس آرہے تھے مالوہ سے گذرے اور اتفاق سے اُسی گاؤں میں ٹھہرے جہاں اہلیا بائی رہتی تھی۔ اِن سرداروں میں ملہار راؤ ہلکر بھی تھا، جس کی نظر اہلیا بائی پر پڑ گئی۔ اُس نے اس لڑکی کو دیکھ کر تاڑ لیا کہ وہ بہت ذہین اور عقلمند ہے۔ اُس نے دریافت کیا کہ یہ کس کی لڑکی ہے؟ اتفاق سے اہلیا بائی کا گرو بھی وہیں موجود تھا۔ اُس نے ملہار راؤ کو اہلیا بائی کے باپ کا نام بتایا اور اُس پنڈت کی پیشگوئی کا بھی ذکر کیا، جس نے اُس کا زائچہ بنایا تھا۔ یہ سُنکر ملہار راؤ بہت خوش ہوا۔ اُس نے اہلیا بائی کے باپ کو بُلا کر اُس کی شادی اپنے بیٹے کھانڈے راؤ کے ساتھ ٹھہرائی۔ کھانڈے راؤ بھی اپنے باپ کے ساتھ تھا۔ ابتدائی رسوم تو اُسی وقت ادا ہوگئیں، اور ایک ماہ کے بعد پونا میں شادی ہوگئی۔

غریب اہلیا بائی اپنے جھونپڑے سے نکل کر اندور کے عالیشان محل میں پہونچی۔ اُس کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوگیا۔ اُس کے لئے اپنے ساس سُسر کو خوش رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ ایک غریب کسان کی لڑکی تھی اور ملہار راؤ اندور کا راجہ اور ایک جنگجو اور تُند مزاج سپاہی تھا۔ اُس کی بیوی گوتم ایک مغرور، چڑچڑی اور نازک مزاج عورت تھی، لیکن اہلیا بائی نے دونوں کی ایسی خدمت کی اور اِس قدر نیک دلی اور شیریں کلامی سے کام لیا کہ دونوں اُسے اپنی آنکھوں کا تارا سمجھنے لگے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ کھانڈے راؤ جو بہت ہی لااُبالی تھا۔ اُس کے عادات و اطوار میں بھی نمایاں تبدیلی ہونے لگی۔ وہ اپنی بھی اصلاح کرنے لگا اور حکومت کے امور سے بھی دلچسپی لینے لگا۔

اہلیا بائی جب سن تمیز کو پہونچی تو محل کا سارا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کرنے لگی۔ گھر گرہستی کے کاموں سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔ ہر کام کا ٹھیک وقت پر بندوبست کر دیتی تھی۔ اُس نے اپنی فہم و فراست سے محل کے تمام قدیم جھگڑے مٹا دئے اور خاندان کے سب لوگ آپس میں محبت سے رہنے لگے۔ اب سارا خاندان اُس کی عزت کرنے لگا۔ خاندان کا ہر فرد اُس پر جان نثار کرنے کو تیار تھا۔ ملہار راؤ پر جب اپنی بہو کی اعلےٰ قابلیتیں ظاہر ہوگئیں تو وہ روز بروز اُس پر حکومت کا بوجھ ڈالتا گیا۔

لیکن اہلیا بائی کو سہاگ کی خوشی بہت عرصہ تک نصیب نہ رہی۔ ابھی اُس کی عمر انیس سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ اُسکا شوہر ایک مہم میں مارا گیا۔ اور وہ بیوہ ہوگئی۔ اُسوقت تک اُس کے دو اولادیں ہوئی تھیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکے کا نام مالی راؤ اور لڑکی کا نام مکتا بائی تھا۔ کھانڈے راؤ کی

موت کا صدمہ ملہار راؤ کو تو تھا ہی، لیکن اہلیا بائی کی نظروں میں دُنیا تاریک ہو گئی۔ چنانچہ وہ اپنی جان دینے پر آمادہ تھی لیکن اُس کے سُسر ملہار راؤ نے بڑی منت سماجت کر کے اُسے ستی ہونے سے باز رکھا۔ اُس نے کہا کہ کھانڈے راؤ مجھے اِس بڑھاپے میں اکیلا چھوڑ گیا۔ اگر تم نہ ہوگی تو میں کس کے بھروسے پر زندہ رہوں گا۔ میری ضعیفی کا خیال کرو اور رنج و غم کو دل سے دُور کر دو۔ میں تمھیں اپنی اولاد کی طرح رکھونگا اور سارا راج پاٹ اور جو کچھ میرے پاس ہے، تمہارے سپرد کر دوں گا۔

اہلیا بائی نے ستی ہونے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے شوہر کی جگہ اپنے سُسر کی خدمت کرنے، اور حکومت کا کام سنبھالنے کو تیار ہو گئی۔ جب ملہار راؤ فوج لے کر لڑائی پر جاتا تھا تو اہلیا بائی حکومت کا انتظام خود کرتی تھی۔ اُس نے ہر کام کو ایسی قابلیت، دانائی اور ہنرمندی سے انجام دیا کہ ملہار راؤ نے حکومت کا تمام انتظام اُس کے سپرد کر دیا۔

ایک دن آیا کہ ملہار راؤ بھی اِس دُنیا سے چل بسا۔ وفات کے وقت اُسکی عمر ۷۶ سال تھی۔ اُس نے چھیالیس برس تک بڑی ناموری اور شہرت کے ساتھ فوج کی کمان کی، اور مرہٹہ سرداروں میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ ملہار راؤ کا اکلوتا بیٹا کھانڈے راؤ اپنے باپ کی زندگی ہی میں فوت ہو چکا تھا۔ لہذا اُسکا پوتا یعنی اہلیا بائی کا بیٹا مالی راؤ اندور کی گدی پر بیٹھا۔ لیکن نو ماہ کے اندر اندر وہ بھی چل بسا۔ سچ پوچھو تو اُس کا مرنا اندور کے حق میں بہت اچھا ہوا وہ بالکل نالائق تھا اور اُس میں ماں کے اوصاف نہ تھے بلکہ وہ اِسقدر ظالم اور بد خصلت تھا کہ جو کپڑے برہمنوں کو خیرات دیتا تھا اُنمیں بچھو رکھدیا کرتا تھا اور جب وہ ڈنک مارتے تھے تو برہمنوں کی تکلیف اور پریشانی دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اہلیا بائی اپنے بیٹے کے کرتوت دیکھ دیکھکر غم کے آنسو بہایا کرتی تھی۔ مالی راؤ نے ایک زردوز کو قتل کرا دیا تھا جس کی بیگناہی قتل کے بعد ثابت ہو گئی۔ لوگ عام طور پر اُس زردوز کو صاحب کرامات سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے مالی راؤ کو اُس کے قتل سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ اگر اُس کو قتل کیا گیا تو اُس کا انجام نہایت خطرناک ہوگا۔ بیماری کے دِنوں میں مالی راؤ پر جب خفقان کی کیفیت طاری ہوتی تو لوگ یہی خیال کرتے کہ زردوز کی روح اُس پر مسلّط ہے۔ خود اہلیا بائی کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ دِن رات مالی راؤ کے بستر سے لگی بیٹھی رہتی اور رو رو کر خُدا سے دعائیں مانگتی۔ لیکن سب بے سُود۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا گویا کوئی کہہ رہا ہے کہ "اُس نے مجھے بلا قصور قتل کیا ہے، میں بھی اُسکی جان لے کر پیچھا چھوڑوں گا۔"

اب کوئی اور شخص نہ تھا، جو مالی راؤ کے بعد گدّی پر بیٹھتا۔ آخر اہلیا بائی نے ارادہ کیا کہ وہ خود

حکومت کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اُس سے زیادہ حکومت کی اہلیت کسی میں نہ تھی۔ ساری رعایا اُس سے خوش تھی۔ تاہم ایک شخص ایسا بھی تھا جو اہلیا بائی کی حکومت کے خلاف تھا۔ یہ ملہار راؤ کا بدباطن وزیر گنگا دھر جسونت تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ گدی پر کوئی نابالغ لڑکا بیٹھے اور میں اُس کی طرف سے حکومت کروں۔ بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ حکومت پر خود قابض ہونا چاہتا تھا۔ بہرحال اُس نے اہلیا بائی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ "تم عورت ہو، اتنی بڑی حکومت کا بوجھ تم سے نہ سنبھل سکیگا۔ پھر حکومت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے تم اپنے مذہبی فرائض بھی ادا نہ کرسکوگی۔ اندور کی رعایا عورت کی حکومت سے مطمئن اور خوش نہ ہوگی اور اگر کوئی لڑائی چھڑ گئی تو فوج کو میدانِ جنگ میں کیونکر لے جاؤگی؟ اِس لئے اپنے خاندان کے کسی نابالغ لڑکے کو گدی پر بیٹھا کر مجھے اُسکا ولی بنادو۔ اگر ایسا نہ کروگی تو دشمن چاروں طرف سے چڑھ آئیں گے اور عورت ہوکر تم اُن کا مقابلہ کیسے کروگی؟

لیکن اہلیا بائی بہت دلیر عورت تھی، اور حکومت کے خطروں سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ اُس نے کہا کہ "میں ایک راجہ کی بیوی اور دوسرے کی ماں ہوں۔ وہ دونوں مر گئے اب قانونی طور پر حکومت میری ہے اس پر میں خود حکومت کروں گی، کوئی اور نہیں۔ اگر چاہوں گی تو کسی اور کو گدی پر بیٹھا دونگی"۔

اہلیا بائی کے جواب سے گنگا دھر جسونت کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اُس نے پیشوا کے چچا رگھوبا کو لکھ بھیجا کہ اندور کی گدی پر آجکل ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ تم یہاں آؤ اور آکر حکومت پر قبضہ کرلو۔ اہلیا بائی نے یہ کیفیت سُنی تو رگھوبا کو لکھا کہ اِس غلط اقدام سے باز رہئے۔ یاد رکھئے کہ میں حکومت کی جائز حقدار ہوں اور یہ میرے ہی قبضے میں رہیگی"۔

رگھوبا پر طمع تو پہلے ہی غالب تھی، اب وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ کہنے لگا کہ ملہار ہمارا ملازم تھا۔ اُس کی بہو اب اتنی خودسر ہوگئی، میں اِس عورت کا غرور توڑ کر رہونگا۔ اُس کے بعد اُس نے اندور پر حملہ کرنے کے لئے فوج تیار کی۔

اہلیا بائی نے بھی لڑائی کی تیاری کی، اُس نے اپنے تمام سرداروں کو دربار میں طلب کیا، اور انھیں جرأت دلاکر کہا کہ لڑنے کے لئے تیار ہوجاؤ۔ اس کے بعد اُس نے تمام راجاؤں سے جنکو وہ اپنا دوست تصور کرتی تھی مدد کی درخواست کی۔ وہ سب خوشی خوشی اُس کی مدد کو آپہنچے۔ رگھوبا اندور کے قریب پہونچا تو اہلیا بائی کی زبردست فوج دیکھکر دنگ ہوگیا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اندور پر حملہ کرونگا تو اہلیا بائی میرے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیگی اور مجھ سے رحم کی درخواست کرے گی۔ لیکن یہاں پہنچ کر صورتِ حال کچھ اور ہی نظر آئی۔ اُس نے دیکھا کہ خود میری فوج اہلیا بائی کی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ تاہم پلٹ جانے میں شرم مانع تھی۔ اُس نے

اپنی غیرت مٹانے کے لئے سپہ سالار تکوجی کو کہلا بھیجا کہ "میں لڑنے کے لئے نہیں آیا ہوں میں نے مالی راؤ کے انتقال کی خبر سُنی تھی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اُس کی بیوہ ماں حکومت کا سب انتظام تنہا کرتی ہے۔ اِس لئے میں نے خیال کیا کہ اگر اُسے میری امداد کی ضرورت ہو تو چل کر اُسکا ہاتھ بٹاؤں۔"

اُس کے جواب میں تکوجی نے اس کا ثبوت طلب کیا تو رگھوبا چند رفقار کو ساتھ لے کر اہلیا بائی کے لشکر میں چلا آیا۔ تکوجی نے اُس کا شاندار استقبال کیا۔ بعد ازاں اُس کو اہلیا بائی کی خدمت میں حاضر کیا۔ اہلیا بائی نے بھی اُس کے شایاں شان خاطر و مدارت کی اور اندور لے جاکر اپنا مہمان رکھا۔ رگھوبا کو یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ اہلیا بائی حکومت کے تمام کاموں کو اُسی خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہے، جیسے مرد انجام دیتے ہیں۔ اُس کے بعد وہ اہلیا بائی سے اتحاد کا وعدہ کرکے رخصت ہوا۔ اِس طرح گنگادھر جسونت کی تمام تدبیریں خاک میں مل گئیں اور وہ اندور کی سکونت ترک کرکے کسی اور طرف نکل گیا۔

اہلیا بائی کو اب کوئی کھٹکا نہ رہا۔ وہ اطمینان کے ساتھ اندور میں حکومت کرنے لگی۔ اُس کا زیادہ وقت حکومت کے کاموں میں صرف ہوتا تھا، اور اپنی رعایا کی خوشحالی کے لئے وہ سخت محنت کرتی تھی۔ تاہم وہ اپنے مذہبی فرائض یا دھرم کے کاموں سے بھی غافل نہ تھی۔ وہ بہت سویرے اُٹھ کر پوجا پاٹھ میں مشغول ہوتی تھی۔ اُس سے فارغ ہو کر رامائن یا مہابھارت پڑھتی۔ اُس کے بعد غریبوں اور محتاجوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا تقسیم کرتی تھی۔ بعد ازاں کچھ کھا پی کر تھوڑی دیر آرام کرتی اور پھر دربار میں آتی اور وزرار سے بات چیت کرکے حکومت کے تمام معاملات کا تصفیہ کرتی۔ جو شخص اُس سے ملنے آتا اور کچھ کہنا چاہتا اُسے فوراً بلا لیتی تھی اور اُس کی عرض و معروض کو نہایت توجہ و غور سے سُنتی تھی۔ غرض وہ دن بھر کام میں لگی رہتی تھی۔

غروب آفتاب کے وقت وہ پھر پوجا کرتی اور کچھ ناشتہ کرکے تھوڑی دیر آرام کرتی تھی۔ اُسکے بعد نو بجے پھر حکومت کے کاموں میں مشغول ہوتی اور اکثر رات گئے تک اپنے وزرار سے صلاح و مشورہ کیا کرتی تھی۔

اہلیا بائی کی حکومت میں ہر طرف امن و امان تھا اور اندور کی رعایا ہر لحاظ سے خوش و خرم تھی۔ مُلک کی تجارت اور پیداوار میں اتنی ترقی ہوئی کہ خزانہ میں بیشمار روپیہ جمع ہوگیا۔ جب اہلیا بائی نے دیکھا کہ خزانے میں ضرورت سے کہیں زیادہ روپیہ موجود ہے تو اُس نے روپے کو دھرم کے کاموں میں صرف کرنیکی تجویز کی۔ لیکن اسی کے ساتھ روپے کو وہ بلا ضرورت خرچ کرنا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُس کا سپہ سالار تکوجی فوجی جمعیت کے ساتھ جے پور کے مقابلہ کو گیا اور شکست کھائی۔ اُس نے اہلیا بائی کو روپے کے لئے لکھا۔ اہلیا بائی نے مطلوبہ رقم تو بھیج دی لیکن یہ بھی لکھدیا کہ آئندہ اور روپیہ ہرگز نہ بھیجا جا

تم مقابلہ کرو اور فتح پاؤ۔ اگر تم سے یہ نہیں ہو سکتا تو میں خود آکر دشمن کا مقابلہ کروں گی۔ اُس زمانہ میں اہلیا بائی کی عمر ۵۸ برس کی تھی۔

رگھوبا کی بدنیتی کی کیفیت بیان کی جا چکی ہے کہ کس طرح اُسنے اندور پر قبضہ کرنیکی کوشش کی تھی جب اُسے معلوم ہوا کہ اندور کے خزانے میں بیشمار دولت جمع ہے تو اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اُس نے کسی نہ کسی تدبیر سے روپیہ اینٹھنے کی فکر کی۔ آخر اُس نے قرض کے بہانے سے اُس روپے کو لینا چاہا، اور اہلیا بائی کے پاس پیغام بھیجا کہ آجکل روپے کی مجھے سخت ضرورت ہے۔ اہلیا بائی اُس کے مطلب کو سمجھ گئی۔ اُس نے جواب دیا کہ "خزانے میں جو روپیہ موجود ہے وہ میری ذاتی ملکیت نہیں ہے، ملکی ضروریات کے سوا کسی اور غرض سے میں اُس میں سے ایک حبّہ بھی نہیں لے سکتی۔ لیکن تم برہمن ہو، اس لئے اگر چاہو تو خیرات کے نام پر تمہیں کچھ روپیہ دیا جا سکتا ہے۔"

اہلیا بائی کا جواب سُن کر رگھوبا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے کہلا بھیجا کہ "میں کوئی بھکاری برہمن نہیں ہوں کہ خیرات لوں، جو کچھ مجھے لینا ہے، خود آکر لے لوں گا۔" اُس کے بعد فوج لے کر وہ پھر اندور کی طرف چلا۔ اِس بار اہلیا بائی نے اُس کے مقابلہ کے لئے فوج نہیں اکٹھا کی بلکہ ایک اور ہی تدبیر سے کام لیا۔ اُس نے سپاہیوں کی طرح خود ہتھیار لگائے اور پانسو مسلّح عورتوں کو ساتھ لیکر رگھوبا کے مقابلہ کو چلی، ایک بھی مرد اُس کے ساتھ نہ تھا۔

راگھوبا نے یہ رنگ دیکھا تو سخت متعجب ہوا۔ اُس نے اہلیا بائی سے دریافت کیا "کیا یہی تمھاری فوج ہے؟ عورتوں سے میں کیسے لڑ سکتا ہوں"۔ اہلیا بائی نے جواب دیا کہ "میں مقابلہ کے لئے نہیں آئی ہوں۔ کسی زمانے میں اندور کے حکمران پیشوا کے نمکخوار تھے۔ اور آپ پیشوا کے چچا ہیں۔ آپ کے مقابلہ پر میں تلوار نہیں اُٹھا سکتی۔ البتہ آپ مجھے مار ڈالیں۔ پھر سب کچھ آپ کا ہے۔ لیکن جب تک میرے دم میں دم ہے، میرے خزانے سے ایک حبّہ بھی آپ کو نہیں مل سکتا۔" رگھوبا سے اب کچھ نہ بن پڑا، شرما کر چُپ ہو گیا۔

اہلیا بائی کی زندگی کے آخری ایام میں اُسے ایک جانکاہ صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اُس کا داماد یعنی مُکتا بائی کا شوہر فوت ہو گیا۔ تو مُکتا بائی نے ستی ہونے کا ارادہ کیا۔ اہلیا بائی نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ اپنے ارادہ سے باز رہے لیکن مُکتا بائی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اہلیا بائی اُس کے قدموں میں گر گئی اور زمین پر لوٹنے لگی کہ دُنیا میں اُسے اکیلا نہ چھوڑ جائے۔ مگر وہ اپنے ارادہ پر مضبوطی سے قائم رہی۔ اُس نے کہا: "امّاں! تم عمر طبعی کو پہونچ چکی ہو، برس دو برس میں تمہاری زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا۔ میرا شوہر مر چکا ہے، اور پھر جب تم بھی مجھے چھوڑ جاؤ گی تو میرے لئے دُنیا میں کون سہارا باقی رہ جائے گا۔ میرے لئے یہی بہتر ہے کہ

عزت کے ساتھ دُنیا سے چل دوں"۔ مکتا بائی اپنی محترم والدہ کی آنکھوں کے سامنے ستی ہوئی۔ اِس دِلدوز نظارے نے اُس کو بے حال کر دیا۔ اُس کو چُپ لگ گئی، اور تین روز تک بے آب و دانہ پڑی رہی۔

اِس المناک حادثہ نے اہلیا بائی کو موت کے قریب پہنچا دیا۔ آخر ساٹھ برس کی عمر میں وہ بھی اِس دُنیا سے چل بسی۔ اُس کا شوہر کھانڈے راؤ جب اجمیر کے جاٹوں کے ہاتھ سے مارا گیا تو اُس کی عمر بمشکل بیس برس کی تھی۔ اُس کا بیٹا مالی راؤ گمراہ اور مخبوط الحواس تھا۔ لیکن اہلیا بائی نے ان باتوں کا اثر قبول نہ کیا، بلکہ اپنی زندگی کو اپنے مُلک اور مذہب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ کھانڈے راؤ کی موت کے بعد اُس نے کوئی رنگین کپڑا اپنے بدن پر نہیں پہنا اور نہ کبھی زیورات سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ وہ ہر قسم کی آزمائشوں سے گھری ہوئی تھی، لیکن اُس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔

اہلیا بائی کوئی خوبصورت عورت نہ تھی۔ لیکن اُس کی پاک زندگی اور اُس کی نیکیوں نے اُسے لوگوں کی نظر میں نور کی پُتلی بنا رکھا تھا۔ آخر وقت تک اندور میں اُس نے نہایت عقلمندی سے حکومت کی اور اُس کا ملک روز بروز ترقی کرتا گیا۔ اُس کے زمانۂ حکومت میں کئی بڑے بڑے شہر آباد ہوئے، جابجا کنویں اور گھاٹ بنے، بہت سی سڑکیں بنیں اور مسافروں کے آرام و آسائش کے لئے بہت سے دھرم شالے تعمیر ہوئے۔ ان تدبیروں سے تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ مُلک میں ہر طرف امن و امان تھا۔ اور سوداگر بے کھٹکے اپنا مال لاتے لیجاتے تھے۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکتا تھا، نہ کہیں لوٹ مار ہو سکتی تھی۔ وہ بدمعاشوں کو بہت سخت اور عبرت انگیز سزائیں دیتی تھی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اہلیا بائی بڑی نیک اور اپنے مذہب کی نہایت پابند تھی۔ اُس کی مذہب پرستی کا یہ حال تھا۔ کہ اُس نے دُور دُور کے مندروں میں روزانہ گنگا جل پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مزدور مقرر تھے۔ گنگا جل پہنچانا اُن کا کام تھا۔ ایک جگہ کا مزدور گنگا جل کا کلس دوسری جگہ کے مزدور کو پہنچاتا تھا۔ ہر مزدور اپنے آگے والے مزدور کو دے آتا۔ اِس طرح مندروں تک تازہ گنگا جل روزانہ پہنچ جاتا تھا۔

اہلیا بائی نے اپنے ملک کو تو فائدہ پہنچایا اسلئے وہ اپنی فیض رسانی کے باعث تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اُس کے قائم کردہ سدا برت ہندوستان کے بعض مشہور تیرتھوں میں آجتک قائم ہیں۔ اُس کی موت پر ہندو مسلمان سب اُسے یکساں طور پر روتے تھے، کیونکہ اُس کی ذات سے سب کو یکساں فائدہ پہنچتا تھا اور اُس کی تمام رعایا اُس پر اپنی جان دیتی تھی۔

جہانگیری اِنصاف

(از حضرت سحر ہتگامی)

ایک دن نورجہاں پہونچی محل کے اُوپر   اور لگی دیکھنے جمنا کا سہانا منظر
صبح کا وقت جو تھا ارض و سما پر طاری   تازہ دم ہو کے فضا کھیل رہی تھی یکسر
مچھلیاں بھی پئے تفریح وہیں دریا میں   اُٹھ کے پانی سے اُچھلتی تھیں اِدھر اور اُدھر
دیکھتے ہی یہ سماں، نورجہاں نے سوچا   آزمائش ہو نشانے کی کچھ اِس موقعے پر
لے لیا ہاتھ میں پھر اُس نے طپنچہ فوراً   ایک مچھلی پہ اُسی وقت پڑی جا کے نظر
اور اُسی وقت طپنچے کی کڑک سے ہر سو   ایک لمحے کو ہوا رنگِ سماں زیر و زبر
لیکن افسوس کہ چاہی ہوئی مچھلی کے بجائے   ایک دھوبی پہ پڑا جا کے نشانے کا اثر
جان سے اپنی ہی وہ ہاتھ غرض دھو بیٹھا   پارچے دھونے کو پانی میں گیا تھا جو اُتر
صدمۂ غم سے یکایک تڑپ اٹھی دھوبن   پہونچی دربارِ شہی میں وہ ملول و مضطر
کی شہنشاہِ جہانگیر سے جا کر فریاد   اور رو رو کے کہا حالِ وفاتِ شوہر
اِس قدر رنجِ رعیت سے ہوا دل کو اَلَم   خود شہنشاہ کی آنکھوں میں بھی اشک آئے بھر
یہ ہوا حال مگر دیکھتے ہی دیکھتے پھر   آگیا چہرۂ عالی پہ معاً رنگِ دگر
ہو کے سنجیدہ وہیں اُس نے طپنچہ اپنا   رکھ دیا ہاتھ پہ دھوبن کے بلا خوف و خطر
ساتھ ہی سینہ سپر ہو کے ہوا استادہ   اور یہ الفاظ ہوئے اُس کے دہن سے باہر
"اِس طپنچے سے مجھے جلد ہی کر تو بھی ہلاک   تا کہ ہو جائے اب اس طرح مداوائے ضرر
کیونکہ انصاف کا بے شبہ تقاضا ہے یہی   بیوگی ہی میں ہو بیگم کی بھی اب عمر بسر!
سُن کے اُس وقت جہانگیر کے مُنہ سے یہ بات   جو بھی موجود تھے دربار میں سب تھے ششدر
اور اُن سب سے بُرا حال تھا فریادی کا   یعنی دھوبن بھی کھڑی کانپ رہی تھی تھر تھر
آخرش اُس نے طپنچے کو پٹک کر اُس جا   یوں کہا ڈال کے قدموں پہ جہانگیر کے سر
"ہے شہنشاہ کا ارشاد بجا اور دُرست   ایسے انصاف کی تو چاہ نہیں مجھ کو مگر"
"جس سے یک گونہ رعیت ہی کی حالت ہو جائے   بیوگی کی بھی زبونی سے زیادہ ابتر"
پس یہ بہتر کہ اب اس حال میں جو کچھ گزرے   مجھ سی بس ایک ہی بیوہ پہ وہ سب جائے گزر"

ہندو مسلم سمجھوتہ کی تحریک
اور اُس کی ابتدائی تاریخ

از مسٹر منظر رضوی

پچھلے کچھ دنوں سے مسٹر جناح اور پنڈت جواہرلال ومہاتما گاندھی سے ہندو مسلم سمجھوتہ کے سوال پر خط و کتابت ہورہی تھی۔ اس کے بعد بمبئی میں مسٹر جناح اور مہاتما گاندھی کی ملاقات ہوئی اور صیغۂ راز میں باتیں ہوئیں اس ملاقات میں کون کون مسئلے زیر بحث آئے، اس کے جاننے کے لئے کچھ دنوں اور انتظار کرنا پڑیگا۔

اس کے بعد سبھاش بابو اور مسٹر جناح میں بھی گفتگو ہوئی، اور ایک مرتبہ پھر مہاتما جی مسٹر جناح سے بات چیت کرنے اُن کے بنگلے تشریف لے گئے، ورکنگ کمیٹی میں غور و فکر ہوی اس تحریک کا نتیجہ کیا نکلے گا، ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس وقت اس تحریک کی گذشتہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنا بیجا نہ ہوگا۔

اس کا سلسلہ اُس وقت شروع ہوا تھا جب ۱۹۱۶ء میں ہوم رول کا گیت گایا جارہا تھا۔ لکھنؤ کا معاہدہ کتنا ہی مایوس کُن کیوں نہ ہو مگر اس کا فوری نتیجہ کئی حیثیتوں سے کامیاب ثابت ہوا تھا، خاصکر اس اعتبار سے کہ جو لوگ بات چیت کرنے بیٹھے تھے وہ تو کچھ کرکے "اُٹھے" مگر چند ہی سال کے بعد دلوں میں یہ بات سماگئی کہ کاغذ کی یہ ناؤ چلنے والی نہیں، اور اس سے عوام میں اتحاد نہیں ہوسکتا ہے۔ عوام کے مسئلے دوسرے اور خواص کے مسئلے دوسرے ہیں۔ ایک کے فائدے میں دوسرے کا نقصان ہے۔ اور سمجھوتوں کی باتیں جب کبھی ہوتی ہیں تو اس میں خواص ہی کے مسئلے آتے ہیں۔ اور لوگ ان خواص کے مسئلوں کو حل کرنے کے بعد توقع کرتے ہیں کہ پورے سماج، عوام کا مسئلہ حل ہوجائیگا اور عام لوگوں میں ملاپ ہوجائیگا تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہماری سمجھ کا فتور ہے۔ ہندو مسلم عوام میں ملاپ تو جبھی ہوگا جب اُن کو اپنے طبقاتی مفاد کا صحیح احساس و شعور ہوجائے۔ خیر اس ٹیڑھے سوال کو اس وقت چھوڑ دیئے۔

۱۹۱۶ء کے سمجھوتے کے بعد ہی ہندوستان میں بلوے اور عام لوگوں میں خون خرابہ ہونے لگا مسجد اور مندر کی کشمکش، تبلیغ و تنظیم، شدھی اور سنگٹھن کی گرم بازاری رہی، اور خوب خوں ریزی بھی ہوئی۔ گاندھی جی نے برت رکھا، لیڈروں میں ہلچل مچی، مولانا محمد علی نے بیان دیا، جواہرلال بولے، شردھانند کی آواز اُٹھی، اور دہلی میں اتحاد کانفرنس بیٹھی۔ اور اس میں شہری آزادی اور ضمیر کی آزادی کے اصول

تسلیم کیا گیا۔ مذہبی رسمیات کی ادائیگی میں کوئی روک ٹوک نہ ہو، قربانی اور جھٹکا، گائے اور سور، اذان اور سنکھ، نماز اور گھنٹہ، محرم اور درگا پوجا ان سب کو ادا کرنے کی ہر فرد بشر کو آزادی ہو، اور جو شخص یا جو فرقہ اس میں مداخلت کرے وہ مجرم اور گنہگار قرار پائے۔ ضمیر اور عمل کی آزادی کے اصول کو تسلیم کر لینے اور اس پر عوام کی تربیت کرنے کے بعد بلووں کی وہ کثرت اور شدت بھی ختم ہو گئی، لیکن پھر بھی اکا دکا بلوے اور فسادات کی وارداتیں جاری رہیں

نہرو رپورٹ نہرو رپورٹ پر ہندوستان میں کافی شور اور اودھم مچ چکا ہے مگر ہندو مسلم مسئلہ کی تاریخ سمجھنے کا یہ ایک پرانا اور اہم مسالہ ہے۔

۱۹۲۷ء میں برٹش پارلیمنٹ نے ہندوستان کو نئے نئے آئینی اصلاحات دینے کے لئے سائمن کمیشن مقرر کیا۔ اور لارڈ برکنہیڈ نے ہندوستانیوں کو چیلنج دیا کہ وہ اپنا متحدہ مطالبہ پیش کریں۔ صاحب موصوف کو ہندوستان میں اتحاد نہ ہونے پر بڑا غرور تھا۔ اور شاید آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہندوستانی کبھی مل ہی نہیں سکتے۔ بہر حال اسی سال ۲۰ مارچ کو ہندو مسلم رہنماؤں کی باہمی گفت و شنید کے بعد بعض ممتاز مسلم رہنماؤں کا مسٹر جناح کی صدارت میں ایک جلسہ دہلی میں ہوا جس میں مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کیا گیا۔ یہ تجاویز جن کو مسلم تجاویز کہا جاتا ہے یہ ہیں:۔

(۱) سندھ کو ایک علحدہ صوبہ قرار دیا جائے،

(۲) پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے مطابق ہو۔

(۳) مرکزی اسمبلی میں مسلم نمائندگی کا تناسب ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

(۴) صوبہ سرحد اور بلوچستان کے ساتھ دوسرے اصلاحات یافتہ صوبوں کی طرح برتاؤ ہو۔

اس کے بعد ہی مسلم لیگ کا کلکتہ میں سر محمد یعقوب کی صدارت میں اجلاس ہوا جس میں مندرجہ بالا تجاویز مندرجہ ذیل دو نئی شرطوں کے ساتھ قبول کی گئیں:۔

(۱) مذہبی آزادی،

(۲) کسی جماعت کی تین چوتھائی ممبروں کی اکثریت سے مجلس آئین ساز کی کوئی تجویز یا ترمیم خارج از بحث ہو جائے۔

اس اضافہ کے بعد سے مسلم مطالبات کی فہرست آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور شرائط میں اضافہ ہو گیا

۱۲۔ فروری ۱۹۲۸ء کو مدراس کانگریس کی ہدایت کے مطابق سوراج کا دستور مرتب کرنے اور دوسرے مسئلوں پر غور کرنے کے لئے آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ہوا، اور مہینوں کے بحث و مباحثہ

اور غور و فکر کے بعد فرقہ وارانہ مسئلہ پر ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں مندرجہ ذیل تجویز پیش ہوئی:-

(۱) مرکزی اور صوبجاتی مجالس قانون ساز کے لئے مشترک اور مخلوط طریقۂ انتخاب ہو۔

(۲) مجالس آئین ساز میں نشستوں کا کوئی تحفظ نہ ہو، لیکن جہاں کہیں مسلمان اقلیت میں ہیں اور صوبۂ سرحد میں غیر مسلموں کی نشستیں محفوظ کردی جائیں۔ یہ تحفظ ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں بالکل اُن کی آبادی کے تناسب سے ہوگا۔ اور صوبہ سرحد میں بھی یہ تحفظ غیر مسلموں کی آبادی کے تناسب سے ہو۔

جہاں نشستیں محفوظ کردی جائیں گی وہاں وہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو مزید نشستوں کے لئے بھی مقابلہ کرنے کا حق دیا جائے

(۳) یہ بھی تجویز ہوا کہ صوبوں میں:-

(الف) پنجاب اور بنگال میں کسی فرقہ کے لئے نشستوں کا تحفظ نہ کیا جائے۔ لیکن سفارش کردہ تجویز پر دس سال تک عمل کرنے کے بعد اگر کوئی فرقہ خواہش کرے تو فرقہ وارانہ نیابت کے سوال پر دوبارہ غور کیا جائے۔

(ب) پنجاب اور بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں میں مسلمان اقلیتوں کے لئے اُن کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کردی جائیں اور انھیں مزید نشستوں کے لئے مقابلہ کا حق بھی دیا جائے۔

(ج) اسی طرح صوبۂ سرحد میں غیر مسلموں کی نشستیں محفوظ کردی جائیں اور انھیں بھی مزید نشستوں کے لئے الکشن لڑنے کا حق رہے۔

(۴) جہاں کہیں نشستوں کے تحفظ کی اجازت دس سال کی مقررہ مدت کے لئے ہو وہاں اس کے اختتام پر کسی فرقہ کی خواہش پر اس مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جاسکے گا۔

صوبوں کی نئی تقسیم اور اُن کے درجوں کے متعلق اس کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی:-

(۱) حکومت خود اختیاری کے قائم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے، بشرطیکہ:-

(ا) سندھ مالی اعتبار سے اپنے حکومتی اخراجات کا بوجھ سنبھال سکے یا کمی کی صورت میں سندھ کے باشندے نئے انتظام کی مالی ذمہ داریوں کے برداشت کرنے پر آمادگی ظاہر۔

(ب) سندھ میں حکومت کی شکل وہی ہو جو اس دستور کے ماتحت دوسرے صوبوں کی ہو۔

(ج) سندھ کی غیر مسلم اقلیت کو صوبہ کی اور مرکزی مجالس قانون ساز کی نیابت میں وہی رعایتیں حاصل ہوں جو دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو دی جائیں۔

(۲) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اور تمام نئے صوبوں میں جو دوسرے صوبہ سے علیحدہ کرکے بنائے جائیں اُن کی حکومت کی وہی صورت ہو جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ہو۔ (ملاحظہ ہو رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس)

مسلمانوں کی رائے

نہرو کمیٹی کے مسلمان ممبران سر علی امام اور مسٹر شعیب قریشی اس تجویز سے متفق تھے۔ لیکن کھلے اجلاس میں پنجاب کے مختلف فرقوں کی نمایندگی پر کچھ اختلاف ہوا، تاہم مولانا ظفر علی خاں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور چودھری افضل حق نے اور سکھوں کے نمایندوں نے اس تجویز کو مان لیا اور پنجاب کے سوال پر سارا اختلاف ختم ہوگیا۔ مگر مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کو بعض امور سے اختلاف ہوا۔ کچھ دنوں بعد سکھوں نے بھی مخالفت شروع کر دی کہ وہ اپنی نشستوں کے تحفظ کے ساتھ ہی مخلوط انتخاب کو قبول کریں گے ورنہ نہیں۔

اسی سال دسمبر میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس ہز ہائی نس سر آغا خاں کی صدارت میں ہوا سر آغا خاں ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کو چھوڑنے کے تیرہ سال کی مدت کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور آپ کی ہدایت و قیادت میں مسلمانوں کے "حقوق" کی ایک طویل فہرست مرتب ہوئی، اور نہرو رپورٹ کو اس بنا پر مسترد کرنے کی تجویز پاس ہوئی کہ "سکھ غیر برہمن اور پست اقوام نے اسے منظور نہیں کیا اور کانگریس نے بھی اُسے ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا تھا اور اس کے علاوہ مسلمانوں کے لئے وہ چنداں مفید بھی نہیں"۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس دہلی میں مسٹر جناح کی زیر صدارت ہوا مسلم لیگ کا ایک بازو جس میں مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ شامل تھے نہرو رپورٹ کے بجنسہٖ قبول کرنے کا حامی تھا، دوسرا اس ترمیم کے ساتھ کہ مرکز میں ⅓ نشستوں کا تحفظ کر دیا جائے۔ مسٹر جناح ان دونوں بازوؤں میں سمجھوتہ کرانا چاہتے تھے۔ مگر یہ اجلاس شور و غل میں ختم ہو گیا۔

کانگریس کا نقطۂ نظر

کانگریس نے سکھوں اور کچھ مسلمانوں کی مخالفت کے پیش نظر اپنے ۱۹۲۹ء کے اجلاس لاہور میں اس تجویز کو ان الفاظ کے ساتھ مسترد کر دیا:-

"کانگریس کا عقیدہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ کو بالکل ہی قومی اصولوں پر

حل کیا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ نہرو رپورٹ کی سفارشات پر سکھوں، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے، اس لئے کانگریس مسلمانوں، سکھوں اور دوسری اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ مستقبل کا کوئی دستور اساسی کانگریس کے لئے قابل قبول نہ ہوگا اگر اس سے اقلیتوں کو اطمینان نہیں ہوتا۔"

اسی سال کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کا حسب ذیل خاکہ مرتب کیا، اور گاندھی جی جب گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے لندن جانے لگے تو اُنھیں ہدایت کی کہ اسی بنیاد پر فرقہ وارانہ سمجھوتہ کریں یا اگر اس طرح سمجھوتہ نہ ہو تو جس طرح وہ چاہیں اس مسئلہ کو حل کر دیں۔ وہ خاکہ یہ ہے:-

(۱) (الف) دستور اساسی میں بنیادی حقوق کے متعلق دفعہ میں اقلیت کی تہذیب، زبان، رسم الخط، تعلیم، مذہبی عقائد و رسمیات اور مذہبی اوقاف کی حفاظت کی ضمانت کر دی جائے۔

(ب) دستور اساسی میں قانون شریعت (Personal Law) کی حفاظت کے لئے ایک خاص دفعہ رکھدی جائے۔

(ج) وفاقی حکومت اقلیتوں کے سیاسی اور دوسرے حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار اور مجاز ہو۔

(۲) ووٹ کا حق ہر بالغ عورت و مرد کو دیا جائے۔

(نوٹ) کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس بات کو بھی واضح کر دیا کہ ہر صورت میں حق رائے دہی یکساں ہو اور اُسے اتنی وسعت دی جائیگی کہ مختلف فرقوں کے رائے دہندوں کی تعداد اُن کی آبادی کی مناسبت سے ہو۔

(۳) (الف) ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ نمایندگی ہو۔

(ب) ہندوؤں کے لئے سندھ میں، مسلمانوں کے لئے آسام میں، سکھوں کے لئے پنجاب اور صوبہ سرحد میں، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے ہر اُس صوبہ میں جہاں اُن کی تعداد پچیس فیصدی سے کم ہو صوبوں کی مجلس اور وفاقی مجلس آئین ساز میں اُن کی آبادی کے اعتبار سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں، اور انھیں اس کا بھی حق ہے کہ دوسرے فرقہ کے اُمیدوار ان کا مقابلہ کر کے مزید نشستیں حاصل کریں۔

(۴) فیڈریشن حکومت اور صوبجاتی وزارت کی ترتیب کرتے وقت اقلیتوں کی شمولیت کا حق رسم و رواج کی حیثیت سے مان لیا جائے۔

(۵) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حکومت اور نظم و نسق کی وہی صورت ہو جو دوسرے صوبوں کی ہو۔

(۶) سندھ ایک علٰحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ بشرطیکہ باشندگان سندھ نئے صوبہ کے اخراجات کا بوجھ کا اُٹھانے کو تیار ہوں۔

(۷) ملک آئندہ دستور اساسی وفاقی ہوگا۔ اور فاضل اختیارات (Residuary Powers) ان صوبوں کو حاصل ہوں جو فیڈریشن کے جزو ہوں۔

گول میز کانفرنس: گاندھی جی نے لندن روانہ ہوتے وقت اس بات کا اعلان کیا کہ وہ مسلمانوں کے ہر متحدہ مطالبہ کو جیوں کا تیوں مان لیں گے۔ اس پر مسلمانوں کے ہر خیال کے نمایندوں میں بھوپال میں گفتگو ہوئی پھر یہ لوگ شملے میں ملے۔ لیکن شملہ کا ماحول اور اس کے ثرات اتحاد کی کوشاں قوتوں کے ناموافق ثابت ہوئے، بقول ڈاکٹر انصاری مرحوم:-

شاید اگر مسلم کانفرنس کے بزرگوں کو تنہا چھوڑ دیا جاتا تو اُن کا فیصلہ کچھ اور ہی ہوتا۔ لیکن بڑی بڑی طاقتیں پس پردہ اپنا زور صرف کر رہی تھیں۔ اور مصالحت کی جو باتیں امید افزا حالات میں شروع ہوئی تھیں وہ ان مسموم اثرات کے تحت ختم ہو گئیں۔"

گاندھی جی انھیں مایوس کن حالات میں لندن پہونچے، جہاں ہر فرقہ نے اپنی اپنی جنس کی قیمت بڑھا رکھی تھی اور وہ خرید و فروخت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ سمجھوتے اور مصالحت جس رواداری سے ہوتے ہیں وہ وہاں مفقود تھی۔ گاندھی جی نے مسلمانوں سے لندن میں یہ بھی کہا کہ ہم آپ کے سارے مطالبات مان لیں گے بشرطیکہ آپ (۱) کانگریس سے مل کر آزادی کے لیے جدوجہد کریں جس میں خود مسلمانوں کا بھی فائدہ ہے (۲) قوم پرست مسلمانوں سے مشورہ کیا جائے، اور ایک متفقہ فیصلہ ہو۔ (۳) دوسری اقلیتوں کے مفاد کا بھی لحاظ رکھا جائے مسلم نمایندوں نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کیا۔ وہ یہ شرط ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے کہ قوم پرست مسلمانوں میں سے کسی کو گول میز کانفرنس میں بُلایا جائے۔ برٹش حکومت نے رجعت پسند طاقتوں کو مضبوط رکھنے کے لئے قوم پرست مسلمانوں کو گول میز سے علٰحدہ کر رکھا تھا اور گول میزی مسلمان اسی پالیسی کو تقویت پہونچا رہے تھے۔

لندن میں ایک موقع پر گاندھی جی اور مسٹر جناح سے بھی باتیں ہوئیں اور سمجھوتہ کا کافی امکان پیدا ہو گیا مگر اسوقت دوسرے رجعت پسند اور فرقہ پرست ہندوؤں نے اس میں رکاوٹ

ڈالدی اور ساری باتیں درہم برہم ہوگئیں۔

الہ آباد اتحاد کانفرنس | بہر حال لندن میں سمجھوتہ کی کشتی کو ڈگمگاتا دیکھکر ہندوستان میں کانگریسی مسلمانوں نے اتحاد کی بات چیت شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود، مولانا شوکت علی، اور مولانا ظفر علی خاں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ مسٹر جناح کے تیرہ نکات کو مخلوط انتخاب کے ساتھ مان لیا جائے، اور اسی کی بنیاد پر ہندوؤں اور کانگریس سے گفتگو کی شروعات کی جائے۔

اس کے بعد الہ آباد میں اتحاد کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں یہ تجاویز منظور ہوئیں:-

(۱) مخلوط طریقۂ انتخاب اس شکل سے رائج ہو کہ جس اُمیدوار کو اپنے فرقہ کے تیس فیصدی ووٹ ملیں اور مخلوط ووٹوں میں سے بھی اُسے سب سے زیادہ ووٹ ملیں وہ کامیاب سمجھا جائے۔

(۲) بنگال میں مسلمانوں کو اکیاون (۵۱) فیصدی نشستیں دی جائیں۔

(۳) پنجاب میں مسلمانوں کو اکیاون (۵۱) فیصدی، ہندوؤں کو ستائیس (۲۷) فیصدی، سکھوں کو بیس (۲۰) فیصدی ہندستانی عیسائیوں کو تین اور یوروپین وغیرہ کو ایک فیصدی نشستیں دی جائیں[1]۔

(۴) اگر حکومت کی کسی تجویز کو کسی اقلیت کے تین چوتھائی ممبر اپنے حق میں مضر سمجھیں تو وزارت بصورت اتفاق رائے اس تجویز کو واپس لے لے اور اگر وزارت کو اس سے اتفاق نہ ہو تو اس معاملہ کو ایک خاص عدالت میں پیش کردے اور اس کے فیصلہ کی پابند ہو۔ فیصلہ تسلیم نہ کرنے کی صورت میں وزارت مستعفی ہوجائے۔

(نوٹ) اس عدالت کی تشکیل مرکزی حکومت کے ذمہ رکھی گئی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ اس میں ہائی کورٹ کے تین ہندوستانی جج ہوں، اس کے دو جج کسی ایک فرقہ کے نہ ہوں مگر ایک جج مدعی فرقہ کا ضرور ہو۔

(۵) سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے اور اس کو وہ تمام اختیارات دیدیے جائیں جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں[2]۔

(۶) مرکزی وزارت میں مسلمانوں کی کافی تعداد اور رواج کی حیثیت سے ایک سکھ بھی شامل کیا جائے۔

---

[1] کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ بنگال میں مسلمانوں کو ۴۸،۴ فیصدی اور پنجاب میں ۴۹ فیصدی کے قریب نشستیں ملی ہیں، اور ان صوبوں میں مسلمانوں کی آئینی اور آزادانہ اکثریت ختم ہوچکی ہے۔

[2] اس وقت وزیر اعظم برطانیہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس سمجھوتہ کو دیکھکر فوراً ہی سندھ کی علیحدگی

اس کے بعد ۲۔نومبر کو مسلم کانفرنس، مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء کانپور کا ایک مشترکہ جلسہ عبداللہ سہروردی کے زیر صدارت ہوا۔ اب تک یہ حضرات مسٹر جناح کے چودہ نکات کے زبردست حامی تھے۔ لیکن جب الہ آباد میں مسٹر جناح کے مطالبات کی بنیاد پر ہندو مسلم سمجھوتہ ہوگیا اور مسلمانوں کے متحدہ اور مشترکہ مطالبات پورے ہو گئے، توان حضرات نے "ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے یہ نئے شاخسانے نکالے:۔

(۱) آسام میں چالیس فیصدی نشستیں محفوظ کردی جائیں۔

(۲) مدراس میں مسلمانوں کا تحفظ (؟)

(۳) دلّی اور اجمیر سے جداگانہ انتخاب کے ذریعہ ایک مسلم نمایندہ ضرور انتخاب کیا جائے۔

(۴) بہار واڑیسہ میں مسلمانوں کے لئے ۲۷ فیصدی نشستیں محفوظ کردی جائیں۔

اسی کے ساتھ بنگال ہندو سبھا نے بھی اس سمجھوتہ کے اس حصہ سے جس کا تعلق بنگال سے تھا ماننے سے انکار کردیا اور اپنے خاص مطالبات پیش کئے، جو یہ ہیں:۔

(۱) بنگال کونسل میں فرقہ وارانہ اصول پر کوئی نشست محفوظ نہ کی جائے۔

(۲) دس برس کے بعد تمام تحفظات بالغانہ حق رائے دہی کی شرط کے بغیر ختم کردیئے جائیں۔

(۳) بالغانہ حق رائے دہی کے لئے دونوں فرقے مل کر جدّ وجہد کریں۔

(۴) تمام چناؤ عام مشترک حلقوں سے ہو۔

اس شور و کہرام اور واویلا کو ختم کرنے کے لئے ایک اور فارمولا نکالا گیا۔

"بنگال میں دس سال کے لئے مسلمانوں کی آئینی اکثریت منظور کی جائے، بشرطیکہ دو فرقے مل کر اس فاضل اور ناجائز ویٹیج کو جو یورپین فرقہ کو کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ ملے ہیں، کی کوشش کریں تاکہ مسلمانوں کو مستقل آئینی اکثریت اور ہندوؤں کو آبادی کے تناسب نمایندگی حاصل ہوجائے۔"

مسلم کانفرنس، مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء کانپور نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کردیا۔ کہنا تھا کہ ہمیں سیدھے ۵۱ فیصدی مل جانا چاہیئے۔

مسٹر محمد علی جناح اور بابو راجندر پرشاد سابق صدر انڈین نیشنل کانگریس کی جو گفتگو کے اخیر اور ۱۹۳۵ء کے شروع میں ہوئی تھی وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی تھی۔ اس وقت مرکزی میں مشترکہ پارلیمنٹی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث ہونے والی تھی۔ مسٹر جناح کا خیال تھا کہ اگر کانگریس

اسمبلی پارٹی نے اِس رپورٹ کو مسترد کر دیا تو کمیونل ایوارڈ ختم ہو جائیگا۔ کانگریس اس کمیونل ڈ کے متعلق بمبئی ہی کے اجلاس میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اسے ملک، قومیت اور مسلمانوں کے یں مضر سمجھتی ہے، لیکن جب تک مختلف فرقوں میں کوئی مناسب و متفقہ سمجھوتہ نہ ہو جائے اس ت تک وہ کمیونل ایوارڈ کے سوال پر غیر جانبدار رہیگی، اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ے گی۔ کیونکہ ایسا کرنے سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو نقصان پہونچیگا۔ یہی وجہ ہے، کہ لی میں جب اس مسئلہ پر مباحثہ ہوا تو کانگریس کے تمام ممبر کمیونل ایوارڈ پر غیر جانبدار رہے، نہ مخالفت اور نہ موافقت کسی طرف ووٹ دیا۔ اس سے مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی اور کمیونل رڈ منظور ہو گیا۔ جناح راجندر گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) حق رائے دہی کی اس طرح ترتیب کی جائے کہ اس میں مختلف فرقوں کی آبادی کے تناسب کا لحاظ کر لیا جائے۔ اور صوبوں اور مرکز دونوں کی فہرست رائے دہندگان میں یہ لحاظ رہے۔ اور جہاں کہیں ضرورت ہو اختلافی حق رائے دہی (Differential Fanchise) کا طریقہ بھی رائج کیا جائے۔

(۲) انتخاب کے حلقوں کو اور ووٹروں کو منتشر نہ رکھا جائے۔

(۳) پنجاب میں جو نشستیں مختلف فرقوں کو دی گئی ہیں اُن کے حلقے بناتے وقت پہلے سکھوں اور پھر ہندوؤں کو موقع دیا جائے کہ وہ کمیونل ایوارڈ کے رُو سے اپنی اپنی نشستوں کے لئے حلقے منتخب کر لیں، اور بقیہ حلقے اسی ایوارڈ کی رو سے مسلمانوں، ہندوستانی عیسائیوں یوروپین اور اینگلو انڈین کے حوالے کر دیئے جائیں۔

(۴) بنگال میں یوروپین فرقہ سے جو نشستیں حاصل ہوں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ ہندو مسلمان یوروپین فرقہ سے نشستیں واپس لینے کی متفقہ جدوجہد کریں جو نشستیں مسلمانوں کو کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ ملی ہیں اُن میں کوئی کمی نہ کی جائے۔

(۵) دوسرے صوبوں میں جو جگہیں مسلمانوں کو کمیونل ایوارڈ کے ذریعہ ملیں وہ بھی محفوظ رکھی جائیں۔

(۶) اسی طرح مرکزی اسمبلی میں جو جگہیں مسلمانوں کو ملی ہیں وہ بھی محفوظ رہیں گی۔

(۷) تمام صوبوں اور مرکز میں جداگانہ انتخاب کے بدلے مخلوط انتخاب رائج کیا جائے۔

بنگالی ہندوؤں کو مسٹر جناح اور شری راجندر پرشاد کے اس آپسی سمجھوتہ پر یہ اختلاف تھا کہ:۔

(۱) اختلافی حق رائے دہی کا وجود نہ ہو۔
(۲) بنگال میں نشستوں کی نئی تقسیم ہو۔
(۳) مرکز میں مسلمانوں کو ⅓ ۳۳ ملے۔
(۴) تحفظات کے لئے مدّت کی قید ہو۔

مسٹر جناح اِن باتوں میں سے کسی کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ تب راجندر بابو نے یہ کہا کہ کانگریس ور مسلم لیگ کے درمیان اسی سمجھوتہ کی بنیاد پر سمجھوتہ ہو جائے اور کانگریس اور مسلم لیگ مل کر اس کے لئے جد و جہد کریں، اور فرقہ پرستوں کو دبائیں۔ مگر مسٹر جناح نے اسے بھی منظور نہیں فرمایا۔ حالانکہ خود نھیں نے گفتگو کی ابتدا میں کہا تھا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ ملجائیں تو فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں و دبا سکتے ہیں۔ اور انھوں نے اس کی شکایت بھی کی کہ کانگریس ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی لیکن ب راجندر بابو تیار ہوئے تو خود پھسل گئے۔

اب اِن تمام اُمور کو اپنے پیش نظر رکھئے، اور سمجھوتہ کی جو گفتگو حال میں شروع ہوئی ہے اس کا ور مطالعہ کرتے رہیئے۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس معاملے میں رجعت پسند حضرات کیسے کیسے رنگ لتے رہے ہیں۔

یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ اس نام نہاد سمجھوتہ میں عوام کی بے روزگاری، جہالت ر صحت کی حالت سدھارنے کا سوال پیدا نہیں ہوا، اور نہ اس پر غور کیا گیا۔ بلکہ اسمبلیوں کی ممبری زارتیں اور اسی قسم کے دوسرے سوالات پر سوچ بچار کیا گیا، پھر ان سمجھوتوں سے عوام کی اقتصادی ر اخلاقی بدحالی کیسے دُور ہو سکتی ہے۔

رُباعیات

اری ہے گلوں کے درمیان گفت و شنود　　موضوع مکالمت ہے "انجام نمود"
ملتی ہوئی کلیوں پہ ہے شبنم دمِ صبح　　اِک موجِ تبسم ہے مگر رشک آلود

افسوس کہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں　　جی بھر کے یہاں قیام ہوتا ہی نہیں
سُننے والے تمام ہو جاتے ہیں　　افسانہ مگر تمام ہوتا ہی نہیں

جوش

ہنگامۂ الہ آباد

(از مسٹر مُدھر بہاری لال سریواستو)

یہ نظم الہ آباد کے ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ آئے دن کے افسوسناک ہنگاموں اور باہمی کشت و خون سے تنگ آکر پُرجوش شاعر نے ہندو مسلمانوں سے مخاطب ہو کر جو اظہار خیالات کیا ہے وہ بلا کم و کاست ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

اے الہ آباد اے پیشانیٔ گیتی کے داغ — فتنہ پردازی کے گہوارے خصومت کے چراغ
اے سیہ رو۔ کینہ پرور، بے حیا و کج دماغ — ہند کی بدبختیوں کا تجھ سے چلتا ہے سُراغ
مرکزِ کبر و ریا دار العلوم کشت و خوں
بڑھ گیا حد سے زیادہ جاہلیت کا جنوں

اے الہ آباد۔ اے پروردۂ گنگ و جمن — دھنس گئی تحت الثریٰ تک تیری بنیادِ کہن
گلرخانِ دیر و کعبہ کی ہے تازہ انجمن — کر دیا پامال شمشیرِ تعصب نے چمن
ایک ہلچل سی مچی ہے کوچہ و بازار میں
لگ گئی ہے آگ تیرے ہر در و دیوار میں

یاد کر وہ دن کہ ہندوستان کا فرمانروا — پیکرِ حسن محبت یعنی ہرشش پارسا
سال میں اک بار آتا تھا پئے جود و سخا — اور یوں مضبوط کرتا تھا اہنسا کی بنا
کوششِ پیہم سے آخر یہ ہوا انجام کار
پھوٹ نکلا پتھروں سے بھی محبت کا شرار

جلوۂ معنی کی تیری بزم میں تھی روشنی — میہمانوں کو ترے ملتا تھا درسِ آگہی
ہر طرف چھایا ہوا تھا ایک کیفِ بیخودی — تیری بستی میں نہ تھی آلائشِ فتنہ گری
انسیت کی برق پہلو میں ترے تھی بیقرار
تھی شریکِ حال تیرے رحمتِ پروردگار

رہ نوردانِ حقیقت کا تو ہی مسکن رہا — گوہرِ الفت کا اک نایاب تو خرمن رہا
گو ازل سے ہی فلک انسان کا دشمن رہا — پھر بھی پھولوں سے بھرا ہر ایک کا دامن رہا
تجھ میں طرفہ زندگی تھی شورِ نوشانوش سے
عالمِ امکاں کی زینت تھی تری آغوش سے

حیف تیرا آج وہ دلکش سماں باقی نہیں
خار و خس باقی ہیں لیکن گلستاں باقی نہیں
تیری بزمِ خاص کے آتش بجاں باقی نہیں
گرد باقی رہ گئی ہے کارواں باقی نہیں

عظمتِ دیرینہ تیری ہو گئی خواب و خیال
دیکھتے ہی دیکھتے جاتا رہا تیرا جمال

ہو گئے کافور تیرے آہ وہ لیل و نہار
ہو گیا رخصت یکایک تیرے گلشن کا نکھار
چار سُو تیری تباہی کے نشاں ہیں آشکار
پڑ گیا تجھ پر بھی آخر کار دستِ روزگار

چل رہی ہے تیری آبادی میں وہ بادِ خلاف
جس نے برپا کر دیا ہنگامۂ جوشِ مصاف

محفلِ رنگیں میں تیری جمع ہیں وہ بد نہاد
شغل بیکاری ہے جن کا سر بسر فتنہ فساد
اپنے آپے میں نہیں پی کر مئے بغض و عناد
خونِ ناحق کو سمجھتے ہیں تقاضائے جہاد

جذبۂ غارت گری میں اس قدر ہیں بدحواس
اُن کو جیسے عاقبت کا کچھ نہیں بیم و ہراس

اُن کے دل میں نوعِ انساں کی کوئی وقعت نہیں
آہ ان میں نام کو بھی جذبۂ الفت نہیں
بھائیوں پر رحم کرنا داخلِ فطرت نہیں
قوم مٹتی جا رہی ہے اور کچھ غیرت نہیں

کر رہے ہیں آہ بیباکانہ محشر خیزیاں
اور سمجھتے ہیں روا ہیں مذہباً خونریزیاں

ہو چکے ہیں حیف یکسر کُند ان کے حسیات
کچھ نہیں ان کے رگ و ریشہ میں انسانی صفات
کرتے ہیں سفاکیوں سے یہ ادا فرضِ حیات
فخر کا باعث سمجھتے ہیں جہاں میں اپنی ذات

وضعداری و مروت کا یہاں کیا ذکر ہے
ندیاں خوں کی بہیں بس اتنی اُن کو فکر ہے

اے الہ آباد کے بے شرم مردِ روسیاہ
یہ نزاعِ باہمی اور اُس پہ آزادی کی چاہ
دیکھ او کج فہم انساں قوم کا حالِ تباہ
اپنی بربادی کا باعث ہے تو ہی بے اشتباہ

کس قدر ہے شرم آگیں حیف تیری زندگی
خاک میں تو نے ملا دی ساری عظمت ہند کی

دُون گھاٹی کی لڑائیاں

(از حافظ محسن محی الدین عباسی)

کوہ کلنگا دیرہ دون سے تقریباً تین میل مشرقی سمت واقع ہے جس کے قریب سپیانا نامی ایک رو یعنی پہاڑی ندی بہتی ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر گورکھوں نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ جسے انگریزی فوجوں نے ۱۸۱۵ء میں منہدم کر دیا۔ پہاڑ کی بلند و ہیبت ناک چوٹیاں دون گھاٹی کے قدرتی مناظر کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ لیکن آج کھنڈرات کے سوائے وہاں کچھ بھی باقی نہیں ہے۔

پہاڑ کے نشیب میں شہر دیرہ دون سے کچھ ہی دور پر سپیانا ندی کے بائیں کنارے ایک یادگار ان لوگوں کے نام پر قائم ہے جو دُون گھاٹی کی لڑائیوں میں کھیت رہے تھے۔ کوہ کلنگا کی شہرت محض دیرہ دون یا اس کے قرب و جوار تک محدود نہیں ہے بلکہ اسکی عظمت و شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اسی مقام پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اس پہاڑی زرخیز خطہ پر انگریزوں کا قبضہ رہے گا یا گورکھوں کا۔ کلنگا کے لڑائی کے بعد ہی دُون کی ساری گھاٹیاں انگریزوں کے قبضے میں آ گئیں۔

عرصہ دراز سے دُون کا سبزہ زار اور اس کی گھاٹیاں راجہ گڑھوال کے ماتحت تھیں لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر میں گورکھوں نے ان راجاؤں پر جو نیپالی سرحد کے قریب حکمرانی کر رہے تھے۔ حملے شروع کر دئے اور ۱۸۰۴ء میں کمایوں گڑھوال اور سرمور ناہن پر قبضہ کر لیا۔ تقدیر کی یاوری محض دس سال ہی تک رہی اور اس اثناء میں دُون کی گھاٹیوں کی حالت بد سے بدتر ہو گئی اور بدانتظامی و بدنظمی کی وجہ سے سالانہ محاصل کی مقدار صرف بیس ہزار رہ گئی۔ گورکھے توسیع سلطنت کے خواب پورے نہ کرنے پائے تھے کہ جنوب مشرق سے انگریزوں کے حملے شروع ہو گئے جس کا سبب ایک سرکاری پولس افسر کا قتل بتلایا جاتا ہے۔ جس پر لارڈ ہیسٹنگ[1] نے جو اس وقت ہندوستان کے گورنر جنرل تھے لڑائی کے احکام جاری کر دئے۔ میجر جنرل مارلی وٹ[2] کو حکم دیا گیا کہ وہ آٹھ ہزار سپاہ لیکر کھٹمنڈو تسخیر کر لیں۔ اور میجر جنرل وڈ[3] کو حکم ملا کہ وہ چار ہزار فوج سے گورکھپور پر چڑھائی کر دیں۔ اس کے علاوہ میجر جنرل اختر لونی[4] کے لئے یہ حکم نافذ ہوا کہ وہ گورکھوں کے ان ممالک پر حملہ کر دیں جو ستلج اور جمنا کے درمیان

---

[1] Lord Hastings. [2] Major General Marlywitte. [3] Major General Wood. [4] Major General Ochterlony.

واقع ہیں اسی اثناء میں میجر جنرل گلسپی[a] ساڑھے تین ہزار فوج لیکر دیرہ دون کی طرف چل کھڑا ہوا۔ کمان بلبھدر سنگھ تھاپہ نے جب یہ خبر سُنی کہ انگریزوں کی کثیر فوجیں دیرہ دون کی طرف آرہی ہیں تو وہ اپنی مختصر فوج لیکر کلنگا کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوگیا۔

انگریزوں کی فوجیں دون کی گھاٹیوں میں ہر دو جانب سے روانہ کی گئیں درہ موھنڈ گھاٹہ اور تملی گھاٹہ میں ہوکر دونوں فوجیں ۲۴ر اکتوبر ۱۸۱۴ء کو مل گئیں۔ گورکھے قلعہ کلنگا میں محصور تھے اور انگریزی فوج کے سپہ سالار نے گورکھوں کو اس محفوظ و مضبوط قلعہ سے نکال باہر کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا اس لئے ۳۱ر اکتوبر ۱۸۱۴ء کو قلعہ کلنگا پر حملے شروع کر دئے گئے۔

پہاڑی راستوں سے ناواقفیت اور گورکھوں کی بہادری کے باعث انگریزوں کو پہلی دفعہ ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ ان کی بہت سی فوج بھی تباہ ہوئی اور میجر جنرل گلسپی خود بھی مارا گیا۔

ایک ماہ تک مُسلسل اسی خیال سے انتظار کیا گیا کہ شاید قلعہ کے محصورین خود ہی انگریزوں کے رحم و کرم کا خیال کرتے ہوئے اپنے کو حوالہ کردیں لیکن گورکھوں کے عزم و استقلال میں مطلق کوئی فرق نہ آیا۔ اور وہ بدستور قلعہ بند رہے۔ اب انگریزوں کے حملے اور بھی زوروں کے ساتھ شروع ہوگئے۔ قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا مگر یہ حملہ بھی ناکامیاب رہا اور بہت سے سپاہی ضائع ہوئے۔ حملہ کے تین روز بعد قلعہ پر سخت گولہ باری شروع کردی گئی۔ ۳۰ر نومبر کو بہادر گورکھوں نے قلعہ کو چھوڑ دیا کیونکہ ان کے پاس پانی کا ذخیرہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ اسلئے وہ اپنے سامنے سے حملہ آوروں کو چیرتے کاٹتے نکل گئے۔ بہت سے سپاہی راستے ہی میں مرگئے۔ بقیہ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ شیر پنجاب کے یہاں ملازمت کرلی بعد کو یہ سب کے سب افغانوں کے مقابلہ میں لڑ کر مارے گئے۔

میجر جنرل اختر لونی[a] نے تمام دون کی گھاٹیوں اور سرمور ناہن کو فتح کرلیا۔ اس کے ایک ماہ بعد ہی گورکھوں کی تمام طاقت ختم ہوگئی اور ۱۷ر نومبر ۱۸۱۵ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیرہ دون اور دون گھاٹی کا (مضافات سہارنپور تک) الحاق کا اعلان کردیا۔ اور مسٹر کالورٹ[b] کو اسسٹنٹ کلکٹر مقرر کرکے انھیں کلکٹر سہارنپور کے ماتحت کردیا۔ اس طرح بقیہ حصۂ ممالک بھی جو گڑھوال اور سرمور ریاست کے نام سے موسوم ہے۔ گورکھوں سے چھین لیا گیا اور ان کے اصلی حکمرانوں کو دے دیا گیا۔ اور دون کی گھاٹی کمایون اور گڑھوال کا وہ حصہ جو "برٹش گڑھوال" کے نام سے مشہور ہے انگریزوں کے قبضہ میں رہا۔

جنگ کلنگا کے میدان میں ایک یادگاری کتبہ اب بھی قائم ہے جس میں عبارت ذیل درج ہے:-

Major General Ochterlony. [a] M.G. Gillispie.

" پہاڑ کی بہت اونچی چوٹی پر اس یادگار کے قریب قلعہ کلنگا واقع ہے جو دو حملوں کے بعد (جو ۳۱ر اکتوبر ۱۸۱۴ء کو اور ۲۷ر نومبر کو ہوئی) انگریزوں نے ۳۰ر نومبر ۱۸۱۴ء کو فتح کر کے مسمار کر دیا اور یہ عبارت اُن جانبازوں اور ہمارے بہادر دشمن بلبھدر سنگھ تھاپہ کے یادگار میں لکھی جاتی ہے جو قلعہ کلنگا کے کمانڈر تھے اور بعد میں رنجیت سنگھ کے ماتحتی میں نوکری کر کے افغانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔"

اس لڑائی کے بعد انگریزوں کے تعلقات گورکھوں کے ساتھ اچھے رہے۔ چنانچہ آج تک یہ پہاڑی قوم جاں نثاری اور وفاداری کا پیمان باندھے ہوئے انگریزوں کی حکومت و سطوت کے عروج کو اپنے نوجوانوں کے خون سے سینچ رہی ہے۔

زمانہ تیس سال پہلے

زمانہ جون ۱۹۱۰ء میں "کیوں روتی ہے بھارت ماتا" پر ایک دلاویز نظم شائع ہوئی تھی جس کے بعض بند تیس سال کے بعد بھی دلچسپ ثابت ہوں گے۔ چنانچہ یہاں پر ہدیۂ ناظرین ہیں۔

مضطرب کس کے لئے ہوتی ہے بھارت ماتا　　روتی ہے جانِ حزیں کھوتی ہے بھارت ماتا
داغ افلاس کو یوں دھوتی ہے بھارت ماتا　　دانہ اشک پڑی بوتی ہے بھارت ماتا
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا

مادر مشفق و غمخوار ہے بھارت ماتا　　غم اطفال میں بیمار ہے بھارت ماتا
فکر روزی میں ہوئی زار ہے بھارت ماتا　　آج کل زیست سے بیزار ہے بھارت ماتا
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا

کب سے پامال جفا ہوتی چلی آتی ہے　　ہدف تیر بلا ہوتی چلی آتی ہے
کشتۂ تیغ قضا ہوتی چلی آتی ہے　　کہ یہ مظلوم سدا ہوتی چلی آتی ہے
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا

رہروِ منزل

از سید محمد ابن علی بی۔اے

عالم وجود میں آنکھ کھلتے ہی انسان کو ایک نیلگوں چتر کے زیر سایہ تختِ خاکی پر ایک کہن سالہ عورت کچھ عجب انداز سے بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اُس کا طریقہ نشست بتاتا تھا کہ وہ کسی فکر میں سرگرداں ہے اور اُس کا دماغ کسی ذہن میں چکر کھا رہا ہے۔ اُس کا چہرہ برابر متغیر ہوتا رہتا، ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا۔ کبھی بشاشس ہو کر اس طرح چمک اٹھتا کہ مجسمۂ نور معلوم ہونے لگتا اور کبھی اتنا مضمحل ہوتا کہ وہی نور مبدل بہ سیاہی ہو جاتا۔ اُس کے سر پر اک بارِ گراں رکھا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دست و پا میں ایک خفیف سا رعشہ پڑ گیا تھا۔ تمام جسم پر صدہا جھرّیاں اور ساتھ ہی لاکھوں نشان پڑ گئے تھے۔ گو پیرانہ سالی نے اُس کے اصل پیکر میں اس قسم کے لاکھوں انقلاب پیدا کر دئے تھے تاہم اُس کے کھوئے ہوئے شباب میں اب بھی ایک مقناطیسی کشش باقی تھی۔ اُس کے ایک دامن میں کچھ پھول تھے اور دوسرے میں کچھ خار، اور وہ اُن کو اس طرح اٹھائے ہوئے تھی کہ دامنِ گل، دامنِ خار سے پہلے نظر آتا۔ مگر دور بین نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ وہ رہروانِ ملکِ عدم کو دامنِ گل دکھا کر کانٹوں میں اُلجھانا چاہتی ہے۔

اس عجیب الخلقت مخلوق کو دیکھ کر انسان بُت بن کر رہ گیا اور اس حیرت و استعجاب کے عالم میں اُسے کچھ وقفہ گذر گیا۔ آخر کار اُس نے ایک ایک سے بہ تعجب دریافت کرنا شروع کیا کہ وہ عورت کون ہے؟ اور یہاں کس لئے بیٹھی ہے؟ استفسار کا سلسلہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ کسی نے بڑھ کر آواز دی۔ "یہ وہی عورت ہے جس کی پیدائش آج سے صدہا سال قبل بمصداق لفظ "کُن" عمل میں آئی تھی اور اسی کا نام "دُنیا" ہے۔ کہاں کھڑا ہے؟ جا اور اپنا کام کر۔"

دُنیا کا نام سُنتے ہی اُس نے تیزی سے قدم اٹھانا شروع کیا۔ چاہتا تھا کہ جلد ہی اُس کے سامنے سے گذر جائے۔ مگر پریشان تھا کہ جائے تو کدھر جائے۔ راستہ مستقیم نہ تھا۔ راہ دررراہ تھی اور نہایت پیچیدہ۔ پریشانی کے عالم میں دربدر کی خاک چھانتا ایسے مقام پر جا نکلا، جہاں سے راستہ کا بالکل پتہ نہ چلتا تھا۔ بے چارہ گم گردہ راہ حیرانی کے عالم میں تھک کر منزل تک پہونچنے کی فکر میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی نگاہِ تجسس ادھر سے اُدھر دوڑا ہی رہا تھا کہ تھوڑے فاصلے پر ایک ہجوم نظر آیا۔ آگے

بڑھا تو دیکھا کہ وہ مجمع مختلف حالات اور مختلف خیالات کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ہر شخص ایک نئے رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ کوئی سرگرم عیش ونشاط تھا تو کوئی محو اختلاط، کوئی مصروف بادہ نوشی تو کوئی بحالت خاموشی، کوئی سجادہ نشین تھا تو کوئی عزلت گزیں، کوئی روتا نظر آیا تو کوئی ہنستا، کوئی سر دھنتا اور کوئی سرد آہیں بھرتا تھا، کوئی شہسوار میدان علم وعمل تو کوئی غرق دریائے نکبت وجہل کسی کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی۔ کسی کے سر پر تاج شہنشاہی، کوئی دولت وعزت سے مالامال۔ کسی کا افلاس وغربت سے برا حال۔ مجمع کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ سمجھا کہ شاید یہی میری بھی منزل ہو۔ قریب تھا کہ ان میں سے کسی کا ہاتھ پکڑلے کہ یکایک ایک مرد خوبصورت ونیک سیرت پر اس کی نظر پڑی جس کے چہرہ پر متانت وبردباری تھی، جس کی پیشانی کشادہ اور چمکدار تھی، جکی آنکھیں نورانی تھیں اور جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ اس کا نام "مرد خرد" تھا۔

اس سے نگاہ دو چار ہوتے ہی مسافر کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہوگیا۔ پریشانی اور اضطراب میں کمی ہوئی۔ اس نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور منزل مقصود تک پہونچا دینے کی التجا کی۔ مرد خرد اس کی بے چینی کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

"میں تو خود تمہاری رہبری کرنیکے لئے دیر سے یہاں کھڑا ہوں مگر تمہیں تو مجھ سے ملنے کی فکر ہی نہ ہوئی خیر چلو، میں تمہیں تمہاری اصل منزل تک پہونچا دینے کی کوشش کروں گا۔ مگر یہ خیال رہے کہ میرے حکم بغیر قدم نہ اٹھے ورنہ نتیجہ اس کا ایذائے ابدی ہوگا۔ دیکھو، سامنے دو راستے نظر آرہے ہیں۔ ایک کا سلسلہ ملک جنت نشان پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا دوزخ مکان کی طرف گیا ہے۔ پہلا راستہ تو وہی ہے جو تمہیں تمہاری منزل تک پہونچا دے گا۔ جہاں تم آسودگی کی زندگی بسر کرسکوگے، گو اس راہ میں چلنے کے لئے تمہیں جفاکشی سے کام لینا ہوگا۔ دوسرا راستہ بظاہر پر امن ہے مگر میں تمہیں اس پر چلنے کی اجازت نہ دوں گا"

مرد خرد کی اس ہمدردانہ گفتگو نے اس کے دل میں جگہ کرلی اور اس نے اس کو اپنا ہمدرد پاکر اس کے ساتھ چلنے پر کمر باندھ لی۔ غرض اس کی رہنمائی میں قدم شوق اٹھاتا ہوا منزل پر پہونچنے کی امید میں راہ طے کرتا چلا جارہا تھا۔ طرح طرح کی وادیوں سے گذر ہوا۔ اکثر سراؤں میں قیام کرنا پڑا۔ سیکڑوں چیزیں اس کی نظر سے گذریں، مگر اس نے مرد خرد کے مشورہ بغیر کسی چیز کو نگاہ بھر کے نہ دیکھا اور نہ کسی طرف متوجہ ہوا۔ البتہ جب کبھی مرد خرد کا اشارہ پایا تو رک کر کچھ چیزیں اپنے دامن میں بھرلیں۔ غرض وہ شخص یونہی برابر چلا جارہا تھا اور آسودگی سے راستہ طے ہورہا تھا۔ اب اس کو منزل مقصود

پر پہونچ جانے کا یقین کامل ہوگیا تھا۔ تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد وہ کچھ اِس طرح مطمئن ہوا کہ مردِ خرد کی رہنمائی کا خیال نہ رہا اور اُس کے قدم پر قدم رکھنا بھول گیا۔ اس طرح اُسے خبر ہی نہ ہوئی اور وہ بھٹک کر راہ سے بے راہ ہوگیا۔ مردِ خرد اُس سے کوسوں دُور ہوگیا۔ اور یہ اُس سے منزلوں ہٹ گیا۔

چلنے والا اب پھر تنہا رہ گیا۔ مگر اُسے کچھ ہوش اور وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اُسے جلد ہی مسافروں کے لوٹ لینے والے رہزنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یکایک کسی نے اُس کے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔ آنکھ اُٹھائی تو عجب صورت نظر آئی۔ ایک قوی ہیکل ڈاکو، جس کی شکل پر پھٹکار برس رہی تھی اُس کے مقابل تھا اُس لٹیرے کے ہاتھ نہایت لمبے، پیٹ بڑا اور آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی' ایسی کہ دیکھنے والے کو اُن کے بے نور ہونے کا فوراً یقین ہو جاتا تھا۔ بدقطع چہرہ، پھیلا ہوا مُنھ جس پر ناک بھی نہ تھی۔ عوام میں "حرص" کے نام سے مشہور تھا۔ اُس نے مسافر کی دولتِ قناعت کو لوٹ اُسے بالکل مفلس کر دیا۔ لاچار ہو کر اِس نے قزاق ہی کی خوشامد کی۔ مگر اُس نے ایک نہ سُنی۔ آخر کار اس نے اُسی کا ساتھ دینے کا قصد کر لیا۔ قزاق کے گروہ میں شامل ہونا تھا کہ اُس نے ہاتھ بڑھا کر بنت الوقت کے ہاتھ پر جسکا نام "بی عرض" تھا بیعت کر لی۔ اب عالم ہی جداگانہ ہوگیا۔ غفلت کے پردے آنکھوں پر پڑ گئے' دیکھ بھی نہ سکا کہ اُس کا قدم کس راہ پر ہے۔ چلنے کو تو چلتا گیا مگر آگے کا کچھ خیال نہ رہا۔ جاتے جاتے اُس کا قدم "چاہ مذلت" میں جا پڑا اور وہ اُوندھے مُنھ اُس کنویں میں گر پڑا۔ پھر تو ذلت و حقارت کے پانی میں غوطے کھانے لگا۔ پانی سر سے اونچا ہوا تو گھبرا کے آنکھیں کھولیں۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر پانی سے نکل نہ سکا۔ بہت غور و فکر کے بعد مردِ خرد کا خیال آیا۔ گردن جھکائی تو مردِ خرد کا عکس پانی میں جھلکتا ہوا نظر آیا۔ اپنی غفلت پر دل میں شرمندہ ہوا۔ فوراً دستِ توبہ بلند کئے۔ ایثار کی رسن ہاتھ میں آگئی، پھر کیا تھا۔ نیکی نے سہارا دیا۔ آسانی سے بلند ہو کر کنویں سے باہر نکل آیا۔ کمزوری و نقاہت قدم نہ اُٹھانے دیتی تھی۔ مگر ہمت نے اُسکا ہاتھ پکڑا۔ مستعدی کا پٹکا کمر میں باندھ اُس نے قدم اُٹھانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں ایک ایسی بستی میں جا پہونچا۔ جہاں رحمت کا ابر چھایا ہوا تھا۔ کرم کی بارش ہو رہی تھی۔ راحت و آرام کی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دریائے عیش موجیں مار رہا تھا۔ ابر و باد کے باوجود بھی سکون کا عالم تھا۔ طائرانِ خوش الحان اُس پُر کیف فضا میں مست ہو ہو کر وفا کے گیت گا رہے تھے۔ لوگ عقیدت کے جھولے ڈالے محبت کے پینگ بڑھا رہے تھے۔ شاہ فرخندہ حال و ملکہ اُلفت زمانی کا راج تھا۔ اب مسافر بہت کچھ مسافت طے کر چکا تھا اُس کی منزل قریب تھی۔ مُلک جنت نشان نظر آنے لگا تھا۔ ایک نفس کا فاصلہ تھا۔ چشم زدن میں منزلِ مقصود پر جا پہونچا۔

استقبال

(از حضرت نظرت واسطی)

مہماں ہے اللہ اللہ مرے گھر خدائے ناز
ہر نگب عرشِ ناز ہے کاشانۂ نیاز

دیوار و در میں حسن ہے آب و ہوا میں رنگ
امروز مہر و مہ ہیں مرے گھر کے خشت و سنگ

ذرّوں میں آگئی ہے وہ تابانیٔ مزاج
گویا تمام صحن میں تارے بچھے ہیں آج

یہ تابشِ جمال یہ برق افگنیٔ حسن
ہے آج سارے گھر میں مرے روشنیٔ حسن

جنّت کا روپ لوٹ کے جنّت بنا ہے گھر
فردوسِ حسن و عرشِ لطافت بنا ہے گھر

گھر باغ در کنار ہوا مشک بار ہے
معیار خاص پر مرے گھر کی بہار ہے

منظر بھی لاجواب ہے موسم بھی لاجواب
ہر سانس موج مے ہے نظر مست اور خراب

کچھ فکر آج کی ہے نہ فردا کا ہوش ہے
دنیا کا غم ہے مجھ کو نہ عقبیٰ کا ہوش ہے

یہ اس لئے کہ آج ہے مہماں خدائے ناز
دل ہے مرا بہارِ دو عالم سے بے نیاز

آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں معراجِ رسم و راہ
جو بات ہے حدیث عنایاتِ بے پناہ

نازاں ہوں میں کہ ہاتھوں میں ہاتھ ہیں حسن کی
رقصاں ہوں میں کہ مجھ پہ نگاہیں ہیں حسن کی

یہ رنگِ التفات یہ رنگینیٔ حیات
ہر سانس میں سجی ہوئی ہے شوق کی برات

میں میزباں ہوں آج عروسِ بہار کا
مجھ پر کرم ہے حسن کے پروردگار کا

پایا ہے میں نے آج محبت کا تخت و تاج
آنکھوں میں روشنی کی جگہ بجلیاں ہیں آج

سینے میں دل نہیں ہے محبت کی آگ ہے
نغمہ نہیں ہے میرا جوانی کا راگ ہے

ہر موجۂ نفس میں خوشی کا پیام ہے
ہر جنبشِ نظر میں وفا کا سلام ہے

یہ اس لئے کہ آج ہے مہماں خدائے ناز
دل ہے مرا بہارِ دو عالم سے بے نیاز

تنقید کتب

علم الحروف[1]

انسان اور دیگر جانداروں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ جانور اپنا مافی الضمیر اپنی جنس کے اُن جانداروں تک پہونچا سکتا ہے جو سامنے یا قریب موجود ہوں، مثلاً بندر چیخ کر یا کلکاری مار کر اپنی برادری کو اکٹھا کر لیتے ہیں، اور کوّے کائیں کائیں کر کے آس پاس کے کوّوں کا ٹڈی دل ایک جگہ لے آتے ہیں، مگر وہ اپنا مافی الضمیر کسی دُور دراز مقام کو منتقل نہیں کر سکتے۔ مگر انسان بعض مخصوص اور مسلمہ اشارات یا نقوش کے ذریعہ سے اپنا مافی الضمیر ہزاروں کوس کے فاصلہ پر شخص غیر حاضر کے پاس پہونچا سکتا ہے۔ انھیں اشارات یا نقوش کو جو انتقال مافی الضمیر کا ذریعہ بنتے ہیں، اصطلاح میں "حروف" کہتے ہیں۔ یہ حروف کب اور کیونکر ایجاد ہوئے؟ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے۔ جسے زیر نظر کتاب میں حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر دہلوی نے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں قدیم مذہبی روایات، اثریات اور جدید ریسرچ سے کام لیا ہے۔ کتاب کے شروع میں مفرد و مرکب الفاظ کے وجود میں آنے کے اسباب بھی بیان کر دئے ہیں۔

دُنیا میں ہزاروں قومیں آباد ہیں۔ اور ہر قوم اپنی بولی جداگانہ رکھتی ہے۔ بعض قومیں ایسی بھی ہیں جو بولی تو رکھتی ہیں لیکن حروف نہیں رکھتیں۔ دُنیا کی تمام قوموں کو چار نسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔ (۱) آریا (۲) سامی (۳) مغل اور (۴) حبشی۔ اگرچہ بعض نسلیں انھیں چار سے مخلوط ہو کر بنی ہیں۔ آریا نسل میں ہندوستان، افغانستان، ایران، شمالی وسطی اور مغربی یوروپ کے لوگ شامل ہیں جنکی زبانیں سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ سامی نسل میں عرب، یہود اور شمالی افریقہ کے لوگ داخل ہیں۔ ان کی بولیاں آرامی زبان سے ماخوذ ہیں۔ مغلئی نسل میں تبت، چین، منگولیا، جاپان، برہما وغیرہ کے لوگ ہیں جنکی بولیاں چینی زبان سے ماخوذ ہیں۔ حبش، سوڈان، نوبہ اور بقیہ افریقہ اور جزائر بحر الکاہل کے لوگ حبشی یا مخلوط حبشی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی بولیوں پر زیادہ تر سامی زبانوں کا اثر پڑا ہے۔

حروف کی ایجاد جانوروں اور اشیا کی تصویروں سے ہوئی۔ ایسے حروف کو اصطلاح میں صوری یا ہیرو غلیفی کہتے ہیں۔ قدم مصری اور موجودہ چینی اور جاپانی حروف ان کی زندہ مثالیں ہیں۔

---

[1] قیمت تین روپیہ - ملنے کا پتہ:- حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر فراش خانہ دہلی۔

جنمیں امتدادِ زمانہ سے ردو بدل ہوتے ہوتے ایک خاص صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اِس وقت دُنیا میں صرف چار قسم کے حروف ابجد رائج ہیں۔ اور دُنیا بھر کی زبانیں خفیف تغیر و تبدل کے ساتھ اُنھیں حروف میں لکھی جاتی ہیں۔ یعنی،

(۱) چینی (چین، جاپان، تبت، منگولیا، کوریا، برہما وغیرہ)

(۲) دیوناگری (سنسکرت اور ہندوستان کی تمام زبانیں اُردو کے سوا)

(۳) سامی (اردو، فارسی، عربی وغیرہ)

(۴) لاطینی (تمام یوروپین زبانیں اور ترکی)

موجودہ عربی و فارسی حروف ابجد کی ایجاد کا سہرا مورخین کے نزدیک فنیقی قوم کے سر ہے، جنہوں نے مصری ہیروغلیفی ابجد میں اصلاح کی۔ موجودہ عربی حروف فنیقی ابجد ہی سے ماخوذ ہیں۔

اِس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں آغاز آفرنیش سے لیکر اسوقت تک کے حالات لکھے گئے ہیں جب حروف ابجد کی ایجاد ہوئی۔ اسی سلسلہ میں مصر قدیم کی مختصر تاریخ اور قدیم ملوک عرب کے مختصر حالات اور مختلف قسم کی ابجدوں کی تاریخ بھی درج کی گئی ہے۔ یہ حصہ خاص تلاش و تجسس اور دماغ سوزی سے لکھا گیا ہے جس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ دوسرا حصہ ایران یا عجم سے مخصوص ہے، جسمیں تاریخی حالات کے علاوہ مختلف قسم کے خطوں کی تشریح کی گئی ہے۔ اور ایران کے مشہور خطاطوں کے حالات بھی درج کئے گئے ہیں۔ ضمناً آشوریہ، بابل اور عرب کے حالات بھی آگئے ہیں۔ ہندوستان کے سلاطین مغلیہ کے حالات بھی ہیں اور سب سے دلچسپ یہ ہے کہ اس حصہ میں اُردو و فارسی پریس کے حالات بھی مختصراً درج ہیں، تیسرے حصہ میں کاغذ، قلم، سیاہی پر بحث کی گئی ہے اور چوتھے حصہ میں قدیم و جدید زبانوں کے شجرے اور ان کی ابجدوں کے نمونے اور بہت سے دیگر نقشے اور مشہور خطاطوں اور خطوں کے نمونے دئے گئے ہیں۔ آخر میں سولہ صفحہ کا ایک ضمیمہ لگایا گیا ہے، جسمیں مرموز ابجدوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تعویذ نگاری کے آرٹ کی بھی خاص طور پر تشریح کی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جو علم الحروف کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے نہایت دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دئے ہیں۔ چنانچہ جہاں جس ماخذ سے کوئی مضمون لیا ہے، حاشیہ میں اُس کی طرف اشارہ کردیا ہے۔ زمانہ کے جن پرچوں سے استفادہ کیا گیا ہے، اُن کا بھی حوالہ دیدیا ہے حالانکہ اُردو میں عام طور پر مصنفین و مولفین حوالہ دینے میں افسوسناک بُخل سے کام لیتے ہیں۔ بہر حال یہ کتاب بہت پُر از معلومات اور دلچسپ ہے۔ جس پر ہم حضرت [illegible] صاحب کو

تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

اِس کی لکھائی، چھپائی بھی روشن ہے۔ کاغذ رسمی، ضخامت ۲۴۶ صفحے۔

زندگی[1]

یہ کتاب اُردو کے مشہور مزاحیہ نگار مُلا رموزی کے بعض مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو مُلا صاحب نے اپنے خاص رنگ میں لکھے ہیں۔ بعض بعض ایسے قابلقدر جملے اور فقرے آگئے ہیں جنھیں پڑھ کر بڑے بڑے فقرہ باز بھی ہنسی ضبط نہیں کر سکتے۔ اگرچہ مُلا صاحب اپنی مخصوص چیز یعنی گلابی اردو کے لئے مشہور ہیں، لیکن لٹریری قسم کے مضامین میں بھی آپ کو اچھا خاصہ دخل ہے۔ اگرچہ وہ اپنی "ننھے کی اماں" کے ذکر اور خودستائی سے کہیں نہیں چوکتے۔ مضامین کے اِس مجموعہ میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی پر خاص عنایت فرمائی گئی ہے۔ مقدمہ میں جو خود نوشت ہے مُلایانہ یا مولویانہ رنگ بھی دکھایا گیا ہے۔ جس میں خودستائی کے ساتھ اہلِ قلم حضرات پر خفیف چوٹیں بھی ہیں۔ سفر کانپور کے حالات کے سلسلے میں ایڈیٹر زمانہ سے ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ ایک آدھ مقامات میں اُنھیں کچھ سوءظنی بھی ہوئی ہے جو ایک پُر مذاق مصنف کے شایان شان نہیں کہی جاسکتی ہے۔ بہرحال جن حضرات کو مُلا صاحب سے عقیدت و ارادت ہے اُنھیں اِس کے مطالعہ سے خاص لُطف آئے گا۔ کیونکہ مضامین میں زیادہ حصہ آپ بیتی کا ہے۔

لکھائی، چھپائی، کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات۔

وفاقِ ہند[2]

اِس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۵ء تک ہندوستان کے سیاسی حالات پر معقول روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے پڑھنے والے کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس میں ۱۹۳۵ء کا نظم و نسق ہند کا نیا قانون بھی تمام و کمال شامل ہے۔

ہمارے نزدیک خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ایل۔ایل۔ڈی، بارایٹ لانے یہ کتاب لکھکر اُردو پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ کیونکہ اس کے مطالعہ سے اُردو دان جماعت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء سے بخوبی واقف ہوسکتی ہے۔ اِس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اِس کا تمہیدی نوٹ "پیش لفظ" کے نام سے آنریبل سر شاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ آف انڈیا جیسے مشہور و معروف قانون دان مدبر نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کی لکھائی، چھپائی اور کاغذ سب اعلیٰ۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔

---

[1] قیمت دو روپیہ (عہ)۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔

[2] قیمت ایک روپیہ (عہ)۔ ملنے کا پتہ:۔ اُردو لٹریچر کمپنی، دہلی۔

تاریخ انجمن ہند اودھ[1]

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب گورنمنٹ نے "بجلدوئے خدمات احسن" اودھ کے تعلقداروں کو جاگیریں اور سندیں عطا فرمائیں، تو بعض دُوراندیش تعلقداران اودھ نے انجمن بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ مہاراجہ دگبجے سنگھ والیٔ بلرام پور، مہاراجہ مان سنگھ والیٔ اجودھیا اور بابو دکھنارنجن مکرجی تعلقدار شنکرپور ضلع رائے بریلی نے باہم مشورہ کرکے انجمن تعلقداران اودھ کے قیام کی تجویز مرتب کی، تو چیف کمشنر سر چارلس ونگفیلڈ نے اُسے بہت پسند کیا۔ چنانچہ ۲۶ر مارچ ۱۸۶۱ء کو تمام سربرآوردہ تعلقداران اودھ کا ایک عظیم الشان جلسہ عیش باغ میں منعقد ہوا جسمیں بابو دکھنارنجن مکرجی کی تحریک پر "انجمن تعلقداران اودھ" قائم ہوئی، اور اُس کا انگریزی نام "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" قرار دیا گیا۔

اِس انجمن نے کیا کیا کارنامے انجام دئے، اس کا مفصل حال خان بہادر شیخ صدیق احمد صاحب ایم۔بی۔اے، اسسٹنٹ سکرٹری انجمن مذکور نے نہایت تلاش و تحقیق اور دیدہ ریزی کے بعد پوری شرح و بسط سے کتاب مندرجہ عنوان میں درج کردئے ہیں۔ یہ گویا انجمن تعلقدارانِ اودھ کی ایک مفصل تاریخ ہے جسمیں انتزاع سلطنت اودھ سے ۱۹۳۵ء تک کے حالات درج کردئے گئے ہیں۔ پوری کتاب کے تین۳ حصے کئے گئے ہیں۔ جنمیں دو۲ حصے شائع ہوچکے ہیں اور تیسرا حصہ زیر تیاری ہے۔ جن لوگوں کو لکھنؤ، اودھ اور خصوصاً تعلقداران اودھ کے مفصل حالات سے دلچسپی ہو، اُنھیں اِس سے بہتر کتاب نہیں مل سکتی۔ فاضل مصنف نے اسے لکھ کر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ کتاب پبلک اور پرائیویٹ لائبریریوں میں رکھے جانیکے قابل ہے۔

اِس کی لکھائی، چھپائی بھی بہت روشن ہے، کاغذ اور جلد سب نفیس ہے۔ تینوں حصّوں کی ضخامت ایک ہزار صفحات کے قریب ہوگی۔

قرآن پاک[2]

یہ مختصر رسالہ مولوی عبدالواحد سندھی اُستاد مدرسہ "جامعہ ملیہ دہلی" نے مسلمان بچوں کے لئے عام فہم اور سلیس زبان میں لکھا ہے۔ اِسمیں قرآن شریف کی حقیقت اور تعلیم پر مفصل اور دلنشین پیرایہ میں بحث کی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں اسلام کے متعلق ضروری باتیں درج کردی گئی ہیں۔ مسلمان بچوں کیلئے یہ کتاب مفید ہوگی۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ ہے۔

---

[1] قیمت فی حصہ چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ خان بہادر صدیق احمد صاحب اسسٹنٹ سکرٹری انجمن تعلقداران اودھ، قیصر باغ لکھنؤ۔

[2] حجم ۱۰۳ صفحات۔ قیمت ۶ر۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

بغداد کا چاند[1]

آجکل ملک کا کوئی اخبار اور کوئی رسالہ ایسا نہیں جسمیں کوئی نہ کوئی فسانہ درج نہ ہو مگر اُنکا مقصد محض تفریح طبع ہوتا ہے۔ اور وہ اصلاحی یا حکیمانہ رنگ بہت پھیکا ہوتا ہے، جس کی بدولت پریم چند کا نام رہتی دُنیا تک قائم رہے گا۔

زیر نظر ناول بھی جس کے مصنف سید عبدالرحمن جوہری۔ اے زمیندار جاجمئو ضلع کانپور ہیں، محض تفنن طبع کیلئے نہیں لکھا گیا ہے، اس کا اصلی مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح "احسان کا بدلا احسان ہی ہوتا ہے"۔ فسانہ کا پلاٹ عہد عباسیہ کے بغداد میں رکھا گیا ہے۔ اور خاندانِ برامکہ کی تباہی سے شروع کیا گیا ہے۔ اسمیں شرافت، تہذیب و تمدن اور حرّیت و آزادی کی رنگین تصویریں نظر آتی ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی عربی عورتوں اور مردوں کی تعلیم و تربیت کن مدارج تک پہونچی ہوئی تھی۔ اس فسانہ میں جہاں کہیں فلسفہ و حکمت کی چاشنی دی گئی ہے، وہ بہت سبق آموز ہے۔ البتہ فاضل مصنف نے ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے۔ جس کے باعث پلاٹ کی بعض تفصیلات تشنہ رہ گئی ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اوسط درجہ کا۔ حجم ۱۰۰ صفحات

لطائف غالب[2]

مرزا غالب نے اُردو شاعری میں فلسفہ و حکمت کو داخل کیا۔ لیکن یہ واقعہ شاید زیادہ اصحاب کو معلوم نہ ہو کہ وہ انتہا درجہ کے ستم ظریف بھی تھے اور اُن کے لطائف و ظرائف لوگوں کو تڑپا دیتے تھے اگرچہ یادگار غالب اور بعض دیگر کتابوں میں مرزا کی بذلہ سنجی سے کافی بحث کی گئی ہے لیکن اُن ضخیم کتابوں کے پڑھنے کے لئے مدت درکار ہے، مسٹر ایم۔ اے شاہ پی ایس سی۔ ایف پی سی کا ہمیں ممنون ہونا چاہئے کہ اُنھوں نے اس چھوٹی سی کتاب میں مرزا غالب کے تمام لطائف و ظرائف یکجا کر دئے ہیں۔ اِس رسالہ میں غالب کے سینتالیس لطیفے درج ہیں، جو بہت ہی پُر لطف ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔

مقالات شبلی[3]

دار المصنفین اعظم گڈھ نے اس عنوان سے علامہ شبلی مرحوم کے تمام مضامین کتابی صورت میں شائع کئے ہیں۔ اس مجموعہ میں سات تحقیقی و تاریخی مضامین ہیں۔ ہر مضمون دلائل اور حوالوں کیساتھ اپنی جگہ جامع اور قابل قدر ہے۔ بعض رائیوں میں اختلاف کی گنجائش ضرور ہے لیکن تحقیق کے شائق اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ مُفید اور دلچسپ ثابت ہوگا۔ لکھائی، چھپائی کاغذ سب قابل قدر ضخامت: ۱۴۲ صفحات

---

[1] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مستورات پریس، پریڈ کانپور۔
[2] قیمت ۴ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ پنجاب ریلوے روڈ، لاہور۔ [3] قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڈھ

نوحہ

(بر وفات بابو بشمبھر ناتھ سریواستو یہ، ایم۔ اے)

(از حضرت کیلاش ورما شایق ہتھگامی)

کیا قیامت ہے زمیں کیوں لرزہ براندام ہے   کیا کسی کو موت کا یارب ملا پیغام ہے
صبح کی تابانیوں میں ظلمتِ ایام ہے   تابشِ نورِ سحر وقفِ سوادِ شام ہے
زندگی سے موت ملنے کے لئے ہے بیقرار
جیسے دُلہن آتی ہو مستانہ وش مستانہ وار

کون یارب ہو رہا ہے اب جُدا بیگانہ وار   کون آخر موت سے اُف ہو رہا ہے ہمکنار
جس کی فرقت میں ہوا یوں آہ میرا حال زار   چشم گریاں، سینہ بریاں، طبع مضطر، دل فگار
سینۂ سوزاں سے شعلے اُٹھ رہے ہیں باربار
اشکِ خوں برسا رہی ہے چشمِ تر لیل و نہار

وہ کل تک تھا جو اپنا، آج وہ بیگانہ ہے   جو حقیقت تھا کبھی وہ بن گیا افسانہ ہے
آج ساقی ہی نہیں گو شیشہ اور پیمانہ ہے   جانِ میخانہ نہیں باقی مگر میخانہ ہے
غنچہ کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُف مرجھا گیا
ابرِ غم دل پر سحابِ یاس بنکر چھا گیا

او مرگِ ناگہانی تو نے یہ کیا کر دیا   گلشن ہستی کو ویراں کر کے صحرا کر دیا
ستم زدوں میں ظلم کا در تو نے جب وا کر دیا   وہ ہنگامہ و محشر سا برپا کر دیا
حیف مٹکر رہ گیا کتنی دواؤں کا اثر
اور باطل ہو گیا ساری دعاؤں کا اثر

جا رہا ہے کون ہم سے منہ کو یوں موڑے ہوئے   رشتۂ عہدِ وفا کو اس طرح توڑے ہوئے

ہے کوئی مضطر ادھر بھی اپنا جی چھوڑے ہوئے
یاس و حرماں سے دلِ صد لخت کو جوڑے ہوئے
آگ کے شعلوں میں جب نظروں سے پنہاں ہو گیا
آتشِ رنگیں سے مل کر اور تاباں ہو گیا

اس بھری محفل کو اب سونی کئے جاتا ہے کون
دوستوں کو داغِ فرقت کا دیئے جاتا ہے کون
دل سے میرے صبر و تسکین اب لئے جاتا ہے کون
آہ یوں جامِ فنا آخر پیئے جاتا ہے کون
کون اپنی زندگی سے اس قدر بیزار ہے
کون شائق موت سے یوں بر سرِ پیکار ہے

رُباعیّات

(از حضرت جگر بریلوی، بی۔ اے)

گر رنج ہو کم تو رنج کرنا اچھا
تدبیر و علاج ہی میں مرنا اچھا
جب حد سے گزر گیا ہو پانی سر پر
غفلت ہی میں عمر کا گذرنا اچھا

جب رنج سے دل نڈھال ہو جاتا ہے
معمورِ فنا خیال ہو جاتا ہے
محویتِ غم سے دل کی گہرائی میں
محسوس ترا وصال ہو جاتا ہے

تدبیر و عمل ہے زندگانی کا نام
تکمیلِ صفات ہی بشر کا ہے کام
جینا کیا ہے دماغ و دل کی تعبیر
ہے زندگی خود ہی زندگی کا انعام

سرمایۂ نازِ زندگانی دل ہے
سامانِ نشاطِ نوجوانی دل ہے
ہے تابعِ دل جگر حیاتِ جاوید
دراصل سروشِ آسمانی دل ہے

رفتار زمانہ

الف (غیر ملکی)

سیاسیات یوروپ کی حالت جیسی ایک ماہ پہلے تھی تقریباً ویسی ہی اب بھی ہے کہ زیکو سلاویکیا کے معاملہ میں جنگ چھڑ جاتی۔ مگر اب وہ اندیشہ جاتا رہا۔ کیونکہ اُدھر انگلستان نے زیکو سلاویکیا کو یہ مشورہ دیتے ہوئے کہ وہ اپنی آزادی محفوظ رکھتے ہوئے بدرجۂ اتم جرمنوں کو مراعات دیدے اس بات کا صاف طور پر اطمینان نہیں دلایا کہ وہ زیکو سلاویکیا پر دست درازی کے وقت مداخلت نہیں کریگا۔ اِدھر فرانس اور روس نے اعلان کردیا کہ وہ متذکرہ بالا ظہور پر زیکو سلاویکیا کی اعانت کریں گے۔ اِن وجوہ سے ہٹلر کو ضبط سے کام لینا پڑا۔ لیکن یہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہٹلر کس وقت زیکو سلاویکیا کے ساتھ آسٹریا جیسی کارروائی کر بیٹھیگا اہلِ زیکو سلاویکیا خود دار بھی ہیں اور سریع الحس بھی۔ نیز اُنکی جنگی طاقت بھی کافی ہے غالباً وہ آسٹریا کی طرح بلا مقابلہ کئے سرِ تسلیم خم نہ کرینگے۔ ہٹلر نے بھی ان سب امکانات کو بخوبی سمجھ لیا ہے، مگر بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ موجودہ گورنمنٹ برطانیہ ہٹلر اور مسولینی کو خوش کرکے اپنے مالِ غنیمت کو برقرار رکھنے کیلئے درپردہ اِس بات کی کوشاں ہے کہ فرانس کی موجودہ گورنمنٹ پر جو اشتراکیت کی طرف مائل ہے فرانس کی مخالف پارٹی کو غلبہ دلاکر موخرالذکر کے ذریعہ فرانس اور جرمنی کا سمجھوتہ کرادے اور فرانس کو اِس بات پر رضامند کردے کہ وہ وسطی اور جنوب مشرقی یوروپ کی ریاستوں کو ہٹلر کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ اِس پالسی کی وجہ دو ہیں۔ اول یہ کہ برطانیہ اِس وقت تک جنگ کے لئے تیار نہیں ہے۔ دوئم یہ کہ برطانیہ کی موجودہ گورنمنٹ جو سرمایہ داروں کی حامی ہے، جانتی ہے کہ ہٹلر اور مسولینی دُنیا میں اشتراکیت کے حریف اور سرمایہ داری کے محافظ ہیں۔

غرض اِسوقت برطانیہ کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ وہ اپنی جنگی طاقت بڑھائے، گو بحری طاقت قابلِ اطمینان ہے مگر ہوائی طاقت بہت کمزور ہے، حال ہی میں دارالعوام میں گورنمنٹ کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی گئی تھی کہ جرمن طیاروں کی تعداد برطانیہ کے ہوائی جہازوں سے دو چند ہے اور جرمنی کی ماہانہ برآورد ۳۵۰ ہوائی جہاز ہے، جس کے مقابلہ میں برطانیہ صرف سو ہوائی جہاز تیار کرتا ہے۔ اِس کمزوری نے لندن کی پوزیشن نازک کردی ہے۔ جس پر ہوائی حملہ ہوجانے کی صورت میں گورنمنٹ برطانیہ کے دست و پا شل ہوجائیں گے۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ جب تک برطانیہ اپنی ہوائی طاقت نہ بڑھائے

اُس کو بین الاقوامی سیاسیات کی بساط پر ہر چال سوچ سمجھ کر چلنی پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے چند ماہ برطانیہ کو ہٹلر اور مسولینی سے اِس قدر دبنا پڑا اور وہ چال اختیار کرنی پڑی جس کے باعث دُنیا کی نظروں میں اخلاقی طور پر رسوا ہوا۔ جنرل فرانکو نے (یا یوں کہئے کہ اُس کے آقا مسولینی اور ہٹلر نے) برطانوی جہازوں پر بمباری کی تو برطانوی گورنمنٹ اوّل اوّل چیں بجبیں ہوئی اور جنرل فرانکو سے جواب طلب کیا۔ برطانیہ کی اِس خفگی پر حریفوں نے بے اعتنائی ہی نہیں دکھائی بلکہ ڈٹ کر اور جہازوں پر بمباری کردی اور چیمبرلین صاحب کو بجز اس کے کچھ نہ سوجھا کہ وہ برطانوی تجار پر یہ بات واضح کردیں کہ جنگ کے حلقہ میں داخل ہونے پر گورنمنٹ اُن کے جہازوں کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ چیمبرلین گورنمنٹ جنرل فرانکو ہی کی فتح کی آرزومند ہے کیونکہ اسپین گورنمنٹ اشتراکیت کی حامی اور سرمایہ داری کی حریف ہے نیز گورنمنٹ برطانیہ کو یہ شبہ ہے کہ جنرل فرانکو کی فتح کے بعد اطالوی فوجیں واپس ہو جائیں گی اور "اینگلو اٹیلین" معاہدہ پر عمل ہونے لگیگا۔ لیکن یہ مقصد تو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جبکہ بعد از جنگ ہسپانوی گورنمنٹ میں مسولینی اور ہٹلر کو دخل نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اسپین کی قومی حکومت مسولینی کے کہنے پر الجزیرہ کے قریب توپیں نصب کردیگی۔ جس سے جبرالٹر کی پوزیشن قطعی غیر محفوظ اور نازک ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو مصر بچانے کے امکانات بہت کم اور برطانیہ اور اٹلی کا سمجھوتہ ہونا مشکل ہو جائے گا۔

امریکہ یوروپین سیاسیات کے بھنور میں پھنسنا نہیں چاہتا، گو کہ برطانیہ کی کوشش برابر یہی ہے کہ وہ امریکہ کو بھی اپنی پالسی کا موید بنا کر اپنے ساتھ رکھے۔ لیکن امریکہ نے ابھی تک کوئی خاطر خواہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ برطانیہ امریکہ کی دوستی اور مدد کے بغیر دوسری جنگ عظیم کی تاب نہیں لاسکتا۔ ہر چند کہ برطانیہ انتہائی جلدی کیساتھ اسلحہ جنگ میں اضافہ کر رہا ہے مگر ہنوز اسکی تیاریاں قابل اطمینان طور پر مکمل نہیں ہوئیں اور حریف تیغ بکف جنگ کی دھمکیاں دے رہے ہیں، اور جہاں موقع ملتا ہے کمزور ریاستوں کو دبوچ لیتے ہیں۔ برطانیہ مرعوب ہو رہا ہے۔ اِنھیں حالات کے زیر اثر برطانیہ نے آئرلینڈ کے مُنھ مانگے مطالبات پورے کر دیئے۔ اور بندرگاہیں بلا کسی شرط کے اُسکے سپرد کر دیں۔ دس کروڑ پونڈ کے قرضہ میں جو آئرلینڈ پر واجب الادا تھا ۹/۱۰ تخفیف کردی، بس اب تقسیم آئرلینڈ کی تنسیخ کا معاملہ رہ گیا ہے، وہ کسی دن ڈی ویلرا کے حق میں فیصل ہو جائے گا۔

اِس وقت برطانیہ کا حریف جرمنی زوروں پر ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں بھی جب دُنیا میں جرمنی کا طوطی بول رہا تھا اور آئرلینڈ بغاوت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ تو اُس نے جرمنی سے اسلحہ بہم پہونچانے کیلئے التجا کی تھی۔

اُس وقت آئرلینڈ کے ساحل تک غنیم کے جہاز کا عزم کرنا جان ہتھیلی پر رکھ کر چلنا تھا تاہم جرمن جانبازوں نے حوصلہ کرکے ایک جہاز ناورے کے جہازوں کی وضع پر تیار کرکے اور اس کے عملہ کو نارویجی لباس پہنا کر "ٹرالی" کی خلیج تک بھیجدیا تھا۔ مگر باغی کشتیاں لے کر موعودہ وقت پر نہ پہونچے، کیونکہ اُنھوں نے پروگرام بدل دیا تھا۔ جہاز کے کپتان نے بڑی ہمت دکھلائی وہ وہاں سے واپس نہ ہوا۔ اور باغیوں کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر برطانیہ کو اُس کی خبر پہونچ گئی اور وہ جہاز پکڑا گیا۔

بہرحال اِس وقت برطانیہ نے آئرلینڈ کیساتھ جس فیاضی کا سلوک کیا ہے وہ دانشمندی اور تدبر پر مبنی ہے۔

ب (مُلکی)

ہندوستانی لیڈروں کے درپیش اُس فیڈریشن کا مقابلہ ہے جو حکومت برطانیہ جبراً و قہراً ہندوستان کے سر منڈھنا چاہتی ہے۔ لارڈ زٹلینڈ نے اِس سلسلہ میں جو تقریر لندن میں کی وہ نہایت دل شکن ہے۔ اُنھوں نے ناواجب تکبر و نخوت کا اظہار کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُنھوں نے یہی کہنا چاہا "لینا ہو تو لو نہیں تو گھر بیٹھو"۔ مانچسٹر گارڈین نے بھی لارڈ زٹلینڈ کی تقریر کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ اور یہ لکھا ہے کہ یقیناً ہندوستان ایسے فیڈریشن کو ٹھکرادیگا اور ہرگز قبول نہ کرے گا۔ لارڈ زٹلینڈ نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ ہندوستان میں جو یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ والسرائے ہند لندن اِس غرض سے گئے ہوئے کہ وہ حکومت برطانیہ کیساتھ اُس فیڈریشن میں ترمیم و تنسیخ کے متعلق غور و خوض کریں گے جسکی تشکیل انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اِس کے متعلق جہاں تک کہ اُنھیں علم ہے قطعی بے بنیاد ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اُنکی رائے میں اِس بات کا کمترین امکان ہے کہ پارلیمنٹ یا ہز میجسٹی کی گورنمنٹ اِس بات پر رضامند ہوکہ فیڈریشن کے نفاذ سے پہلے وہ اُسمیں ترمیم و تنسیخ پر غور و خوض کریں، لیکن اُنھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ایکٹ مذکور کے حدود کے اندر ہی صوبجات اور راجگان کے مناسب و ضروری مطالبات کے پورے کئے جانے کی گنجائش ہے۔ لارڈ زٹلینڈ کا ٹھیک مفہوم کیا ہے؟ اُن کی تقریر سے ظاہر نہیں ہوتا اور اس رائے میں اختلاف کی گنجائش نہیں کہ صاحب موصوف کی تقریر معاملات کے سُلجھانے کی طرف مائل نہیں، اور اس سیاسی معمہ کے پُرامن حل کی قطعی حامل نہیں اور زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے۔ کہ اُنھوں نے یہ دھمکی دیدی کہ ہندوستان اگر اِس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھاتا تو شاید ایسا موقع ہندوستان کو پھر کبھی نہ ملے۔

ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نمایندہ کو صدر کانگریس مسٹر سوبھاش چندر بوس نے جو مفصل بیان دیا۔ اُسمیں اُنھوں نے یہی کہا کہ لارڈ زٹلینڈ صاحب یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم لوگ وائسرائے اور گورنروں کے آنے

اور جانے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ انھیں ماڈرن انڈیا سے قطعی واقفیت نہیں۔ انڈیا کی قسمت ان لوگوں کے ہاتھوں یا صاحب موصوف کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ انڈیا کی قسمت ہم لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور ہمیں اس امر کا احساس ہے۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے اُس حصہ کا نفاذ جسکا تعلق صوبجاتی حکومتوں سے ہے ہو ہی چکا ہے۔ صوبجات میں حکومتیں بالخصوص کانگریسی حکومتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہیں مگر اس کامیابی کیلئے سنٹرل گورنمنٹ کی مدد لابدی ہے نیز یہ ایک امر واقعہ ہے کہ صوبجات کی حکومتوں کا مدار اقتصادی بہبودی پر ہے۔ صوبجات کا واسطہ براہِ راست اہلِ زراعت سے ہے اور اُن کے بجٹ میں آمدنی کا سب سے بڑا حصہ انھیں اہلِ زراعت کی فارغ البالی کا محتاج ہے۔ اِس فارغ البالی کے لئے عین ضروری ہے کہ روپیہ کی شرح تبادلہ میں کمی کر دیجائے یعنی شرح تبادلہ ۱ شلنگ ۶ پنس سے ۱ شلنگ ۴ پنس کر دی جائے۔ مگر یہ ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی پالسی ہمیشہ سے لنکا شائر کے مفاد کے زیر اثر رہی اور یہ شرح تبادلہ کا معمہ ہمیشہ سے گول مال رہا، جس کے لئے حکومت ہند ذمہ وار ہے۔ اثرات مابعد جنگ اقتصادی طور پر سلطنت برطانیہ کے لئے پریشان کُن ثابت ہوئے۔ ہندوستان نے رفاقت کا دم بھرا مگر جب وقت آیا کہ ہندوستان اپنا قرضہ وصول کرے تو شرح تبادلہ ۱ شلنگ ۴ پنس کر دی گئی، اِس طرح قریب قریب نصف قرضہ یوں ہی صاف ہوگیا۔ مدبران ہند نے شور و غل مچایا مگر اُن کا یہ ہنگامہ صدا بہ صحرا ثابت ہوا، شرح تبادلہ کی بابت بمبئی کے وزیر مالیات ساتوں کانگریسی صوبجات کی حکومتوں و نیز چار غیر کانگریسی صوبجات کی حکومتوں کو شریک کر کے حکومت ہند سے اِس امر کی نمایندگی کیلئے تیاری کر رہے ہیں کہ وہ شرح تبادلہ ۱ شلنگ ۶ پنس سے ۱ شلنگ ۴ پنس کر دے۔ اُدھر حکومت ہند بھی تُلی ہے کہ وہ موجودہ شرح تبادلہ برقرار رکھے۔ اپنے ایک مراسلہ میں اُس نے اسی بات پر زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس کے پاس ۱۶۰ کروڑ اسٹرلنگ کی استطاعت شرح موجودہ کے برقرار رکھنے کیلئے ہے۔ ہندوستان کے اقتصادی معاملات میں شرح تبادلہ کا معاملہ نصف صدی سے سخت پریشان کن رہا ہے اور جس طرح شرح تبادلہ گھٹائی بڑھائی گئی ہے اُسکا نتیجہ ہندوستان کی تباہی و بربادی ہوا ہے۔ اگر اب بھی حکومت ہند نے اِس سلسلہ میں صوبجات کے مطالبہ کو قبول نہ کیا تو اہلِ ہند کی عین بدقسمتی ہے۔

دوسرا اہم معمہ جو ملک کیلئے پریشان کُن ثابت ہو رہا ہے وہ ہندوستان اور برطانیہ کی تجارت کا ہے۔ ہندوستان کی بدقسمتی کا رونا کہاں تک رویا جائے۔ چند سال پیشتر اِس سلسلہ میں جس معاہدہ اٹاوہ کا عملدرآمد حکومت ہند نے کرایا تھا وہ ہندوستان کے مفاد کے سراسر خلاف تھا۔ ملک میں اُس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔

اب دو سال سے اِس بات کی کوشش ہورہی ہے کہ دوسرا معاہدہ کیا جائے۔ چنانچہ حال ہی میں شملہ میں لنکاشائر کے نمایندگان اور ہندوستان کی ٹکسٹائل ملوں کے نمایندگان کے مابین گفت وشنید ہوئی مگر لنکاشائر کے نمایندوں نے جو مطالبات پیش کئے وہ سراسر ناواجب تھے۔ انھیں فکر ہی کیوں ہوتی کہ نیا سمجھوتہ ہوجائے۔ کیونکہ معاہدہ ۱۹۳۵ء جس کا عملدرآمد جاری ہے اُن کے عین موافق ہے۔ حکومت ہند کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ واضح طور پر کہہ دیتی معاہدہ ۱۹۳۵ء جلد از جلد منسوخ کردیا جائے گا۔

ہندوستان کے ساختہ کپڑے پر ساڑھے سات فیصدی کا بار اس محصول سے پڑجاتا ہے جو کہ روئی، مل اسٹور مشینری، مصالحہ، رنگ ریزی وغیرہ پر ادا کرنا پڑتا ہے۔ مزید برآں اِسوقت مزدوروں کے حق میں جس پالسی کا عملدرآمد کانگریسی حکومتیں کررہی ہیں وہ بھی کپڑے کی قیمت پر گراں بار ہورہی ہے۔

اب تک ہندوستان ۲۶ کروڑ ۶۰ لاکھ گز کپڑا برطانیہ سے خرید کرتا ہے۔ ہندوستانی ملوں کے نمایندے سر پرشوتم داس ٹھاکرداس نے یہاں تک رضامندی ظاہر کی کہ ہندوستان ۴۰ کروڑ گز کپڑا برطانیہ سے لیگا، نیز اسمیں پچاس فیصدی کا اضافہ کردیگا۔ بشرطیکہ متناسب اضافہ برطانیہ ہندوستان کی روئی کی خریداری میں کرے اِسوقت برطانیہ ۶۵۰۰۰۰ (650000) گانٹھیں روئی کی ہندوستان سے خرید کررہا ہے۔ سر موصوف نے اُسکے بالمقابل ۷۵۰۰۰۰ (750000) گانٹھوں کی خریداری کی تجویز کی تھی۔ لنکاشائر والے اِسوقت خواہ مخواہ بدنام کررہے ہیں کہ ہندوستانی غیر سرکاری نمایندوں کی طرف سے کوئی ٹھوس تجویز پیش نہیں کی گئی۔

لنکاشائر والوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان کم سے کم ۳۳ کروڑ ۳۰ لاکھ گز کپڑا برطانیہ سے خرید کرے لیکن اُنھوں نے کپڑے کی زیادہ سے زیادہ تعداد جو برطانیہ کو ہندوستان میں داخل کرنے کا حق ہونا چاہئے تعداد متذکرہ بالا سے دوچند رکھی یعنی ۶۶ کروڑ ۶۰ لاکھ گز کپڑا، اور یہ تجویز کیا کہ موجودہ شرح محصول جو بیس فیصدی ہے گھٹا کر ۱۲ فیصدی کردی جائے۔ اِدھر تو یہ زور اُدھر ہندوستان کی روئی کی خریداری کے بارے میں موجودہ تعداد ۶۵۰۰۰۰ (650000) گانٹھوں سے گھٹ کر ۴۰۰۰۰۰ (400000) گانٹھوں کی خریداری تجویز کی اور بقیہ کے لئے یہ کہہ دیا کہ برطانیہ اپنی کوشش زیادہ خریداری کے لئے کم نہ کریگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ناممکن القبول تجاویز ہندوستان کے غیر سرکاری نمایندے کیونکر قبول کرسکتے تھے۔

سر محمد ظفر اللہ انگلستان گئے ہوئے ہیں اور وہاں دفتر نوآبادیات اور برٹش بورڈ آف ٹریڈ سے اِس معاملہ میں گفت وشنید کررہے ہیں۔ نئے معاہدہ کا وہاں جو خاکہ تیار ہوا ہے وہ سر موصوف ہندوستان ماہ اگست کے پہلے ہفتہ میں لے آویں گے اور ایک جلسہ بنا بر مشورہ ہندوستان کے غیر سرکاری نمایندگان کا کریں گے دیکھیں نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

لُطفِ سُخن

"پچھلے دنوں غازی آباد ضلع میرٹھ میں ایک شاندار بزم مشاعرہ منعقد ہوئی تھی جس کے انتخاب کیلئے ہم محمد اظہار الحسن صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل کے ممنون ہیں۔ بوجہ قلت گنجائش ہمیں اس انتخاب میں مزید کانٹ چھانٹ کرنی پڑی جس کیلئے ہم مجبور ہیں۔ بایں ہمہ کلام کے انتخاب میں کلام کی خوبیوں کا ضرور خیال رکھا گیا ہے۔"

ارشد حسن صاحب ارشد کاکوروی

بھلاؤں لاکھ میں آتا ہے لیکن یاد رہ رہ کر — وہ آنا موسم گل کا وہ جانا میرا گلشن سے
نشاط و عیش حاصل تھا چمن کے رہنے والے تھے — یہ کیا معلوم تھا نسبت قفس کو بھی ہے گلشن سے
عذابِ جاں قفس کی تنگیاں پھر اُس پہ یہ طرّہ — ہواؤں پر ہوائیں آرہی ہیں صحنِ گلشن سے
یہی تو حاصلِ ہستی ہے تم پر مٹنے والے کا — جدا کیوں خاک دامنگیر کو کرتے ہو دامن سے
وہی ارشد تمہارا ہوں جسے کاندھوں پہ لائے تھے — گذرنے والو بچ کر نہ نکلو میرے مدفن سے

گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی

چمن کی آنکھ کا تارا، نہ زیبِ طرّۂ خوباں — میں وہ گل ہوں جو گر جائے کسی گلچیں کے دامن سے
یہیں تو خانۂ صیاد بھی اک دو قدم پر ہے — یہ کیسی برق کو ضد ہے مری شاخِ نشیمن سے

اصغر صاحب مظفر نگری

چمن چھوٹا، کٹے پر، اور یہ کنجِ قفس دیکھا — قیامت ہو گیا میرے لئے اُڑنا نشیمن سے

عبدالرحمٰن صاحب برقؔ غازی آباد

لگے ہیں دل میں پنکھے شمع ہستی جھلملاتی ہے — ہوا کرتی ہوئی بادِ فنا آتی ہے دامن سے

سدانند سکسینہ صاحب جلالؔ ایم۔اے

رفیقِ زندگی غم ہے کہ افزوں اس کو پاتا ہوں — بڑھاپے میں جوانی سے جوانی میں لڑکپن سے

سید عبدالوحید صاحب چمنؔ ہاپوڑی

صبا دو چار تنکے ہی اُڑا لا صحن گلشن سے — قفس میں ہم بہت بے چین ہیں یادِ نشیمن سے

سلطان محمد خاں صاحب زارؔ غازی آباد

وہ صحرا ہو کہ گلشن انس ہو جاتا ہے مسکن سے — قفس سے اب وہ الفت ہے جو پہلے تھی نشیمن سے

عدم آباد کی دشواریِ منزل معاذ اللہ ۔۔۔ یہ رستہ وہ ہے جسکی ابتدا ہوتی ہے مدفن سے

امرناتھ صاحب مدن ساحر دہلوی

نمایاں ہے کسی کی خود نمائیٔ طورِ وایمن سے ۔۔۔ نہاں ہے حسن چلمن میں عیاں ہے جلوہ چلمن سے
میں لامذہب ہوں، کفرِ عشق کا دلدادہ ہوں ساحر ۔۔۔ مرا مشرب جُدا ہے مذہبِ شیخ و برہمن سے

محمد سلیم صاحب سلیم ہاپوڑی

کرم اور گلفشانی کا کرم اک مرنے والے پر ۔۔۔ مرے مدفن کو شرمندہ نہ کیجیے اپنے دامن سے
کہاں دیدار اُن کا اور کہاں بے ہوشیِ موسیٰؑ ۔۔۔ نکل آئی تھی روپیں اک تجلی چشمِ ایمن سے

اللہ دیا صاحب شمس ہاپوڑی

نصیبِ دشمناں داغِ محبت میں خلش کیسی ۔۔۔ یہ کانٹے دُور رہتے ہیں مرے پھولوں کے دامن سے
نگاہِ شوق کو حسنِ نہاں اِتنا بتا دینا ۔۔۔ وہ کیا شے ہے جو چھن چھن کر نکل جاتی ہے چلمن سے

ظہیر حسین صاحب رضوی ایم اے۔ ایل ایل بی

اِدھر عرضِ تمنا اک نگاہ آرزو فن سے ۔۔۔ اُبھر آنا اُدھر کچھ حسن کی موجوں کا چتون سے
وہ رنگین داستانِ دل جو اشکوں نے رقم کی تھی ۔۔۔ بہارِ گلستاں بن بن کے پھیلی میرے دامن سے
بساطِ غم تو کیا سارا نظامِ دل پلٹ جاتا ۔۔۔ یہ دو آنسو اگر تم پونچھ دیتے اپنے دامن سے
مری ہر خامشی پیغامِ حسرت کی وہ صورت ہے ۔۔۔ جو مرکر بھی نہ ممکن ہو سکیگی میرے دشمن سے

سید سبط احمد صاحب غافل امروہوی

بتا دیتی ہیں نکتہ چینیاں راہیں ترقی کی ۔۔۔ کمالِ فن کیا کرتا ہوں حاصل اپنے دشمن سے

احمد خاں صاحب کیفی بی۔ اے، ایل ایل بی سپرنٹنڈنٹ کلکٹری کاسگنج

شکایت باغباں کی ہے نہ شکوہ برق گلشن سے ۔۔۔ نشیمن جل اُٹھا خود شعلۂ حسنِ نشیمن سے
کسی نے اُن کے دیوانے کی یوں تصویر کھینچی ہے ۔۔۔ گریباں جل رہا ہے اور ہوا دیتا ہے دامن سے

مظہر علی صاحب مظہر غازی آباد

طریقِ عشق میں جائز نہیں ہے کینہ دشمن سے ۔۔۔ مرا مذہب الگ ہے مذہبِ شیخ و برہمن سے
قفس ہی سے بس اے ہمدم مجھے مانوس رہنے دے ۔۔۔ کہ دل پر چوٹ سی لگتی ہے رودادِ نشیمن سے

سید منظور حسن صاحب منظر ہاپوڑی

ترے جلووں کو تو پردہ میں چھپنا بھی نہیں آتا ۔۔۔ نکلتی ہیں شعاعیں حسن کی چھن چھن کے چلمن سے

مباحثہ

اُردو ۔ ہندی ۔ ہندستانی

اِس عنوان سے زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۱ء میں جو مضمون مکرمی جگر بریلوی کا شائع ہوا ہے۔ اُس کے متعلق مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی بی۔ اے نے ایک طولانی مراسلہ لکھا ہے۔ جسمیں آپ لکھتے ہیں کہ:-

"مضمون نگار کی نفس شکایت بیجا نہیں۔ ہندوؤں کی حق تلفی اُردو کے باب میں ہوئی ضرور، لیکن یہ کہنا بھی زیادتی ہے کہ:-

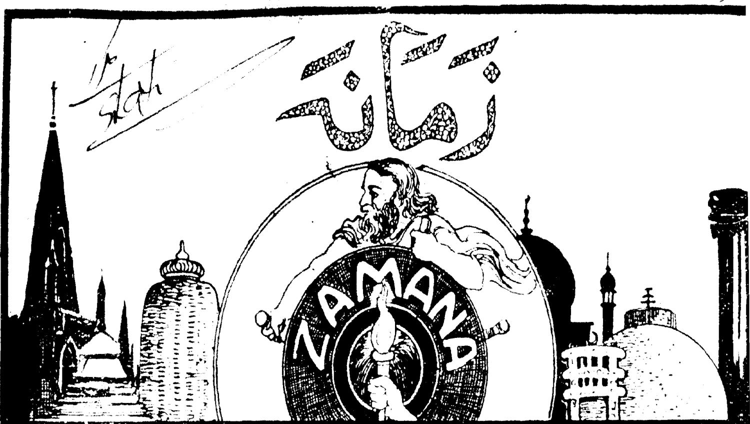
"اِدھر ہندوؤں کی تصانیف کو دائرہ ادب سے خارج کر دیا گیا، اُدھر تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں سے ہندو مصنفوں کو نظرانداز کر دیا۔"

پنڈت دیا شنکر نسیم۔ بابو جوالا پرشاد برق۔ پنڈت برج نراین چکبست۔ منشی نوبت رائے نظر۔ منشی دیا نراین نگم۔ منشی دھنپت رائے "پریم چند"۔ پنڈت برجموہن ناتھ کیفی۔ پنڈت منوہر لال زتشی۔ منشی جگت موہن لال رواں۔ پنڈت انند رائے ملا۔ سدرشن وغیرہ بیسیوں ہندو اہلِ قلم کے کارناموں کو کون بھلا سکتا، نظرانداز کر سکتا ہے؟ اُردو مصنفین اور شاعروں کا جب کبھی کوئی مسلمان مفصل تذکرہ لکھیگا، تو ان سب کے لئے بہرحال مناسب جگہ نکالنی پڑیگی۔ میں نے آج سے ۱۹-۲۰ سال قبل (غالباً ۱۹۱۱ء میں) پنڈت کشن پرشاد کول صاحب کے رسالہ "صبح اُمید" میں ایک مضمون "ہندو مصنفینِ اُردو" کے عنوان سے لکھا تھا۔ جو اگرچہ سرسری تھا، تاہم اُسمیں نہ صرف شعراء ادب بلکہ ہر علم و فن سے متعلق ہندو مصنفینِ اُردو کے حوالہ درج تھے۔ افسوس ہے کہ وہ پرچہ اِسوقت پیش نظر نہیں۔

شاعروں کے جو تذکرے مسلمان اہلِ قلم کے قلم سے ہیں۔ اُنمیں بھی عموماً ہندوؤں کو "نظرانداز" نہیں کیا گیا ہے، میر حسن (صاحب مثنوی "بدر منیر") کے تذکرے میں کم از کم ۱۹ ہندو شاعروں کا ذکر تو ضرور موجود ہے۔ ٹیک چند بہار، بندرابن راقم، انندرام مخلص وغیرہ۔ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" اگرچہ بہت مختصر ہے، تاہم چار عنوان تو ہندو شاعروں کے اس میں بھی موجود ہیں۔ اور رائے سرب سنگھ دیوانہ کا ذکر، میرزا علی لطف کے تذکرہ "گلشن ہند" میں بھی موجود ہے۔ شیفتہ کے تذکرہ گلشن بیخار سے متعلق بھی یہ بیان صحیح نہیں کہ اُس میں صرف ۲۵، ۳۰ ہندو شاعروں کا ذکر ہے، کم از کم ۲۷ کا تو ضرور ہے۔ نساخ کے تذکرہ "سخن شعراء" میں، ناموں کے گننے کا تو وقت میسر نہیں۔ لیکن برائے نام اُلٹ پلٹ میں بھی، متعدد صفحوں پر ہندو شاعروں کے نام نظر پڑ گئے، مثلاً ص۱۱۵ پر جوہر تخلص کے ۳ ہندو شاعر، ص۳۵۰ پر غبار، ص۳۵۱ پر غلام، ص۳۵۲ پر غم، ص۴۵۲ پر ملک، ص۴۵۳ پر مقبول ص۴۵۲ پر مفتون تخلص کے دو ہندو شاعر۔ تلاش سے یقیناً اس میں ایک بڑی تعداد مل جائے گی۔

صاحبِ "آبِ حیات" نے اگر ہندو شاعروں کو چھوڑ دیا ہے، تو اُس کی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے جو معیار (صحیح یا غلط، یہ ایک الگ سوال ہے) اپنے سامنے رکھا تھا۔ اُس پر مسلمان شاعر ہی کون بہت سے اُترے ہیں؟ بس جو اُن کے معیار پر نہ اُترا، وہ خارج کر دیا گیا۔ اس کو شاعر کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

آخر میں مضمون نگار نے جو علاج تجویز کیا ہے، وہ مرض کو دُور کرنیوالا نہیں، بلکہ اور پیچیدگیاں بڑھانیوالا ہے۔ اس پر تفصیل سے لکھنے کے لئے فرصت کی ضرورت ہے۔ یہ چند سطریں تو محض قلم برداشتہ لکھ دی گئیں۔



اگست سنہ ۱۹۳۶ء | مرتبہ: دیانراین نگم بی۔ اے۔ | جلد ۷۱ نمبر ۲

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ | دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا | فی پرچہ سات آنہ



زمانہ

جلد ۷۱   اگست ۱۹۳۸ء   نمبر ۲

تھانیسر کی لڑائی اور اُس کے اثرات[1]

(از ایڈیٹر)

دنیا میں ہمیشہ سے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن بعض ایسی اہم اور زبردست لڑائیاں ہوئی ہیں جن کی بدولت ملکوں اور قوموں کی قسمت ہی پلٹ گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اسی قسم کی لڑائی بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں تھانیسر میں ہوئی تھی جس نے اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت کا چراغ سدا کے لئے گل کر دیا۔ اور مسلمانوں کے قدم صدیوں کے لئے یہاں مضبوطی سے جما دیئے۔ یوں تو ہندوستان کی دولت اور جہاد کے شوق نے ساتویں صدی کے وسط ہی سے مسلمانوں کو ہندوستان میں دعوتِ عمل دے رکھی تھی۔ اور ایران کی فتح نے اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لئے راستہ بھی کھول دیا تھا۔ لیکن تھانیسر کی لڑائی کے پہلے صرف دو ہی واقعات ایسے قابل ذکر ہوئے جن کا اثر اس ملک کے تاریخ پر پڑا۔ ان میں پہلا محمد بن قاسم کا حملہ ہے جس نے ۷۱۲ء میں سندھ پر قبضہ کر کے ہندوستان میں پہلی مسلمان حکومت قائم کی۔ لیکن اس حملہ کا اثر فقط سندھ تک محدود رہا اور ہندوستان خاص پر کچھ اثر محسوس نہ ہوا۔ دوسرا واقعہ محمود غزنوی کے پے در پے حملوں کا ہے۔ مگر یہ بھی باد مخالف کے تیز و تند جھونکوں کی طرح آئے اور نکل گئے اور ان کا اثر صرف پنجاب تک محدود رہا۔ چنانچہ محمود کی وفات کے بعد چند ہی سال بعد ہندوؤں نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا اور دلی میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی۔ مگر محمود غزنوی نے درۂ خیبر کا راستہ از سر نو کھول کر آئندہ مسلمان حملہ آوروں کے لئے اس ملک میں داخل

---

[1] یہ مضمون لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ کیا گیا تھا اور ڈائرکٹر صاحب اسٹیشن مذکور کی اجازت سے زمانہ میں شائع ہو رہا ہے۔ جس کے لئے ہم صاحب موصوف کے شکر گذار ہیں۔

ہونے کی یقینی راہ دکھادی دراصل یہی ہندوستان کا پہلا پھاٹک ہے۔
محمد بن قاسم غلط راستے سے ہندوستان آیا اور سندھ اور راجپوتانہ کے ریگستانوں نے اُسے ہندوستان خاص تک پہونچنے نہ دیا۔ محمود غزنوی درۂ خیبر سے آیا جس کی بدولت آسانی سے پنجاب میں داخل ہوکر سرہند تک پہونچ گیا۔ جو ہندوستان کے اندرونی قلعہ کا اصلی پھاٹک ہے۔ ہندوستان کی تمام فیصلہ کن اور تاریخی لڑائیاں اسی سرزمین میں ہوئی ہیں۔ دہلی کی تاریخی اہمیت کی بھی یہی وجہ ہے۔ جس کے بدولت اکثر سلطنتوں نے اُسے اپنا پایہ تخت بنایا۔
تھانیسر اسی علاقہ کا ایک تاریخی مقام ہے جو راجہ ہرش کے باپ راجہ پربھاکر وردھن کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ ہرش کے لاولد وجوانمرگ بہنوئی کے بعد جب اس کی بہن شوہر کے غم میں اپنا راج پاٹ چھوڑ کر بودھ مت کی بھکشنی ہوگئی، اور قنوج کی رعایا نے ہرش کو اپنا راجہ انتخاب کیا تو اس نے بھی تھانیسر چھوڑکر قنوج کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا۔ مگر تھانیسر کی جغرافیائی اہمیت اپنی جگہ پر قائم رہی اور آگے چلکر اُس نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ ہمیشہ کے لئے پلٹ دیا۔
تھانیسر کی لڑائی ۱۱۹۱ء میں محمد غوری اور پرتھی راج کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد ملک میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم ہوگئی اور وہ مستقل طور پر ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ اس لڑائی کے بعد پھر ہندوؤں کو ہندوستان میں حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔
دکن میں وجے نگر کی سلطنت ایک بجھنے والے شعلہ کی آخری بھڑک تھی اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں کا عروج بھی محض چند روزہ تھا۔ جسے ایک طرف احمد شاہ ابدالی نے اور دوسری طرف انگریزوں نے کچل دیا۔ سیاسی حیثیت سے قطع نظر تھانیسر کی لڑائی کا ملک کے مذہب۔ معاشرت اور کلچر پر دائمی اثر پڑا۔ اور اسکا پولیٹیکل اثر لگ بھگ سات صدی تک باقی رہا۔
اُس وقت ہندوستان میں کئی طاقتور راجپوت خاندانوں کی حکومت قائم تھی، جن میں قنوج کے راٹھور اور دہلی کے چوہان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چوہان دہلی اور اجمیر کے حکمران تھے۔ راٹھوڑ کی حکومت قنوج کے گرد و نواح میں تھی۔ مگر چوہانوں کا عروج سب سے بڑھا ہوا تھا اور پرتھی راج کی بہادری کا سکہ ہندوستان بھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھانیسر کے متصل ہی ترائن کی پہلی لڑائی میں پرتھی راج محمد غوری کو شکست فاش دے چکا تھا۔ جس سے اس کا رتبہ تمام ہندو راجوں میں اونچا ہوگیا تھا۔ لیکن غوری کے دل میں شکست کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔ اور ۱۱۹۲ء میں وہ اسی میدان میں

ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ جس میں ترک افغان اور دیگر دلاور جنگجو شامل تھے، اپنی شکست کا بدلہ لینے آیا۔ اُس وقت پنجاب میں ترکوں کی حکومت قائم تھی اور لاہور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اس لئے عرب راجپوتوں پر تھانیسر ہی کے میدان میں حملہ کرسکتے تھے۔ پرتھی راج متعدد راجاؤں اور بیشمار بہادروں کے ہمراہ تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی لیکر ترائن کے میدان میں تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر مقابلہ کے لئے آ ڈٹا۔ مگر اس بار راجپوتوں کی بہادری کام نہ آئی اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی۔ راجپوت بہادری اور جاں بازی میں کسی سے کم نہ تھے، مگر اُنھوں نے پچھلے تجربہ سے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا، اور وہ تمام غلطیاں دُہرائیں جن کی وجہ سے وہ پہلے بھی مسلمان حملہ آوروں کے مقابلہ میں ہار چکے تھے۔ ان دنوں فریقین کا دارومدار سواروں پر تھا، لیکن ہندو سرداروں کو یہ گر معلوم نہ تھا کہ تیزی سے نقل وحرکت کرنے والے سواروں کے پے در پے حملے ایک جگہ پر کھڑی ہوئی کثیر فوج کو پراگندہ کرسکتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتے پر جب ہندو سواروں نے مسلمان سواروں کے پہلے حملے کو کامیابی سے روک لیا تو محمد غوری یہ ترکیب چلا کہ اُس نے اپنی فوج کے درمیانی حصّے کو چھوڑکر بقیہ فوج کے چار حصّے کرکے چاروں طرف سے راجپوتوں پر حملہ کرنے کی ہدایت کی۔ یہ سوار راجپوتوں پر حملہ کرکے فوراً پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اس طرح تمام دن میدان کارزار گرم رہا۔ آخرکار جب راجپوت لڑتے لڑتے تھک گئے تو خود محمد غوری بارہ ہزار چیدہ اور تازہ دم سواروں و تیراندازوں کو ساتھ لے کر اُن پر ٹوٹ پڑا۔ راجپوت دل کھول کر لڑے مگر وہ تھکے ہوئے تھے آخر اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ پرتھی راج میدان سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن قلعہ سرستی کے قریب گرفتار ہوکر قتل کردیا گیا۔

یہ خیال صحیح ہے کہ اگر جے چند والیِ قنوج اس لڑائی میں پرتھی راج کا ساتھ دیتا جو اس وقت صرف اپنی ہی نہیں بلکہ تمام راجپوتوں کی طرف سے لڑ رہا تھا تو راجپوتوں کو یہ روز بد دکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہ بات جے چند کے ماتھے پر ہمیشہ کے لئے کلنک کا ٹیکہ بنی رہیگی کہ اُس نے ذاتی عداوت یا پولیٹیکل رقابت سے متاثر ہوکر اس کڑی مصیبت کے وقت اپنے ملکی یا قومی آن کا کوئی خیال نہ کیا اور گو اُس کی سلطنت پرتھی راج کی حکومت سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقتور تھی لیکن اُس نے ملک کی حفاظت کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اگر وہ پوری قوت سے پرتھی راج کا ساتھ دیتا تو ترک اس قدر آسانی کے ساتھ ہندوستان پر قبضہ نہ کرسکتے۔ مگر شدنی اٹل ہے۔ شروع سے لیکر اب تک ہندوستان اپنی پھوٹ ہی کی وجہ سے برباد ہوتا چلا آیا ہے۔ جے چند بھی اس قومی غدّاری کے بعد بہت دنوں تک چین سے نہ بیٹھنے پایا پرتھی راج کی شکست کے دو ہی سال بعد اُس کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد راجپوت وقتاً فوقتاً

سن آسانی سے۔

مسلمانوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن دہلی اور قنوج کی ریاستوں کے مٹ جانے کے بعد ہندوستان میں ترکوں کے سیلاب کو روکنے والی کوئی طاقت باقی نہ رہی۔ ہانسی اور اجمیر کی ریاستیں بھی آسانی سے فتح ہوگئیں، اور سلطان محمد غوری قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا نائب مقرر کرکے غزنی واپس چلا گیا۔

یہاں پر اُس زمانہ کے سماجک حالات کا مختصر بیان بیجا نہ ہوگا۔ ذات پات کی بندشوں نے اُس وقت کے ہندوؤں کو پوری مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ برہمن سب سے اونچے مانے جاتے تھے، حتیٰ کہ وہ موت کی سزا سے بھی مستثنیٰ تھے۔ راجپوتوں کا درجہ بھی چنداں کم نہ تھا، اُن کی بہادری بے نظیر تھی، اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر جان بچانے سے وہیں جان دیدینا کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن مصائب و حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا اُن میں مادّہ نہ تھا۔ ذاتی شان اور خاندانی آن کے لئے وہ ہر وقت مر مٹنے کو تیار رہتے تھے لیکن مجموعی حیثیت سے دیس یا دھرم کی حفاظت و ترقی کا انھیں چنداں خیال نہ تھا۔ اور جتنا اُنھیں اپنی بات کا لحاظ اور اپنی عزت کا پاس تھا، اُس کا آٹھواں دسواں حصّہ بھی ملک کی شان یا قوم کی حفاظت کا لحاظ نہ تھا۔ عورتوں کی حالت محکومیت کی تھی۔ بیواؤں کو دوبارہ شادی کا اختیار نہ تھا، ستی اور جوہر کا عام رواج تھا۔ دختر کشی بھی عیب نہ تھی کم سنی میں شادی کردی جاتی تھی۔

ملک کی مالی حالت اچھی اور تجارت ترقی پر تھی۔ علم و ادب کا عام چرچا تھا اور راجپوت راجوں رئیسوں کو اس سے بڑی دلچسپی تھی، اور وہ پنڈتوں اور ودوانوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کئی حکمران خود بھی شاعر و مصنف تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ملک میں کوئی نظام یا سنگھٹن نہ تھا اور نہ عوام کی منتشر طاقتوں کے شیرازہ بندی کی کوئی صورت تھی۔ باہمی رقابتوں اور روزمرہ خانہ جنگیوں نے ملک کو کمزور کردیا تھا۔

تھانیسر کی لڑائی کے پہلے ہی سے بودھ مت کی جگہ شیومت اور وشنو دھرم نے لے لی تھی جس کو بھگتی کی مذہبی تحریک سے بڑی تقویت پہونچ چکی تھی۔ ملک میں ہزاروں مندر اور شوالے بن گئے تھے۔ مسلمانوں کی فتوحات نے اس سوشل نظام کو تہ و بالا کردیا اور ہندو مذہب۔ ہندو لٹریچر اور ہندو کلچر سب کو ان سے بڑا دھکّا پہونچا۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے مندر توڑ کر مسجدیں بنا دی گئیں اور بیشمار ہندو مسلمان ہوگئے۔ لیکن یہ سب تبدیلیاں سطحی تھیں۔ ملک کے نظم و نسق کے لئے مسلمان حکمرانوں کو ہندو ملازموں ہی کو رکھنا پڑتا تھا۔ اس لئے سلطنت میں انقلاب

ہوجانے کے باوجود مال گذاری کی تحصیل وصول اور عدالتوں کا کام تعمیرات اور دیگر سول محکمے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ مسلمان بادشاہوں نے جو عمارتیں بنوائیں اُن میں ہندو کاریگر ہی کام کرتے تھے، ہندو سُنار اُن کے سکّے ڈھالتے اور ہندو پنڈت دھرم شاستر کے متعلق انھیں مشورے دیتے تھے۔

تھانیسر کی لڑائی کے بعد مسلمان ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہو گئے جس کا ملک کی تاریخ پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ظاہر ہے کہ ایک جگہ سکونت رکھنے کے بعد ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے سے کیسے بے اثر رہ سکتے تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا یہ اثر ہوا کہ دونوں نے ایسا طریق زندگی اختیار کرلیا جو نہ خالص ہندو تھا اور نہ خالص مسلم۔ بلکہ جو دونوں کا مشترکہ اور مجموعی کلچر تھا جسے ہم "ہندو مسلم کلچر" کے نام سے یاد کرسکتے ہیں اور جس میں ہندو مسلمان دونوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

اس نئے طرز معاشرت میں ہندو مذہب۔ ہندو آرٹ ہندو لٹریچر اور سائنس نے مسلم عناصر کو کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کرلیا کہ خود ہندو کلچر کی ماہیت تبدیل ہوگئی۔ اسی طرح ہندو مسلم تصادم سے مسلم کلچر، مسلم آرٹ اور خود اسلام نے ہندوستان میں ایک نئی شکل اختیار کرلی۔

ہندو مذہب پر اسلام کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ عوام کے عقائد میں توحید کا خیال جو عرصہ سے سُست پڑ گیا تھا پھر زیادہ زور کے ساتھ جاگزیں ہوگیا۔ پُرانک ہندوؤں میں بہت سے دیوی دیوتا پوجے جاتے تھے، اور گو شروع ہی سے ہندو مذہب میں ایک قادر مطلق پرمیشور کا خیال موجود ہے لیکن دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے توحید کو کمزور کرکے اُسے بالکل پس پُشت ڈال دیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان آکر خدا کی وحدانیت پر غیر معمولی زور دیا، جس کا عام خیالات پر بہت بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ تین چار صدی بعد کے ہندو ریفارمروں اور روحانی لیڈروں کی تعلیمات میں اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ان ریفارمروں نے بعض مذہبی عقائد عمداً ترک کردیئے اور اُن کی جگہ جن عقائد کا پرچار کیا اُن کی بدولت ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔ اس مذہبی اصلاح کی سب سے نمایاں مثال کبیر اور گورو نانک کی تعلیمات میں ملتی ہے اسی سلسلہ میں ریداس۔ دادو۔ ملوک داس۔ اور بہت سے دوسرے روحانی پیشواؤں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلم صوفیوں نے بھی جو محمد بن قاسم کے وقت سے سندھ آکر ہندوستان کے بہت سے مقامات میں پہونچ گئے تھے بعض ہندو عقائد قبول کرلئے۔

اس وقت کی تعمیرات میں بھی اس مشترکہ کلچر کا اثر بخوبی نمایاں ہے۔ اس زمانہ کی ہندو عمارتیں بھی خالص ہندو طرز

کی نہیں ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نئے اسٹائل نے جو نہ خالص ہندو ہے او نہ خالص مُسلم ۔ پُرانے طرز کی جگہ لے لی ہے ۔ اسی طرح مسلم تعمیرات میں صاف طور پر ہندو اثر نظر آرہا ہے یہ ضرور ہے کہ مسلم تعمیرات میں ایرانی اور عربی طرز تعمیرات کے چند پہلو اب بھی قائم رہے، لیکن جب یہ پہلو ہندو طرز تعمیر میں شامل ہو گئے تو ایک نیا اسٹائل پیدا ہوگیا جس میں ہندو تعمیر کا رنگ صاف طور پر جھلکتا ہے ۔ اس نئے اور متحدہ اسٹائل میں اگر ایک طرف مسلم طرز تعمیر کی سادگی باقی نہ رہی تو دوسری طرف ہندوؤں کے شوقِ آرائش و سجاوٹ میں بھی بہت کمی ہوگئی۔ ہندو صناعی کی عام وضع قطع (جنرل ڈیزائن) اس کی سجاوٹ اور پُرکاری تو قائم رہی لیکن اس پر مخروطی محراب اور سادہ گنبد اور ہموار دیواروں کے جو پیوند لگ گئے وہ مسلم فنِ تعمیر کے خاص جزو تھے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس زمانہ کی ہندو مسلم تعمیرات دراصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں جن میں چند ظاہری اختلافات کے باوجود معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے ۔

ہندو مسلم کلچر کا اثر تعمیرات سے کہیں زیادہ مصوری میں پایا جاتا ہے، چنانچہ مغل اور راجپوت مصوری ایک ہی آرٹ کے دو مختلف نمونے ہیں اور راجپوت مصوری اجنٹا کے فنِ تصویر سے بہت دُور مگر مغل مصوری کے بہت قریب ہے ۔ دراصل مغل اور راجپوت مصوری کا فرق محض سطحی ہے ۔ راجپوت آرٹ میں راگ راگنیوں اور نائکوں کی تصویروں میں جو عورتیں بنائی گئی ہیں وہ شکل وصورت سے تو راجپوت ہیں لیکن ان کا لباس اور ان کی نشست ایرانی ہے ۔ اس طرح نیا آرٹ خالص ہندو یا خالص مسلم آرٹ سے بالکل جداگانہ ہے، اور اس کو فقط "ہندو مسلم آرٹ" کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ نئے طرز میں اجنٹا کے آرٹ کے لوچ اور نرمی کے ساتھ ساتھ سمرقند اور ہرات کا تناسب اور وصل وفصلؔ بھی موجود ہے، اور انواع واقسام کے رنگوں کے حیرت انگیز شوخی اور اُن کی آمیزش نے باریک خطوط کے ساتھ مِلکر ایک نیا حُسن پیدا کردیا ہے ۔

نئے ہندو مسلم کلچر کا اثر دیسی لٹریچر اور دیسی زبانوں پر بھی پڑا۔ مسلم فتوحات کے بعد سنسکرت کا زمانہ تو بالکل ختم ہوگیا، اور اس کی جگہ اظہار خیال کے لئے ہندی ۔ مرہٹی ۔ بنگالی، گجراتی زبانیں وجود میں آئیں مسلمانوں نے بھی ترکی ۔ فارسی ترک کر کے دیسی زبان اختیار کی، اور اس طرح ایک نئی زبان یعنی اُردو یا ہندوستانی پیدا ہوئی۔ ہندی زبان پر بھی مسلم اثرات کے گہرے نقوش ہیں ۔ الفاظ ۔ گرامر ۔ تشبیہات اور طرز تحریر سب پر اس کا اثر نمایاں ہے ۔ یہی بات مرہٹی ۔ پنجابی اور سندھی وغیرہ زبانوں پر صادق آتی ہے ۔ امیر خسرو کی خالق باری اسی اثر کا خوشگوار نتیجہ ہے ۔ قطب الدین ایبک کا خطاب "لاکھ بخش" ان دونوں زبانوں کے میل جول کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

spacing ـ ornamental ـ

اہلِ عرب بہت دنوں پہلے ہندو علمِ حساب اور ہندو فنِ طب کے مرہونِ منت ہو چکے تھے لیکن عربوں نے یونان سے بھی اپنے علم میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس لئے وہ ان صیغوں میں ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ اُن کی نئی معلومات سے ہندوؤں کو بہت فائدہ پہونچا۔ ہندو ریاضی دانوں نے کئی اصطلاحات مسلمانوں سے مستعار لئے اور کئی عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ مثلاً علم ہیئت میں تاجک کا سنسکرت میں ترجمہ کیا گیا۔ دوا سازی کی کئی خاص ترکیبیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھیں۔ فن کاغذ سازی بھی مسلمانوں نے چین سے حاصل کر کے ہندوستان میں رائج کیا۔

ہندو موسیقی پر بھی اس اتحاد کا غیر معمولی اثر پڑا۔ مسلمانوں نے یہاں کی قدیم راگ راگنیاں تو قبول کر لیں لیکن آلات موسیقی میں بہت کچھ ردّ و بدل کیا جو آج تک رائج ہے۔ چنانچہ یہاں کے پکھاوج اور مردنگ کی جگہ طبلہ بن گیا اور بین کی جگہ ستار نے لے لی۔

لباس۔ رسمیات۔ آداب محفل۔ غذا۔ کھانا پکانا سب پر مسلمانی تہذیب و معاشرت کا گہرا اثر پڑا۔ موجودہ حلوائی کی دُکان تو شروع سے آخر تک مسلمانوں کی رہینِ منت ہے۔ خود حلوائی کا لفظ اور اکثر مروجہ مٹھائیاں گلاب جامن۔ بالوشاہی، امرتی وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کا تحفہ ہیں۔ روٹی بھی ترکی زبان کا لفظ ہے۔ چمچہ۔ توا وغیرہ معمولی الفاظ بھی مسلمانوں کی بدولت رائج ہوئے ہیں۔ چاچا۔ چاچی۔ دادا۔ دادی۔ جیجا۔ جیجی۔ سب غیر ملکی الفاظ ہیں جو اب ہماری روزمرہ زندگی کا ضروری جزو بن گئے ہیں۔ اماں کا لفظ بھی ہم کو ترکوں سے ملا ہے۔ ہمارا موجودہ درزی خانہ بھی مسلمانوں کا رہین منت ہے۔

غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ مسلم اثر سے خالی نہ رہا۔ اور ہندوؤں نے جن کی احتیاط اور الگ تھلگ رہنے کی عادت ضرب المثل ہے دانستہ یا نادانستہ مسلمانوں کی معاشرت اور زندگی کے طور طریقوں کو بالکل اپنا لیا مسلمان بھی ہندو تہذیب و ہندو تمدن سے شیر و شکر کی طرح گھل مل گئے۔ آجکل کے ناواقف مسلمان شاید یہ سنکر تعجب کریں کہ تھانیسر کے فاتح محمد غوری نے عرصہ تک پرتھی راج کے سکوں کا سانچہ قائم رکھا۔ اس کے سکّوں کی پشت پر لکشمی جی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ بلبن پہلا ترک حکمران تھا جس نے عربی طرز کے سکّے رائج کئے۔

ہندوستان کو مسلمانوں کی آمد سے ایک اور بہت بڑا فائدہ یہ پہونچا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں بدھ دھرم کے زوال کے بعد صدیوں تک اس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس تعلق کو از سر نو جاری کیا چنانچہ یورپ کی نئی ایجادات ترکوں ہی کے ذریعہ ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ بارود کو سب سے پہلے ہندوستان میں بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی میں داخل کیا۔ اس طرح تھانیسر کی لڑائی نے ہندوؤں کا راج ختم کرنے کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی جو آج تک ہماری زندگی پر حاوی ہے اور آئندہ بھی عرصہ تک رہیگی

فطرتِ زر

(از حضرت احسان دانش کاندھلوی)

اِک دن کہ دوپہر کی جوانی تھی کامیاب / آتش فشانیوں میں تھا مصروف آفتاب
تھی بام و در پہ روحِ جہنم فسانہ خواں / جھنجھلائی سی زمین، بھڑکتا سا آسماں
طیّارہ دھوپ میں جو اُٹھے گل کے گر پڑے / طائر اُڑے فضا میں تو پَر جل کے گر پڑے

ایسے میں اک مریضِ ادب خستہ و زبوں
لیکر عقیدتوں کا اُبھارا ہوا جنوں

ہر سانس میں خلوص کی خوشبو لئے ہوئے / دل میں خیال خدمتِ اُردو لئے ہوئے
سودا رسوخ کا، نہ جنونِ مصاحبت / سرسام منّتوں کا، نہ خبطِ ملازمت
خواہش نہ قرض کی نہ سفارش کی آرزو / شہرت کی اور نہ دادِ نگارش کی آرزو

ملنے کو اِک محافظِ اُردو کے گھر گیا
روکا ہزار ذوقِ خودی نے مگر گیا

نیکی کا جس کی سارے زمانے میں شور ہے / اس میں بھی زور اُس کے قلم میں بھی زور ہے
ہے جس کے رنگِ رخ کا زر و سیم پر مدار / قرنوں سے کامگار ہے پشتوں سے مالدار

لیکن بغیر پوچھے کے آنے کا کیا سبب؟
اِس دھوپ میں عذاب اُٹھانے کا سبب؟

باصد غرورِ جاہ و باندازِ پیچ و تاب / دولت کی بیخودی نے یہ پڑھکر دیا جواب

آرام کا یہ وقت ہے اس وقت جائیے
گر ہو سکے تو شام کو تشریف لائیے

ارماں بھری نگاہ کو چکّر سا آگیا / دنیائے آرزو پہ اندھیرا سا چھا گیا
رنگیں بیانیوں کے قدم رُک کے رہ گئے / خودداریوں کے سرِ علم جھک کے رہ گئے

ثابت ہوا کہ فطرتِ زر میں غرور ہے
شہرت کا طمطراق حقیقت سے دور ہے

ہماری زبان

(از حضرت سہیل عظیم آبادی)

رکھیو غالب مجھے اِس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ملک میں جو بہت سے فرقہ وار مسئلے پیدا ہوکر آزادی کی راہ میں پہاڑ بنے کھڑے ہیں، اُن میں ایک بہت اہم مسئلہ زبان کا بھی ہے۔ اس مسئلہ نے شمالی ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں وہ کشیدگی پیدا کردی ہے جو بظاہر مٹتی نظر نہیں آتی۔ حالانکہ یہ مسئلہ محض عارضی ہے، ہماری غلامی اور غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، جس دن ہندوستان سیاسی آزادی کے ساتھ فکر کی آزادی بھی حاصل کرے گا، یہ مسئلہ اتنا حقیر ثابت ہوگا کہ کوئی شخص بھی اس میں اُلجھ کر اپنا وقت خراب کرنا پسند نہ کرے گا۔

ہندو کہتے ہیں: ہندوستان کی قومی زبان صرف ہندی ہوسکتی ہے، اور رسم خط صرف دیوناگری ہوسکتا ہے، کیونکہ ہندی پراکرت سے اور دیوناگری برہمی رسم خط سے ماخوذ ہے جس سے دوسرے صوبہ کی زبانیں اور رسم خط ماخوذ ہیں۔ اس لئے ہندی زبان اور دیوناگری رسم خط کو اختیار کرلینے کے بعد دوسری زبانیں ملک کی قومی زبان سے بہت ہی قریب ہوجائیں گی۔ ہندوؤں کا یہ دعویٰ بظاہر ایک علمی نظریہ ہے لیکن ہندی کے سرپرستوں کی کارروائیاں اُن کے زہریلے ارادے کو منکشف کرتی ہیں۔

مسلمان کہتے ہیں: کہ اُردو ہندی سے زیادہ مکمل اور خوبصورت زبان ہے، اس لئے اب اُردو کو ترک کرکے ہندی کو اختیار کرنا غلطی ہے۔ حالانکہ مسلمان اُردو زبان اور رسم خط کو صرف اس لئے ترک کرنا نہیں چاہتے کہ اس زبان اور رسم خط میں اُن کی سات سو سال کی قومی روایتیں محفوظ ہیں، اور مسلمان اُن کی حفاظت کے ساتھ اشاعت کے بھی تمنائی ہیں۔ اور اس طرح یہ کشاکش جاری ہے۔

اُردو اور ہندی کا یہ ناگوار جھگڑا اس وقت تک باقی رہیگا جب تک ہماری سیاسی اور سماجی

زندگی میں وہ خوشگوار انقلاب پیدا نہ ہو جائے جس کا خواب نوجوان ہندوستان بے چینی کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ دراصل یہ سارے جھگڑے اونچے درجہ کے لوگوں کے پیدا کردہ ہیں، وہی اس زہریلی تحریک کو چلا رہے ہیں اور چلاتے رہیں گے۔ کیونکہ اس قسم کی بے معنی تحریکات کو وہ کبھی مذہبی کبھی معاشرتی بنا کر عوام کے سامنے پیش کر کے اپنی لیڈری قائم رکھنے کے عادی بن چکے ہیں۔ اور عوام کی موجودہ حالت اتنی پست ہے کہ ان کی فریب کاریوں کو سمجھنے کی اُن میں صلاحیت ہی نہیں۔

اس کشاکش کو ہمارے "بزرگوں" (بزرگ سے ہماری مراد ہندوستان کا غیر نوجوان طبقہ ہے جس میں بلا تخصیص مذہب وملت کے افراد شامل ہیں) نے اتنا بڑھا دیا ہے کہ اب اس کا حل اُن کے پاس نہیں۔ کیونکہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آزاد فکر ہونے کی ضرورت ہے۔ اور ان بزرگوں کے دماغوں میں آزاد فکری اور آزاد خیالی کا کوئی صحیح تصور نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُن کا سرمایہ ناز وافتخار اُن کی تنگ نظری اور تنگ دلی ہے۔ اُن میں اکثر ایسے بھی ہیں جو آزاد فکری اور آزاد خیالی کے دعویدار ہیں، مگر کسی مسئلہ پر بھی آزاد خیالی اور وسعت نظری کے ساتھ سوچ نہیں سکتے۔ اُن کے چند مفروضات ہوتے ہیں جو کسی حال میں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ یہ تو چاہتے ہیں کہ ملک آزادی اور ترقی کی منزلیں طے کرے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے تنگ خیالات اور غلط مفروضات کو بھی نہیں چھوڑتے جو آزادی کی راہ میں پہاڑ سے اونچے اور سمندر سے زیادہ گہرے ہیں۔ بعض ہندوؤں کے دماغوں میں کھُلّم کھُلّا ہندو راج اور ہندو تمدن کے احیاء کا خبط سمایا ہوا ہے، اور مسلمانوں میں بھی بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے مفروضہ تمدن کو سب سے بہتر سمجھکر دوسروں کے گلے میں منڈھنا چاہتے ہیں۔ انھیں دو متضاد اور زہریلی ذہنیتوں کی ٹکر کا نتیجہ ہے کہ بہت سے مسئلوں کی پیچیدگیوں کے ساتھ اُردو ہندی کا جھگڑا بھی قائم ہے۔

زبان کے مسئلہ میں شمالی ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے درمیان جو کشاکش جاری ہے یہ اُس کا ایک دھندلا سا نقشہ ہے۔ اب آئیے تاریخ کی روشنی میں دیکھیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ہماری زبان کیا تھی، کیا ہے اور کیا ہوگی؟

ہندوستان میں جب جنگلی اور وحشی قوم آباد تھی اُس وقت اس کی جو زبان ہو اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں، پھر جب ایک زمانہ کے بعد وسط ایشیا سے آکر آریوں نے انھیں مار بھگایا اُس وقت جنگلیوں کی زبان کی جگہ مہذب آریوں کی زبان نے لے لی۔

جب ہندوستان میں آریوں نے پوری طرح قدم جما لیا، تو ضرورت کے لحاظ سے ذاتوں کی تقسیم ہوئی اُسی وقت سے برہمنوں اور اونچی ذات کے لوگوں کی زبان سنسکرت اور ادنیٰ قوموں کی زبان پراکرت ٹھہری

پھر ان کی آبادی بڑھتی اور پھیلتی گئی، اُن کی زبان بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی گئی۔ چنانچہ ان کی علمی زبان تو سنسکرت باقی رہی، کیونکہ ہندو تمدن کی باگ برہمنوں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن ہر صوبہ کی عام زبان الگ ہو گئی۔ بلکہ اس سے بھی آگے جا کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی صوبہ میں مختلف قسم کی زبانیں بولی جانے لگیں۔

اِس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب آریوں نے سماجی زندگی میں درجے قائم کئے تو زبانیں الگ ہوئیں، اور ایک زمانہ تک برہمنوں کی روحانی حکومت کے ساتھ سنسکرت کی علمی حکومت قائم رہی۔ مگر پھر ایک زمانہ کے بعد مہاتما بُدھ نے برہمنیت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، تو سنسکرت کو بھی ٹھکرا کر جو اُس وقت کی بلا شک وشبہ علمی زبان تھی اور علمی جواہرات سے معمور تھی اپنے مذہب کے پرچار کے لئے عوام کی زبان کو منتخب کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برہمنوں کی طاقت کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان بھی اپنے قدم پیچھے ہٹاتی گئی، اور عوام کی زبان کے قدم آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ جب بدھ دھرم کو مگدھ کے راجاؤں کی سرپرستی حاصل ہو گئی تو یہ عوام کی "پالی" زبان مگدھ سے لے کر پشاور اور مہاراشٹر تک پھیل گئی۔ چنانچہ آج بھی پشاور اور مہاراشٹر وغیرہ میں پالی زبان کے بیشمار کتبے جو اشوک اعظم کے زمانہ کی یادگار ہیں، ملتے ہیں۔

اس کے بعد جب مگدھ کے بدھ راجاؤں کی طاقت کم ہو گئی اور برہمنوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بُدھ دھرم کا مقابلہ اور ویدک دھرم کے احیاء کی کوشش کی تو اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے۔ بدھ دھرم کے قدم پیچھے ہٹتے گئے۔ اور اسی کے ساتھ "پالی" بھی رفتہ رفتہ بھولی بسری زبان ہو گئی۔ لیکن سنسکرت زبان کو بھی وہ اقتدار دوبارہ نصیب نہ ہوا جو اُسے پہلے حاصل ہوا تھا۔ کیونکہ عوام میں اپنی فطری زبان کی قدر وقیمت کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ اور جب دوبارہ الگ الگ صوبوں اور علاقوں میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئیں تو اُن کی زبانیں بھی دوسرے صوبوں یا دوسری حکومتوں کی زبانوں سے علیحدہ رہ کر ترقی کرنے لگیں۔

جس وقت مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا۔ اُس وقت سارا ہندوستان بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم تھا۔ اور زبان، معاشرت اور آپس کے بغض وعناد کی وجہ سے بہت سے ملکوں کے مجموعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے رفتہ رفتہ تمام چھوٹی چھوٹی حکومتوں کا خاتمہ کر کے ہندوستان کو ایک مُلک بنا دیا۔ جس وقت مسلمانوں نے دہلی میں حکومت قائم کی اور اُس کو استحکام حاصل ہوا اُس وقت دہلی کے آس پاس ہریانی، اودھ کی بولی، برج بھاشا اور مگدھی بھاشا تھی۔ جو انتہائی قربت کے باوجود علیحدہ علیحدہ زبانیں تھیں، ان میں برج بھاشا کو زیادہ وسعت حاصل تھی۔ بہرحال جب تک فاتحین اور مفتوحین میں جنگ جاری رہی سب زبانیں الگ الگ رہیں، لیکن جب مسلمانوں کی حکومت کو

استحکام حاصل ہو گیا اور دونوں قوموں کے دلوں میں دشمنی کی آگ ٹھنڈی ہو گئی، تو آپس میں لوگ ملنے جلنے لگے۔ اس طرح مرکزی ہندوستان میں سندھ کی طرح ہندوستان کی زبان کو غیر ملکی زبانوں سے ملنے کا موقع ملتا رہا۔ جیسے جیسے ہندوؤں اور مسلمانوں کا میل جول بڑھتا گیا، دونوں کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے قریب ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ اکبر اعظم نے اپنے عہد حکومت میں ہندوستان کی سماجی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ایک پریم بندھن میں باندھنا چاہا، شاہی محل میں ہندو رانیاں آئیں، اور حکومت میں براہ راست ہندو راجاؤں کا اثر کام کرنے لگا۔ راجہ مان سنگھ نے ایک قدم آگے بڑھ کر فارسی کو دفتری زبان کی حیثیت دے دی۔ اکبر اعظم کے نورتن اور ہندو مسلمانوں کے گہرے تعلقات نے ایک علحدہ زبان کی مستقل بنیاد ڈال دی۔ جو اکبر اعظم کے پوتے شاہجہاں کے عہد حکومت میں خاص طور پر پروان چڑھی۔ میر امّن کی تقلید میں تقریبًا تمام مؤرخ یہی کہتے ہیں کہ اس نئی زبان کی بنیاد شاہجہاں کے عہد حکومت میں پڑی اور اسی لئے اس کا نام اُردوئے معلّیٰ پڑا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی کے کسی پہلو میں بھی انقلاب بغیر حالات کی موافقت پیدا نہیں ہوتا۔ اکبر اعظم نے ہندوستان کی سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس انقلاب کے لئے اُس نے جتنے لوازمات فراہم کئے تھے، اُس کا لازمی نتیجہ ایک نئی زبان کی پیدائش تھی۔ البتہ شاہجہاں نے ایسے مواقع کو وسیع کر دیا تھا جس میں یہ نئی زبان نشو و نما پا گئی۔ یہی نئی زبان ایک عرصہ تک ہندی، ہندوی، ریختہ اردوئے معلیٰ کے نام سے پکاری جاتی رہی اور اب کچھ دنوں سے اُردو اور ہندی کہی جاتی ہے۔

عہد شاہجہانی میں یہ زبان لال قلعہ میں بڑے ناز و نعمت کے ساتھ پرورش پاتی رہی۔ اس کے بعد رؤسا کے مکانوں میں آئی، پھر متوسط درجہ کے لوگوں میں، پھر وہاں سے دہلی کی گلیوں گلیوں میں دوڑنے لگی۔ اور سب کی پیاری بن گئی۔ جو جہاں گیا اُسے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اس طرح اس کے قدم دہلی سے بھی باہر نکلے۔

انقلاب زمانہ نے تاریخ ہندوستان کا ورق اُلٹ دیا، ایک دوسرا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ۱۸۵۷ء کی تند و تیز ہواؤں نے ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔ لال قلعہ میں اندھیرا ہو گیا، فورٹ ولیم میں چراغاں ہوا، خوشیاں منائی گئیں۔ سیاست کی بساط بچھی اور ہندوستانیوں کو مات دینے کے لئے مختلف چالیں چلی گئیں۔ انھیں چالوں میں سے ایک فورٹ ولیم کالج کا قیام بھی تھا۔ جان گلکرائسٹ نے دیکھا کہ ہندوستان کی یہ نئی زبان ممکن ہے کہ

اس کے لئے مضرت رساں ہو، اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس کو ایک سے دو کر دیا جائے۔

دہلی کی محفل کی پراگندگی کے بعد جس کا منہ جدھر اُٹھا چلا گیا، اور اپنی زبان کو دہلی کی شوکت و سطوت کی یادگار بنا کر ساتھ لیتا گیا۔ جان گلکرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں اس عہد کے فضلا کو دعوت دی۔ اور عقلمندی کے ساتھ اُن کے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ دیدیا جس کو وہ شربت کے گھونٹ بنا کر پی گئے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا اور رسم خط کی بنا پر زبان کا ایک رخ سنسکرت کی طرف اور دوسرا رخ عربی اور فارسی کی طرف پھیر دیا گیا۔ اس کے بعد جان گلکرائسٹ کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر لوگوں نے عمارتیں قائم کرنی شروع کردیں۔ اور زبان کے معماروں نے الگ الگ کچھ ایسی عمارتیں بنا دیں کہ اب یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ یہ دونوں عمارتیں ایک ہی آب و گل کی ہیں۔

یہ ہے ہماری زبان کے ارتقا کی مختصر تاریخ، اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں نے کیسا دھوکا کھایا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی زبان تو ایک رہی لیکن خواص کی زبانیں دو ہو گئیں، ہندوؤں میں اونچے درجے کے لوگوں کی زبان ہندی اور مسلمانوں میں اونچے درجے کے لوگوں کی زبان اُردو۔ اور وہ اب بھی باقی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ہی طبقہ، یعنی اونچے درجے کے لوگوں کا طبقہ ہے، جو اُردو اور ہندی کی دُکان الگ الگ لگا کر بیٹھا ہے۔ ورنہ عوام کی زبان میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ مسلم عوام کی زبان اُردو، اور ہندو عوام کی زبان ہندی ہے۔

عوام کی زبان ایک ہے اور ایک ہی ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ زبان نام ہے الفاظ کے مجموعہ کا، اور الفاظ کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ متکلم اپنے مخاطب کو اپنا مافی الضمیر سمجھا دے۔ اگر اس مقصد کو زبان سے علیحدہ کر دیا جائے تو الفاظ بے معنی چیز رہ جاتے ہیں۔ یعنی زبان قطعی طور پر ایک مفاہمی چیز ہے، اور اسی مفاہمت کی بنا پر دنیا کے مختلف حصوں کی زبانیں الگ الگ ہیں۔ الفاظ دراصل اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لئے مقرر کردہ آوازیں ہیں، جن کو ہم سمجھ لیتے ہیں تو ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر الفاظ کی تقسیم موزوں اور مہمل کے ناموں پر ہوئی۔ مثال کے طور پر اگر کسی جاہل کے سامنے اعلیٰ درجہ کی عربی یا انگریزی میں کوئی بات کہی جائے۔ یا امراء القیس اور ورڈسورتھ کے اشعار پڑھے جائیں تو اُس کے نزدیک اُن کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ وہ عربی اور انگریزی زبان سے قطعی نابلد ہے۔ لیکن اسی کے سامنے کوئی معمولی سا دیہاتی دوہا پڑھ دیجئے۔ دیکھئے وہ سر دھننے لگے گا اس لئے کہ دوہا کے الفاظ سے وہ واقف ہے۔ اور ٹھیک جس طرح الفاظ مقرر کردہ آوازیں ہیں

اُسی طرح "حروف" مقرر کردہ نقوش ہیں، جن کے ذریعہ ہم اپنے مافی الضمیر کو تحریر کی شکل میں منضبط کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے الفاظ یا حروف بالکل مفاہمتی چیزیں ہیں۔ متکلم اور مخاطب کے درمیان ایک مفاہمت ہے کہ فلاں آواز یا فلاں نقشہ سے فلاں چیز سمجھی جائے!

البتہ ہماری یہ مفاہمت اتنی قدیم ہو چکی ہے کہ اب اس کا احساس تک باقی نہیں۔ لیکن اگر مفاہمت کی حقیقت کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اُس شخص کو دیکھ لیجئے جو اپنی مادری زبان کے علاوہ اور کوئی دوسری زبان سیکھ رہا ہو۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہمارے الفاظ ہمارا رسم خط ہی نہیں بلکہ ہماری زبان بھی قطعی طور پر ایک مفاہمتی چیز ہے جس کے لئے جھگڑنا کسی حال میں بھی محمود قرار نہیں دیا جاسکتا ہماری زبان ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے، ابھی اس کو ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کرنا باقی ہیں، اور اس قسم کی اُلجھنوں میں پڑنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔

اب آئیے ایک دقیق نکتہ کو پیش نظر رکھ کر آئندہ کے متعلق کچھ سوچیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ملک میں شہنشاہی کا دور دورہ تھا، اور اب بھی ہے لیکن پہلا سا نہیں۔ ملک کے ہر فرد کے دل میں جمہوری حکومت کے قیام کی خوشگوار تمنائیں موجزن ہیں، اور اس کے لئے کوششیں جاری ہیں۔ اس کوشش میں اُن نوجوانوں کا بھی ہاتھ ہے، جو ملک کی اصلی سیاسی نجات اور فلاح اشتراکی جمہوریت کے قیام و استحکام میں دیکھتے ہیں، اور ہندوستانی تمدن کا ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مدارج نہ ہوں کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا نہ ہو بلکہ سب برابر ہوں۔ کیونکہ مدارج کے پھیر میں پڑ کر سخت سے سخت نقصانات برداشت کر چکے ہیں۔ نوجوانوں کی کوششیں ہیں کہ ملک کی دولت عام ہو جائے، تمدن عام ہو جائے تو پھر زبان کو بھی عام کیوں نہ بنایا جائے۔ عام زبان سے میری مراد وہ زبان نہیں ہے جس کا تصور اُردو اور ہندی کے حامیوں کے دماغ میں ہے۔ عام زبان سے میری مراد یہ ہے کہ ہم اُنھیں الفاظ کو استعمال کریں جن کو بولتے ہیں۔ اُردو اور ہندی کے حامی زبانی طور پر تو عام اور سہل زبان کے قائل ہیں لیکن کیا اُردو اور ہندی کا کوئی ادیب کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ وہ لکھتا ہے وہ ملک کی عام زبان ہے۔ اس کو ملک کا ہر فرد سمجھ سکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ تو پھر ہم یہ کیوں نہ کہیں کہ اُردو اور ہندی ملک کے امرا اور متوسط درجہ کے لوگوں کی زبان ہے، عام لوگوں کی زبان ھندوستانی ہے جس کو وہ بولتے اور سمجھتے ہیں، ورنہ اُردو اور ہندی کا تو یہ عالم ہے کہ جاہل آدمی تو ایک طرف معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سُن کر حیرت سے منھ کھول دیتا ہے اور شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کی زبان نہیں۔ اس لئے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ملک میں عوام کی طاقت اُبھرتے ہی

انقلاب کی موجوں میں حرکت پیدا ہوتے ہی اردو اور ہندی کے قدم میداں سے اُکھڑنے شروع ہوجائیں گے، اور ایک دن اُن کو بھی تقریباً وہی حیثیت حاصل ہوگی جو آج سنسکرت کی ہے۔ مگر سنسکرت سے اس کی حالت کچھ اچھی رہیگی، کیونکہ یہ پھر بھی کسی حد تک عوام کی زبان زد ہے۔

سردست ہمیں ایک عام زبان کی تخلیق کی جدوجہد کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ پیدا ہونے والی انقلابی تحریکیں خود ہی اُس کی تخلیق کا باعث ہونگی۔ اور جس طرح آج برج بھاشا، مگدھی، برپانی وغیرہ اور مسلمانوں کے میل سے ایک نئی زبان پیدا ہوگئی تھی۔ ٹھیک اُسی طرح ہندوستان کے مختلف صوبوں کی زبانوں کے میل جول سے از خود ایک نئی زبان پیدا ہوجائیگی جو صحیح **ھندوستانی** ہوگی جس کے لئے ہمیں کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

چونکہ رسم خط کا تعلق زبان سے بہت گہرا ہے، اس لئے یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ زبان کے ساتھ رسم خط کا مسئلہ کس طرح طے ہوگا۔ تو اس کا جواب بھی وہی ہے یعنی احیائے تمدن اور تبلیغ تمدن کے خبط کی موجودگی میں یہ مسئلہ طے نہیں پا سکتا۔ جبتک ہماری سماجی زندگی کی باگ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے، کچھ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہاں احیائے تمدن اور تبلیغ تمدن کا خبط کام کررہا ہے۔ لیکن جب سماجی زندگی کی باگ ڈور عوام کے ہاتھوں میں آجائے گی تو رسم خط کے معاملہ میں کوئی جھگڑا باقی نہیں رہ سکتا کیونکہ ان کا تمدن ایک تھا اور ہے۔ اور اُن کو اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اُن کی کوششیں تو جدید تمدن کے قیام میں صرف ہونے والی ہیں۔

رسم خط کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ ان کا مصرف صرف مافی الضمیر کو منضبط کردینا ہے، اور بس۔ اس کے بعد ہم کسی رسم خط کو بھی اختیار کرسکتے ہیں، یا کوئی جدید سائنٹیفک رسم خط تیار کرسکتے ہیں، یہ ہمارے اختیار کی بات ہے۔ آخر ہم ٹیلیگرام کے لئے الفاظ اور رسم خط کو الگ چھوڑ کر چند "ٹک ٹک" کی آوازوں سے کس طرح کام لیتے ہیں۔ اس لئے آئندہ ہندوستان میں رسم خط کا مسئلہ بالکل بے معنی ہوگا۔

دنیا تیزی کے ساتھ بین الاقوامیت کی طرف بڑھتی جارہی ہے، مختلف ذرائع سے ایک ملک دوسرے ملک سے، ایک قوم دوسری قوم سے، ایک زبان دوسری زبان سے قریب تر ہوتی جارہی ہے، البتہ ہمیں اس راہ میں کوئی ایسا قدم اُٹھانا ہوگا کہ ہمیں پھر واپس نہ آنا پڑے۔ اس لئے زبان کا جھگڑا چکانے سے پہلے ہمیں اس مقدم ترین فتنہ کا سر کچل دینا چاہئیے جو ان تمام جھگڑوں اور اُلجھنوں کا سرچشمہ ہے اور جبتک یہ باقی رہیگا ساری لعنتیں ہمارے سروں پر اسی طرح سایہ فگن رہیں گی۔

اور اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں اپنا فرض آفتاب سے زیادہ روشن نظر آنے لگتا ہے۔ کیا زبان کا جھگڑا چکانے کی کوشش کرنے والے حضرات ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟

ہندوستانی سے خطاب

(از حضرت محمود اسرائیلی)

دنیا کی رُت بدل گئی، تجھ کو خبر نہیں!
ہر قوم اب سنبھل گئی، تجھ کو خبر نہیں!
بڑھ کر کہاں نکل گئی، تجھ کو خبر نہیں!
یہ بیسویں صدی ہے مگر سو رہا ہے تو!!

سوداگری میں طاق، نہ صنعت کا تجھکو شوق!
تعلیم کا مذاق نہ حکمت سے تجھ کو ذوق!
مُدت سے ہے غلامی کا گردن میں تیری طوق!
لیکن اس امتیاز پہ خوش ہو رہا ہے تو!!

کچھ لطف تجھ کو ملنے لگا ہے عناد سے!
کچھ دشمنی سی ہو گئی ہے اتحاد سے!
دنیا میں تجھکو کام ہے اپنے مفاد سے!
یہ کانٹے اپنے حق میں تو خود بو رہا ہے تو!!

اوراق منتشر ہوں تو پھر گل کہاں بنے!
یکجا نہوں جو نخل تو کیا گلستاں بنے!
اینٹیں جُدا جُدا ہوں تو کیونکر مکاں بنے؟
تفریق سے تو اپنا بھرم کھو رہا ہے تو!!

تجھ کو نہ پاسِ وضع نہ رسمِ کہن سے اُنس!
کہسار سے لگاؤ، نہ اپنے چمن سے اُنس!
اہلِ وطن عزیز نہ تجھ کو وطن سے اُنس!
دل سے نقوشِ حُبِّ وطن دھو رہا ہے تو!!

مغرب پرستیوں نے تری کھو دیا تجھے!
اپنا سمجھ کے اُس نے نہ پھر بھی لیا تجھے!
اس ذہنیت ہی نے تری رسوا کیا تجھے!
برگشتگیِ بخت کو کیوں رو رہا ہے تو!!

مُضارع فارسی

(از مسٹر سلیم جعفر)

ہمارے قواعد نویس بزرگ فرماتے ہیں کہ مضارع فارسی کے حرفِ آخر کے پہلے "شرف آموزی سخن" یا "شترفم از سخن وے" کے حرفوں میں سے کوئی سا ایک حرف آتا ہے۔ بجا و دُرست۔ اس سے انھوں نے طالب علم کے لئے ایک طرح کی آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کوشش کو وہ خود کس قدر ناکام سمجھتے ہیں، یہ ہم پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کی "جامع القواعد" کا اقتباس پیش کرکے دکھانا چاہتے ہیں۔

"یہ ماضی کے صیغے سے بنتا ہے، مگر حق پوچھو تو اس کے بنانے کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں (۱) (۲)

(۳) اکثر صیغوں میں اسے ماضی سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً دید سے بیند، اور کرد سے کند فارسی زبان کی بہت کتابیں پڑھنے سے اور بہت بولنے سے فکر کو اور زبان کو ایک ڈھب آجاتا ہے کہ صحیح مضارع نکال لیتے ہیں۔ قواعد کی کتابوں میں یہ لکھتے ہیں کہ ماضی کے حرف آخر کو دال سے بدل دو، اور ماقبلِ آخر کو زبر دو۔ (۴) پھر ماضی کے ماقبل آخر کہ ہمیشہ گیارہ حرفوں میں سے ایک ہوتا ہے، اُسے حروفِ مفصلہ ذیل میں سے (۵) ایک یا دو سے تبدیل کرو جس کا مجموعہ (شرف آموزیِ سخن) ہے اور کبھی تبدیلی نہیں بھی ہوتی۔" صفحہ ۳۳ جامع القواعد مطبوعہ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ۱۹۲۶ء۔

جن فقروں پر خط کھینچ دیئے گئے ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔ پہلے تو ہمیں اسی سے اتفاق نہیں کہ مضارع بنانے کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں۔ مرحوم خود فرماتے ہیں اور مشاہدہ تائید کرتا ہے کہ ماضی کا حرفِ آخر دال سے بدلا اور اس کے ماقبل پر زبر لگایا جاتا ہے۔ یہ مضارع بنانے کا اٹل قانون ہے۔ ماضی اور مضارع میں تعلق نہ ہونے کے جو دو مثالیں دی ہیں، اس کا سبب محض اصلیت سے ناواقفی ہے۔ فارسی قواعد کے لحاظ سے دیدن منصرف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دیدن غیر منصرف یا مقتضب ہے اور بینیدن جس کا وجود فارسی میں کہیں پتا نہیں اور جس کا مادہ سنسکرت

کا وین (वेत्ता , वेन्) ہے، اس کے صیغے لے کر تعریف پوری کی گئی ہے۔ کردن سے کند بھی فارسی دانوں کے لئے معمہ ہے لیکن سنسکرت داں جانتے ہیں کہ پانچویں گن (باب) سے تعلق کی بنا پر اس کے صیغۂ حال (= سنسکرت) میں نُ (नु) بڑھانا پڑتا ہے اس لئے یہ بیان حقیقت سے بعید ہے لیکن قابل گرفت بھی نہیں کیونکہ ہمارے بزرگوں نے سنسکرت کو پیش نظر رکھ کر قواعد فارسی لکھے ہی نہ تھے۔ تیسرا فقرہ فقط پہلے کی تائید کرتا ہے۔ چوتھے میں "ماضی کے ماقبل آخر" کے گیارہ حرف بتائے ہیں، مگر کون سے؟ ہم مانے لیتے ہیں کہ یہی "شرف آموزی سخن" کے، کیونکہ یہ بھی گیارہ ہیں، لیکن اس میں یہ دقت پیدا ہوتی ہے کہ پانچویں فقرہ میں بتایا ہے کہ حرف ماقبلِ ماضی انھیں گیارہ حرفوں میں سے "ایک" یا "دو" سے تبدیل ہوتا ہے۔ قصہ مختصر مصدر سے مضارع بنانا جوئے شیر کا لانا ہے۔

جامع القواعد کا سالِ تصنیف معلوم نہیں۔ اس کا سبب تالیف تھا پنجاب میں اشاعت تعلیم۔ لیکن ہمارے پاس ایک اور کتاب ہے جس کے مؤلف جناب روشن علی صاحب انصاری جونپوری ہیں، اور اس کو "بہ تصحیح تمام و تنقیح مالاکلام و کوشش بلیغ و رفع اغلاط" "مطبع نامی گرامی جناب منشی نولکشور صاحب" نے دسمبر ۱۸۶۶ء میں بارِ پنجم طبع کیا۔ اس کا سبب تالیف تھا "برائے خاطر برخوردار فضل علی و دیگر فرزندان دل بند اطال اللہ اعمارہم" اس مؤلف نے فارسی مصدروں کو "باعتبار حرفِ ماقبلِ علامتِ مصدر" گیارہ بابوں میں تقسیم کرکے ہر باب کو فصلوں میں تقسیم کر دیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"بدانکہ جملہ مصادر مشہور مستعمل فارسی یازدہ باب است باعتبار حرف ماقبل علامت مصدر کہ یازدہ است۔ و در کلام استادان مصدرے کہ ماقبل علامتش سوائے ایں یازدہ حرف حرفے دیگر باشد، یافتہ نہ شدہ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر آزاد نے مذکورۂ بالا چوتھے فقرہ میں جن حرفوں کا ذکر کیا ہے، وہ بھی گیارہ حرف ہیں جن کا مجموعہ "شرف آموزی سخن" ہے۔ کیونکہ روشن علی صاحب نے بھی ماقبل علامتِ مصدر جو حرف بتائے ہیں وہ یہی حرف ہیں۔ انھوں نے ان حرفوں سے لفظ نہیں بنائے بلکہ سیدھی سادی طرح سے یوں گنائے ہیں:۔

الف و خا و را و زا و سین و شین و فا و میم و نون و واو و یا۔ اس میں بہت سے حرف نہیں آئے مثلاً ب جو خوابیدن و طلبیدن میں آتی ہے، یا ك جو ترکیدن میں آتا ہے۔ لیکن اس قسم کے تمام مصدروں میں انھوں نے ماقبل علامت مصدر "ی" کو مانا ہے اس مؤلف نے گو ایک نیا راستہ اختیار کیا لیکن بابوں میں باب پیدا کرکے الجھن دور

نہ کرسکا۔ ہمارے نزدیک اس کا تیر نشانہ کے پاس سے نکل گیا۔ گیارہ باب بنائے اور پھر ان کو اٹھائیس فصلوں میں تقسیم کیا۔ اِن فصلوں کی تعداد بہت کم ہوجاتی اگر وہ حذف الف ویا کو جو دن کے پہلے آتے ہیں، ذرا توجہ کرکے اصول کلیہ میں داخل کردیتا۔

ہمارے خیال کی رُو سے مضارع بنانے کے لئے چند اُصول کلیہ قانون ابدال یا مبادلۂ حروف اور چند ایسے مستثنیات کا جاننا جو کہ کسی کلیہ سے وابستہ نہیں ہیں، کافی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد ہونا چاہیئے کہ مصدر منصرف ہے یا مقتضب۔ مثلاً :-

منصرف	مقتضب
آرائیدن	آراستن
بافیدن	بافتن
پیرائیدن	پیراستن
جوئیدن	جَستن
جہیدن	جُستن
خیزیدن	خاستن
شگفیدن۔ شگوفتن	شگفتن
شناسیدن	شناختن
فروشیدن	فروختن
کاویدن	کافتن
گسلیدن	گسستن۔ گسیختن
نگریدن	نگریستن

ہمارے مستخرجہ اُصول کلیہ یہ ہیں :-

کلیات۔ (۱) تن یا دن مصدر سے گرانے کے بعد جو مجموعۂ حروف باقی رہے، اس کے حرف آخر پر فتحہ لگا کر دَ لگا دو۔ جیسے افگندن سے افگند+ بافتن سے بافد+

(۲) تن کے پہلے جن مصدروں میں سن یا سین ہوگا اُن کا س بھی تن کے ساتھ گرجائے گا جیسے دانستن سے داند۔ بایستن سے باید۔

(۳) دَن کے پہلے اگر اَ یا یؔ میں سے کوئی حرف ہوگا تو وہ بھی اس کے ساتھ گر جائے گا۔

جیسے افتادن سے افتد۔ ترکیدن سے ترکد۔

(۴) دن گرانے کے بعد جن مصدروں کا مجموعۂ حروف وَ معروف پر ختم ہوتا ہے دَ لگانے سے پہلے اُن کا واؤ۔ الف اور ی مفتوح سے بدل جاتا ہے۔ جیسے فرسودن سے فرساید۔

(۵) جن مصدروں میں ئیدن آیا ہے اُن کا یہ حصہ گراکر مضارع کی دَ سے پہلے ی مفتوح بڑھائی جاتی ہے جیسے سائیدن سے ساید۔

قانونِ ابدال۔ جن مصدروں میں تن ہے ان میں تن سے پہلے خ۔ س۔ ش۔ اور ف میں سے کوئی نہ کوئی حرف آتا ہے۔

خ ہمیشہ ز سے بدلتی ہے جیسے آمیختن سے آمیزد۔

س اکثر غیر منصرف مصدروں میں آیا ہے اس لئے بحث کی ضرورت نہیں۔

ش ہمیشہ ر سے بدلتا ہے جیسے داشتن سے دارد۔ برشتن۔ کشتن ونوشتن دلکھنا مستثنیٰ ہیں

ف کے پہلے جہاں کوئی حرفِ علت آیا ہے بَ سے بدل گئی ہے، جیسے یافتن سے یابد

مستثنیات:۔

مصدر	مضارع	مصدر	مضارع
آفریدن	آفرند	شکستن	شکند
بودن	باشد	کردن	کند
چیدن	چیند	گرفتن	گیرد
دادن	دہد	گزیدن	گزیند
دیدن	بیند	مُردن	میرد
زدن	زند	نشستن	نشیند

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ صرف فارسی مصدروں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ کیونکہ مقصود یہ تھا کہ طالب علم سنسکرت کے مادّوں اور قانونِ ابدال کے چکر میں نہ پھنسے اور ژند کے جھگڑوں میں بھی نہ پڑے ورنہ اُن مستثنیات کی تعداد جو کسی کلیہ سے وابستہ نہیں ہیں، بہت کم رہ جاتی مثلاً کردن۔ چیدن۔ گزیدن وغیرہ کے مادّے سنسکرت کے پانچویں گن کے مادوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس لئے اُن میں نُ اصول قواعد سنسکرت کے مطابق آتا ہے۔ گرفتن کا سنسکرت مادہ گربھ (ग्रभ = دہد) ہے جو ژند میں گیُریو (ग) مم ام دد = गेरव) ہوجاتا ہے اس سے گیرد بنتا ہے وغیرہ وغیرہ

کلامِ فراق

(از مسٹر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے۔ گورکھپوری)

جسے لوگ کہتے ہیں تیرگی، وہی شب حجاب سحر بھی ہے
جنھیں بیخودی فنا ملی اُنھیں زندگی کی خبر بھی ہے

ترے اہلِ دید کو دیکھ کے کبھی کھُل سکا ہے یہ راز بھی
اُنھیں جس نے اہلِ نظر کیا وہ ترا خرابِ نظر بھی ہے

یہ وصال و ہجر کی بحث کیا کہ عجیب چیز ہے عشق بھی
تجھے پا کے ہے وہی دردِ دل، وہی رنگِ زخمِ جگر بھی ہے

یہ نصیب عشق کی گردشیں! کہ زماں مکاں سے گذر کے بھی
وہی آسماں وہی شامِ غم، وہی شامِ غم کی سحر بھی ہے

ترے کیفِ حسن کی جان ہے، مری بیدلی و فسردگی
جسے کہتے ہیں غم رائیگاں، وہ لئے ہوئے کچھ اثر بھی ہے

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرقِ ناز و نیاز بھی
کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا وہیں حسن خاک بسر بھی ہے

وہ غمِ فراق بھی کٹ گیا، وہ ملالِ عشق بھی مٹ گیا
مگر آج بھی ترے ہاتھ میں وہی آستیں ہے کہ تر بھی ہے

دمِ حشر ازل کی بھی یاد کر، یہ زبان کیا، یہ نگاہ کیا
جو کسی سے آج نہ ہو سکا۔ وہ سوال بارِ دگر بھی ہے

جو وصال و ہجر سے دُور ہے جو کرم ستم سے ہے بے خبر
کچھ اُٹھا ہوا ہے وہ درد بھی، کچھ اُٹھی ہوئی وہ نظر بھی ہے

یہ پتہ ہے اس کی عنایتوں نے خراب کتنوں کو کر دیا
یہ خبر ہے نرگسِ نیم وا کی گرہ میں فتنہ و شر بھی ہے

اسی شامِ مرگ کی تیرگی میں ہیں جلوہ ہائے حیات بھی
انھیں ظلمتوں کے حجاب میں یہ چمک یہ رقصِ شرر بھی ہے

وہی درد بھی ہے دوا بھی ہے، وہی موت بھی ہے حیات بھی
وہی عشق ناوکِ ناز ہے، وہی عشق سینہ سپر بھی ہے

تو زمان مکاں سے گذر بھی جا تو رہِ عدم کو بھی کاٹ لے
وہ ثواب ہو کہ عذاب ہو، کہیں زندگی سے مفر بھی ہے

جو گلے تک آکے اٹک گیا، جسے تلخ کام نہ پی سکے
وہ لہو کا گھونٹ اُتر گیا تو سُنا ہے شیر و شکر بھی ہے

کوئی اہلِ دل کو کمی نہیں، مگر اہلِ دل کا یہ قول ہے
ابھی موت بھی نہیں مل سکی، ابھی زندگی میں کسر بھی ہے

بڑی چیز دولت و جاہ ہے بڑی وسعتیں ہیں نصیب اسے
مگر اہلِ دولت و جاہ میں کہیں آدمی کا گذر بھی ہے

یہ شبِ دراز بھی کٹ گئی وہ ستارے ڈوبے وہ پو پھٹی
سرِ راہ غفلتِ خواب سے اب اٹھو کہ وقتِ سحر بھی ہے

جو اُلٹ چکے ہیں بساطِ دہر کو اگلے وقتوں میں بارہا
وہی آج گردشِ بخت ہے وہی رنگِ دورِ قمر بھی ہے

نہ غمِ عذاب و ثواب سے کبھی چھیڑ فطرتِ عشق کو
جو ازل سے مستِ نگاہ ہے اُسے نیک و بد کی خبر بھی ہے

وہ تمام شکر و رضا سہی وہ تمام صبر و سکوں سہی
تو ہے جس سے مائلِ امتحاں وہ فرشتہ ہے تو بشر بھی ہے

نہ کہو تغافلِ حُسن سے کوئی کارسازیِ غم کرے
کہ جو آج غم سے نکل گئی وہ دعا خراب اثر بھی ہے

ترے غم کی عمرِ دراز میں کئی انقلاب ہوئے، مگر
وہی طولِ شامِ فراق ہے وہی انتظارِ سحر بھی ہے

شاعری میں اہمیتِ وزن

(کسری منہاس مدیر ساربان)

تخیل اور احساس شاعری کے عام اور دائمی خواص ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ ان کی موجودگی ہی شعر کی ہستی کی ضامن ہوسکتی ہے۔ ہم ان کو فقط خصوصیات کا درجہ دے سکتے ہیں لیکن بعض اوقات یہ خصوصیات ایک نظمِ منثور میں بھی ہوتی ہیں۔ اسلئے منظوم نثر اور منثور نظم میں کوئی امتیازی حد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ نظم اور چیز ہے اور نثر اور چیز۔ اس لحاظ سے شاعری فن کی ایک مخصوص قسم ہے۔ اور وہ اس وقت وجود میں آتی ہے۔ جب خیال اور احساس کو موزوں کلام کا جامہ پہنایا جائے۔ اس کلامِ موزوں سے مراد وزن اور قافیہ ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوں۔ تو گویا شاعری کی روح کسی خارجی قالب سے محروم رہی۔ شاعری اپنے مکمل ترین رنگ میں اسوقت نمایاں ہوگی۔ جب صوری اور معنوی محاسن بدرجۂ اتم موجود ہوں گے۔

شعر اور وزن ہم چاہتے ہیں۔ کہ ان متنازعہ فیہ مسائل سے گریز کریں۔ جو شعر اور وزن کے لازم ملزوم ہونے کے متعلق پیدا ہو چکے ہیں۔ تاہم لے ہنٹ کی رائے نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ جو کہتا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ شعر کو موزوں ہونا ہی نہ چاہیئے۔ اور نثر ہی نفسِ شاعری کے اظہار کا آسان ذریعہ ہے۔ لیکن یہ خیال قرینِ قیاس نہیں۔ حقیقت میں ترنم اور غنا ایسی چیزیں ہیں۔ جو شعر کو نثر سے جدا کرتی ہیں۔ شعر کے لئے صورت کے لازم ہونے کی یہی وجہ ہے۔ اور روحِ شعری کا تقتضا بھی یہی ہے۔ کیونکہ شعر کے جوش، خوبصورتی اور قوت کا حلقہ اس کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔" یہ رائے اپنے اندر وزن کی اہمیت کے متعلق غلو رکھتی ہے۔ کیونکہ غالباً لے ہنٹ کو یہ معلوم نہیں۔ کہ شعر کی روحِ حقیقی بعض اوقات نہایت کامیابی سے بدوں کسی موزوں اظہارِ بیان کے ادا ہوجاتی ہے۔ میرے خیال میں یہاں فرق طرزِ ادا کا ہے۔ وہی چیز نثر میں شعری خصوصیات کی حامل ہوسکتی ہے۔ لیکن جب اس کو موزوں کردیا جاتا ہے۔ تو وہ شعر کے لحاظ سے پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتی ہے۔ اگر ہم ورڈز ورتھ اور کالرج کے اقوال کو صحیح سمجھیں" کہ شاعری روح اور صورت کے لحاظ سے سائنس کی ضد ہے" تو لازمی ہے۔ کہ صورت کے لحاظ سے اس کو اپنی موزونیت کی بنا پر نثر سے ممتاز رکھا جائے۔ اس خیال کی تائید

کارلائل بھی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اُس پرانے اور فرسودہ خیال میں کہ شعر ہمیشہ موزوں ہوتا ہے۔ بہت سے معنی دیکھتا ہوں۔ اگرچہ شاعری میں بہت سا ایسا مواد ہے جو فقط اندرونی جذبے کی بنا پر نظم میں آگیا۔ ورنہ اس کا بہت سا حصّہ نثر میں کامیابی کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے" اسی طرح آرنلڈ بھی اپنی اس رائے کے باوجود کہ "شاعری تنقید حیات کا نام ہے" اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ نثر کے تخیلی مضامین سے نظم کے تخیلی مضامین کو جدا کیا جائے۔ شاعری کا وزن اور نظم اس کے خیال میں جب التزام اور ارتباط کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔ تو شعر تقریباً پایۂ تکمیل تک پہونچ گیا۔

اب یہ بات ثابت ہوئی۔ کہ وزن شاعری کی ایک ناقابلِ ترک خصوصیت ہے۔ اور جب ہم اس کو شعر اور نثر کے درمیان حدِ فاصل قرار دیتے ہیں تو بلاشبہ بہت سی مشکلوں میں اُلجھنا پڑتا ہے غالباً بہت حد تک ونسیلے کی یہ بات صحیح ہے۔ "کہ کوئی منظوم کلام قطع نظر اس کے کہ وہ اچھا ہو یا بُرا، ان تمام اشخاص کے لئے جو امتیاز کا کوئی معیار نہیں رکھتے، حقیقی شاعری کا مظہر ہو سکتا ہے" قطع نظر اسکے کہ وزن کا التزام شعر کی تعریف میں داخل ہے۔ ہمیں اس اُصول کی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ وزن شعر کا اس کی صورت کے لحاظ سے آج تک ایک اہم، ناقابلِ ترک اور ضروری جزو رہا ہے اور یہی وہ احساس محکم ہے جس پر ہم شعر کی ادبی خصوصیات کی پسندیدگی کی بنیاد رکھ سکتے ہیں

پس ہمیں شعر ہی سے یہ بات سمجھ لینی چاہئیے۔ کہ روحِ شعری اور جذبات کا خواہ کچھ ہی تعلق ہو شعر کا منظم اور موزوں طریقۂ بیان شعر کا ایک جزو لاینفک ہے جس پر تفہیم مطالب کی جمالیاتی مسرت کا انحصار ہے۔ آجکل کے نظریہ باز اشخاص کبھی کبھی یہ کہتے سُنے گئے ہیں۔ کہ شعر کو اسکی فرسودہ قیود سے آزاد کر دیا جائے۔ لیکن طلبگارانِ فن کی ایک کثیر جماعت ایسی موجود رہی گی۔ جو اس حقیقت کو تسلیم کرتی رہی گی۔ کہ شاعری کا لسانی ترنم اور وزن کا ربط اور نظم ہی ایسی چیزیں ہیں جو اس معنوی نشاط کی حقیقی محرک ہیں۔ جو شعر کو پڑھ کر ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی وہ عجیب و غریب چیز ہے۔ جس کی بدولت شعر کو ہمیشہ نثر پر عظمت اور فوقیت حاصل رہی گی۔ اور ہم آرنلڈ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہیں گے۔ کہ "وزن ارتقائے شعر کا ایک لازمی مرحلہ ہے"

وزن کی اہمیت بہ لحاظ جذباتِ شعریہ

اس بحث کے متعلق دوسری بات یہ ہے۔ کہ وزن صرف شاعری کا جزو ہی نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا اسلوب ہے۔ کہ روحِ شعریہ بس کی مقتضی ہے۔ اور وزن شاعری کو اظہارِ جذبات کا ایک بہترین ذریعہ عطا کر کے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے

ٹل کہتا ہے" ابتدائے آفرینش سے انسان لطیف۔ عمیق اور رنگین جذبات کا اظہار منظم۔ مربوط اور موزوں کلام میں کرتا چلا آتا ہے۔ اور جہاں تک کہ کلام کا ترنم اور غنائی خصوصیات ہمیشہ جذبات کے عمق کی آئینہ دار رہی ہیں۔ یہ وہ نفسیاتی حقیقت ہے جو شعر میں صورت اور روح کے رشتوں کی علت غائی ہے۔ دیکھا گیا ہے۔ کہ نثر کے پرزور فقروں اور موثر انداز بیان میں مکمل طور پر تو نہیں۔ جزواً شاعری کی روح جھلکیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہے" اس کے علاوہ ہیگل نے مشاہدہ کیا۔ کہ چند جچی تلی تراکیب کا ترنم اور موسیقیت سے بہرہ ور جانا پڑھنے والے کو نشاط معنوی کی ایک رنگین دنیا میں لے جاتا ہے۔ اور یہ بات نثر کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ لیکن ایک اطالوی فلاسفر صرف ان تاثرات کے متعلق بحث کرتا ہے۔ جو قلب انسانی پیدا کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ان کی رائے کا مفہوم جامع اور مانع ہے۔ اور جرمنی کے ایک اور شاعر کا مقولہ اس بیان کی تصدیق کر رہا ہے۔ شلر نے گوئٹے کو لکھا۔ کہ آجکل میں نثر کی ایک کتاب کا منظوم ترجمہ کر رہا ہوں۔ اور مجھے عمر بھر اتنا لطف نصیب نہیں ہوا جتنا کہ مجھے یہ محسوس کرکے ہوا۔ کہ شعر میں صورت اور روح بہت نازک طور سے آپس میں ارتباط رکھتی ہیں جب سے میں نے نثر کو منظوم کرنا شروع کیا ہے۔ میری زندگی نئے اصولوں کے زیر اثر نظر آتی ہے۔ بعض چیزیں جو نثر کی ایک کتاب میں برمحل اور مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ نظم ان کے محدود معانی کی قیود کو برداشت نہیں کرسکتی۔ بلکہ اس کا تقاضائے پیہم یہی ہے۔ کہ تخیل کی رنگینیوں کو الفاظ کی صورت میں گوندھا جائے۔ اور اس لحاظ سے میرے مقاصد حیات روحانی اور لاہوتی ہوگئے ہیں"۔ جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے۔ یہاں مضمون نگار نے لوازمات شعری کو ایک غیر معمولی نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ کیونکہ عام طور پر ہم شعر یہ جذبات کا بہترین طرز اظہار وزن ہی کو تصور کرتے ہیں۔ لیکن شلر ہمیں ایک بھولی ہوئی حقیقت یاد دلاتا ہے کہ شعر کی صورت کس قدر شاعر کے جذبات اور احساسات کی محرک ہوتی ہے۔

اب ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں۔ کہ شعر کو عام طور سے خیالات منثور کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ محاسن شعری کی فنائیت کے مترادف ہے۔ اور دوسری اہم بات یہ ہے۔ کہ قوت تخیلہ کی وجد ساماں صلاحیتوں اور قلب انسانی کی لطیف وارداتوں کو نثر میں بیان کرنا شاعری کے حقوق کو الٹی چھری سے ذبح کرنا ہے۔ نثر اور نظم مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں کی حیثیت مختلف ہے۔ اور دونوں کے مقاصد مختلف۔ اور ان کے درمیان امتیاز کرنا نہ صرف ضروری بلکہ اصول ادب کا یہی اقتضا ہے پس یہ ایک روشن حقیقت ہے۔ کہ ایک بلند شعر صوری اور معنوی رنگینیوں کا مرقع ہوتا ہے۔

اور یہ ایک کٹھن منزل ہے۔ اور ہمیں اسپنسر کے ہم زباں ہوکر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہو سکے تو شعر مت کہو۔"

اب ہم اس موضوع کو ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وزن موسیقی کی طرح دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ الفاظ کو ایک خاص ترتیب میں رکھدینا۔ اور ایک خاص شکل میں پیش کرنا ان کے معانی میں ایک نیا رنگ بھر دینا اور ان کے پوشیدہ پہلوؤں کو نمایاں کرنا حقیقت میں ایک ایسا جادو ہے۔ جو نثر کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ کیونکر ہوتا ؟ اور کس طرح ہوتا ؟ اس کا جواب ماہرِ نفسیات سے دریافت کیجئے۔ اُس کے لئے یہ ایک قابلِ تحقیق امر ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ بعض اوقات ایک اجنبی زبان سے حسین اشعار سُنے جائیں۔ تو الفاظ کا ترنم۔ وزن کا زیر و بم بحروں کی روانی اور تراکیب کی پرفسوں ہم آہنگی ہی اس قدر جاذبیت کی مالک ہوتی ہے۔ کہ پڑھنے والے کے دل پر نہیں بلکہ اُسکی رُوح کی وسعتوں پر ایک کیف بار گھٹا بن کر چھا جاتی ہے۔ اور اس وقت وہ اس حقیقت کو پہچانتا ہے۔ کہ وزن ہی کی وجہ سے شاعرانہ خیالات جذبات کی شورشوں سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ اور وزن کی چند اصناف جنکو شاعر اظہارِ جذبات کا فطری ذریعہ سمجھتا ہے۔ پڑھنے والے کے دل پر اپنا اثر ڈالنے کے لحاظ سے اور اپنے فنی لوازمات کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ جیمز منٹگمری لکھتا ہے۔" اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ شاعری کی قوت کا وزن کے بہترین انتخاب پر کتنا انحصار ہے۔ تو ہم تجربے کے طور سے شکسپیر اور ملٹن کی ابیات نثر میں بکھیر دیں۔ اور پھر نظم کرنا چاہیں۔ یہ کوشش بالکل اسی طرح ہوگی۔ جیسے کوئی شبنم کے ان قطروں کو اٹھانا چاہے۔ جو سبز گھاس پر موتی بنکر چمکتے ہوں۔ لیکن ہتھیلی پر پانی ہوکر بہ جاتی ہوں ان کا جوہر اور عناصر تو قائم رہتا ہے۔ لیکن ان کی تابانی خوشنمائی اور ظاہری شکل کافور ہو جاتی ہے۔"

بس ایک بار پھر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ وزن شعر کا کوئی رسمی قابلِ ترک اور نمائشی پہلو نہیں۔ بلکہ یہ رُوحِ حقیقی کی بہترین تخلیق ہے اور شاعری کو بہ لحاظِ فن ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔



ہلدی گھاٹ کی سرزمین

از پرنسپل رام پرشاد صاحب کھوسلہ ناشاد ایم اے

یہی وہ سرزمیں ہے جسمیں ہلدی گھاٹ کا رن تھا
یہی خطہ ہے وہ جسمیں جوانمردوں کا مدفن تھا

دکھائے تھے یہاں پرتاپ نے تلوار کے جوہر
لٹائے جاں نثاروں نے یہاں تھے جان کے گوہر

پہن کر زعفرانی پگڑیاں گھمسان میں اُترے
وہ گویا باندھ کر سر سے کفن میدان میں اُترے

قدم پیچھے ہٹا اُن کا نہ ہرگز جان کی خاطر
وہ اپنے آخری دم تک لڑے ایمان کی خاطر

یہ بھومی دیوتاؤں کی یہ مسکن راجپوتوں کا
بلا ہوگا لہو اس خاک میں کتنے سپوتوں کا

وطن کے آستانے پر یہاں سر کٹ گئے کتنے
یہاں کی داستاں سن کر کلیجے پھٹ گئے کتنے

لکھے ہیں کارنامے ان شہیدوں کے چٹانوں پر
چمکتے ہیں شہادت کے نشاں اُجڑے مکانوں پر

یہاں کے ذرے ذرے میں بھری اُلفت وطن کی ہے
یہاں کے تنکے تنکے میں بسی خوشبو چمن کی ہے

اجل کی گود میں سو کر بھی وہ زندہ رہے اب تک
فلک پر مہر و مہ ہو کر وہ تابندہ رہے اب تک

نہ کر دل سے فراموش اے بشر تو ان کی ہستی کو
حقارت سے نہ دیکھ اے آسماں تو انکی بستی کو

زمیں گر بھول بھی جائے فلک ہے پاسباں ان کا
رہے گا تا ابد ناشاد دنیا میں نشاں ان کا

کہ ان کی موت رازِ ہست کی شرح مکمل ہے
کتابِ زندگی میں ان کا خوں رنگین جدول ہے



حضرت امیر مینائی کا رنگِ تغزل

از منشی دیبی پرشاد سریواستو منشی وکامل

امیرالکلام حضرت امیر مینائی دُنیائے علم و ادب میں اپنی مختلف خصوصیاتِ گوناگوں و کمالات رنگارنگ کے اعتبار سے جو فضیلت و مرتبت رکھتے ہیں وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ بارہ سال کی عمر سے بغیر کسی کی فرمائش کے اشعار نظم کرنے لگے تھے۔ یہ خیال کہ حضرت امیر مفتی تھے اُنھیں شاعر نہ ہونا چاہئے اصلیت سے دُور ہے۔ یہ انتہائی کمال ہے کہ ایک طرف اُن کی فاضلانہ ہستی اپنے مفتیانہ مسائل کے حل میں مصروف اور اپنے فرائضِ عالمانہ کی تکمیل پر آمادہ رہتی تھی تو دوسری طرف ادب نواز فطرت اور رجحت و جدت میں محو و مستغرق دِل نغمات سرور انگیز بلند کرنے میں منہمک۔ شاعری کی کامیابی اُسی حالت میں ممکن ہے جبکہ ایک شاعر اُس کے تمام پہلوؤں اور فن سخنوری کے تمام اسرار سے کما حقہ واقف ہوکر اُس کے نکات و رموز پر حادی ہو، اِس حیثیت سے امیر مینائی کا ذخیرۂ کلام سامنے رکھئے تو انصاف کی نظریں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہونگی کہ فنِ شعر پر اُنھیں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔

تغزل اُردو غزل پر عام طور پر یہ اعتراض ہے کہ وہ عشق و محبت کے غیر فطری جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے لیکن یہ کلیہ کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں اور بعض دیگر اہلِ کمال کی طرح حضرت امیر نے بھی ثابت کردیا ہے کہ غزل کا دائرہ صرف حسن و عشق کے مضامین کے لئے تنگ اور مخصوص نہیں۔ اس میں حکمت و معرفت اور فلسفہ و تصوف کی چاشنی سے بھی رنگ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ صرف اسلوبِ بیان سے دلکشی اور لطافت پیدا کرکے غزل کی نزاکت کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ مگر یہ امر بھی حقیقت سے دُور نہیں کہ غزل کا مفہوم اصلی حُسن و عشق کے لئے کسی حد تک مخصوص ضرور ہے اِس سے مراد صرف یہ ہے کہ حسن و عشق کے مضامین جب نظم کے قالب میں ڈھلتے ہیں تو غزل کی شکل اختیار کرتے ہیں، یہ مقصد نہیں کہ غزل میں سوائے اِن خیالات و جذبات کے دیگر مضامین کا اظہار ہی منع ہے۔

وارداتِ حسن و عشق سے کسی متمدن قوم کی شاعری خالی نہیں کیونکہ حُسن و عشق ہی پرمدارِ کائنات ہے۔ عشق وہ جذبۂ صداقت ہے جس کے بغیر اِنسان اِنسان کہلانیکا مستحق نہیں۔ حُسن و عشق سے کائنات کا ذرہ ذرہ معمور ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ جذبۂ صادقہ دعشق صرف عشق ہی رہے۔ اہلِ ہوس خواہش کا

نام عشق اور نمایش کا نام حُسن رکھ کر حسن و عشق کی مٹی خراب کرتے ہیں۔ اس کا فنِ شاعری جیسا فنِ شریف ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے غیر فطری ہونیکا الزام بھی کسی حد تک صحیح نہیں اور محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

متذکرہ بالا بحث کو سامنے رکھکر حضرت امیر مینائی کی شاعری کے دفاتر کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقتاً وہ ایک کامل الفن اور بلند پایہ شاعر تھے اور غزل کو اُنھوں نے جن مضامین دلکش و لطیف سے سجا کر اپنی کامیاب ترین عشقِ سخن کا ثبوت دیا۔ وہ اُنھیں کا حصّہ تھا۔

ملاحظہ ہو جذباتِ عشق و محبت کے اظہار کے لئے زمینِ غزل کو کس طرح کامیاب بنایا ہے ؎

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب — میرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

خوگرِ جورِ محبت کی عالی حوصلگی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ کس لطیف پیرایہ میں کس پاکیزہ جذبۂ محبت کو بیان کیا ہے ؎

پھنسی جو دام میں بُلبل تو کن نگاہوں سے — کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا

عشق کی دشوار گذار راہوں سے نا آشنا دل جب پہلے پہل اِس وادی میں قدم رکھتا ہے تو مشکلات کے اندازہ سے اُس کے نوگرفتار دل کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔ اِس آسان اور دلکش طرز میں اُس واقعہ کی تصویر کھینچنا امیر الکلام کے ہی شایانِ شان تھا۔ نوگرفتارِ دامِ محبت کے حسیات کا اظہار اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ "کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا" یہ ہے اُردو شاعری کا شباب ؎

امیر ایسی کہاں قسمت جو پہونچوں اُڑکے پھولوں تک — کبھی چاکِ قفس سے جھانک لیتا ہوں بیاباں کو

گرفتارِ محبت کی مایوسی اور بے بسی کا بیان کسقدر رقت انگیز اور دلگداز ہے ؎

رہ رہ کے ایک کھٹک سی سینہ میں ہو رہی ہے — شاید ابھی ہے باقی ٹکڑا کوئی جگر کا

کیسے سادہ الفاظ میں داستانِ محبت کے ایک ناقابلِ تشریح ٹکڑے کو بیان کر دیا ہے ؎

تم دُکھاتے تو ہوا امیر کا دل — اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ یہ ہے رنگِ استادی! اِس کا فرحقیقت کی تشریح نہیں ہو سکتی ؎

آپ ہی جل رہے ہیں پروانے — شمع کی سرگذشت کون سُنے

وفورِ جذبات کی اِس سے بہتر مثال کیا ہوگی ؎

بے قراری نے بدلوائی تو کروٹ بدلی — درد دل نے جو مدد کی تو میں بستر سے اُٹھا

یہ ہے اُردو تغزل کی کامیاب مثال جس پر بے اختیار آہ نکلتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ

جذبہ عشقِ صادق کا جذبۂ حقیقی نہیں ؎

کرتے ہیں جو لوگ ذکر اُن کا　　ایک ایک کا مُنھ میں دیکھتا ہوں

اس پر محبت کی مجبوری و ناکامی کی تصویر کن قیامت خیز و محشر زا الفاظ میں قلمبند فرمائی ہے،
زہے شانِ امیر الکلام ؎

ہزار طرح کے ہوتے ہیں وہم ہم کو امیر　　کسی کی آنکھ جہاں ہم پر آب دیکھتے ہیں

کس بسیط داستان کو دو مصرعوں میں اِس آسانی سے ادا کر دیا، سبحان اللہ! اور محبت کی جس آخری منزل کا ذکر ہے شرح نہیں کی جا سکتی۔ ذیل میں اسی نوعیت کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو عشق و محبت کی جیتی و جاگتی تصویریں اور حُسن و عشق کی تاثیر کی دلکش داستانیں ہیں گویا ہر ہر شعر درد و اثر۔ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا نشتر ہے ؎

خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیر　　کیوں میری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی　　نگہ نیچی کئے　وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

میں جو ہر ایک سے خطا اپنی بیان کرتا ہوں　　ہے یہ مطلب کہ اُسے کوئی ستمگر نہ کہے

جانتے ہیں جو صبر و ہوش جائیں　　ہم کو اے درد تو بہت ہے

بیخود ایسا ہوں کسی کی لذتِ تقریر سے　　پہروں کرتا ہوں خموشی کا گلہ تصویر سے

<u>معاملہ بندی اور شوخی</u>! ایک رنگِ سخن جو بہت لطیف اور دلچسپ ہوتا ہے یہ بھی ہے کہ شاعر کی شوخیٔ مزاج شعر سے ظاہر ہو۔ جس شاعر کی طبیعت میں تیرؔ کی طرح درد موجزن ہوتا ہے وہ اِس قسم کی شوخیوں پر قادر نہیں ہو سکتا۔ مگر دُنیا میں بعض شعرا ایسا جامع دماغ رکھتے ہیں کہ دونوں متضاد کیفیتوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ امیر الکلام کے کلام میں جہاں مضامین عالی اور خیالات بلند پائے جاتے ہیں۔ وہاں رنگ آمیزی اور شوخی بھی غضب کی ہے۔ درد و محبت کی آمیزش قابل داد ہے معاملات حُسن عشق کو اس دلآویز انداز میں نظم کیا ہے اور سلیس و سادہ طرزِ ادا نے وہ رنگ پیدا کر دیا ہے، جسے شاعری اور خالص تغزل کی جان کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

وصل کو اُن سے جو کہیئے تو کریں وعدۂ حشر　　کہیئے قتل کی خواہش تو ابھی حاضر ہیں

روز آنے کو جب کہا بولے　　اک تمہیں مجھکو پیار کرتے ہو

مرا خط پھینک کر قاصد کے مُنھ پر طنز سے بولے　　خلاصہ سارے اس طومار کا یہ ہے کہ "مرتے ہیں"

مرے مرقد کو ٹھکرانے قیامت بنکر آتے ہیں　　پڑا ہوں میں یہاں آکر تو مجھکو یوں ستاتے ہیں

مری صورت جو بدلی فرطِ غم سے — تو وہ بولے کہ اچھا روپ بدلا

تشبیہات آپ کے یہاں تشبیہات اِسقدر لطیف اور جدید ہیں کہ کسی دیوان میں اتنی کثرت نہیں ہے ذیل کا ہر ہر شعر سامانِ تغزل کی سجی ہوئی دکان ہے۔ اور ایک شاعرِ کامل کی قادر الکلامی کا لطیف نمونہ ؎

شفقِ شام نہیں ہے یہ میرے ماتم میں — مُنھ کو آیا ہے کلیجہ شبِ تنہائی کا

نہیں ہے مُہر لفافہ پہ خط کے اے قاصد — یہ داغ ہے مری قسمت کی نارسائی کا

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے مُنھ سے کچھ نہ بول — آنکھ آئینہ کی پیدا کر دہن تصویر کا

تشبیہ و استعارہ میں آپ نے ایک خاص ترکیب ایجاد کی ہے وہ اِسقدر نازک ہے کہ اُس کی نقل کرنا بھی مشکل ہے اور اِس نوعیت کے یہی موجد ہیں اور یہی خاتم۔ وہ صورت تشبیہ یہ ہے کہ مشبہ بہ کو مشبہ کے قبضہ میں دیدیتے ہیں اور اُسے اسکا مالک بنا دیتے ہیں۔ مثلاً "برق تجلی" مشبہ ہے "اور شعل مشبہ بہ" آپ نے برق تجلی کو مشعل افروز بنا دیا ہے ؎

اِس شان سے ہم آئے تیری جلوگاہ میں — مشعل دکھائی برقِ تجلی نے راہ میں

یا چینِ جبیں سے چھری کو تشبیہ دیجاتی ہے مگر منشی امیر احمد صاحب نے چھری چینِ جبیں کے قبضہ میں دے دی ہے ؎

رُکا خنجر جو دستِ نازنیں سے — چھری جھنجلا کے لی چینِ جبیں نے

رندی وسرمستی مے و مینا کی رنگین داستانیں جہاں حضرت امیر نے بیان کی ہیں۔ ہر شعر بجائے خود صہبائے مینائی کا پر کیف ساغر ہے۔ رندی و سرمستی کے تذکرے ذیل کے اشعار میں پڑھکر اہلِ ذوق کے دماغ سُرور و کیف سے مخمور ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

وہ مست ہوں کہ ساغرِ مے جب میں پا گیا — اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

مسجد میں بُلاتا ہے ہمیں زاہد نافہم — ہوتا کچھ اگر ہوش تو میخانے نہ جاتے

جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے — پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں

زاہد! امیدِ رحمتِ حق اور ہجوئے مے — پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

سادگی و سلاست اور سہل ممتنع زبان کی سلاست و سادگی اور لطیف طرزِ ادا کے لئے تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ حضرت امیر کے کلام کا کیا پایہ ہے۔ ہر ہر شعر اُن کے ذخیرۂ کلام کا ان خصوصیات کا آئینہ ہے اور اعلیٰ کیفیات کا نمونہ ؎

پہلے تو مجھے کہا نکالو — پھر بولے غریب ہے بلالو

دل ٹھہر جائے یہ اُمید نہیں ایسے بگڑے کہیں سنورتے ہیں

کس پُر لطف انداز میں مصرعہ ثانی میں پورا محاورہ نظم ہوا ہے۔

سہل ممتنع میں علاوہ کثرتِ معانی کے ایک صورت یہ بھی ہے کہ اُسمیں معناً عمق ہو اور تخئیل جسقدر وسیع اور نادر ہو اُسی قدر صفائی و سلاست ہو۔ ایسے اشعار میر، مومن اور غالب کے یہاں بہت ہیں۔ حضرتِ امیر کا کلام اِس رنگ میں بھی بہت کافی ہے ؎

بڑی پیچ در پیچ تھی راہِ دیر خدا ہم کو لایا خدا لے گیا

دیر سے مقصود عالمِ شہود۔ اُس کے حوادث میں ابتلا و گرفتاری ظاہر ہے اور اُس سے بچ کے صاف نکل جانا خدا ہی کی مدد پر موقوف ہے۔ نثر میں تشریح کرنے سے وہ لطف پیدا نہیں ہوسکتا، جو خود اِس شعر کے پڑھنے میں ہوتا ہے ؎

نامہ بر میں جانتا ہوں پر بتا سکتا نہیں دل میں ہے لب تک نہیں آتا نشانِ کوئے دوست

اِس شعر کے دونوں مصرعے صنعتِ ابہام سے معمور ہیں۔ "بتا سکتا نہیں" اور "لب تک نہیں آتا نشانِ کوئے دوست"۔ علاوہ پہلوئے رشک کے ایک خاص معنی اِس شعر کے یہ ہیں کہ معشوقِ حقیقی کا مقام اگر متعین کر دیا تو اُس کی ذات محدود ہو جاتی ہے ؎

آئینہ کی آنکھ سے لڑتی ہے جب عاشق کی آنکھ چاہتی ہے چھین لے لذت ترے دیدار کی

اِس قدر صاف کہ سہل ممتنع اور اِسقدر نیا کہ آج تک یہ مضمون نظر سے نہیں گذرا۔ بلاغت اِسمیں یہ ہے کہ آئینہ بے روح ہے اور چشمِ عاشق ذی روح۔ اس کے دیدار کی لذت اِسقدر موثر ہے کہ آئینہ جب اپنے آپ میں وہ کیفیت نہیں پاتا تو زبانِ حال سے لذتِ دیدار چشمِ عاشق سے طلب کرتا ہے۔

حضرت امیر شمع اور آئینہ کے مضامین میں اپنا مثل و نظیر نہ رکھتے تھے۔ اِسی رنگ میں ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ یہ شعر اگرچہ نیا نہیں کیونکہ مولانائے رومؒ فرما گئے ہیں ؏

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من

مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جس تبدیلی سے اِس شعر میں جدت پیدا کی گئی ہے، وہ تبدیلی کسقدر ضروری اور زمانۂ حال کے مطابق ہے ؎

آئینہ ہوں میں شاید جو دیکھتا ہے مجھکو ہندو ہو یا مسلمان اپنا سا جانتا ہے

اس شعر میں مصرعہ اولیٰ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تشبیہ مولاناؒ کے شعر میں نہیں ہے۔ میں مثل آئینہ ہوں جو مجھے دیکھتا ہے اپنا سا سمجھتا ہے۔

افسانۂ سنگ و تیشہ ہے اور یاں صحبتِ ناخن و جگر ہے

جسقدر فصیح ہے اُسی قدر بلیغ - فرہاد کا مشغلہ تیشہ زنی و کوہ کنی - یہاں جگر کاوی اور ناخنِ غم سے خراشش ہے - وہاں پہاڑ پر تیشہ زنی ہوتی تھی - یہاں اپنے ہی جگر پر - ظاہر ہے کہ اِس دلخراشی کا اثر کسقدر جانکاہ ہے - محاکات - بلاغت - رفعت - جدت و وسعتِ تخیل کی ہزاروں مثالیں آپ کے کلام میں موجود ہیں - آپ نے غزل میں سادہ و سلیس و دلکش مضامین کو سجانے کیساتھ بلیغ و نادر خیالات جدت و ندرت کے ساتھ نرالے انداز میں نظم کرکے ثابت کر دیا ہے کہ ایک قادر الکلام شاعر محض حُسن و عشق کی معاملہ بندی تک ہی اِس وسیع دائرہ کو محدود نہیں رکھتا بلکہ رفیع خیالات اور اعلیٰ جذبات - ندرتِ اسلوب اور جدتِ تراکیب سے ادا کرکے غزل کی نرالی شان پیدا کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو - فرماتے ہیں ؎

ایک جا رہے ہمیشہ مگر مثل رنگ و بو ہم سے نہ وہ ملے نہ کبھی اُن سے ہم ملے

اِس شعر کو جدت نے بہت بلند کر دیا ہے - اِسی چمنِ دہر میں معشوق بھی ہے اور عاشق بھی مگر دونوں اِسی طرح الگ الگ رہے جس طرح رنگ و بو - ہر چند کہ دونوں ایک ہی گلستان میں رہتے سہتے ہیں مگر اِس تفرقہ کی مثال رنگ و بو سے - اِسے سوائے الہام کے اور کیا کہا جائے - اِس شعر کی تشبیہ و تمثیل تعریف سے مستغنی ہے ؎

تیز یوں دِل ترے کوچہ کی طرف جاتا ہے جس طرح تیر کوئی سوئے ہدف جاتا ہے

بعض اشعار اِسی رنگ سہل ممتنع میں ایسے ہیں کہ معنوی نزاکتیں اور عمق تو کم ہے مگر وسعت زیادہ ہے جس طرح ایک سمندر زیادہ گہرا تو نہ ہو مگر پاٹ اِسقدر چوڑا ہو کہ ساحل نظر نہ آئے ؎

امید جواب کی ہو کیا خاک جب اِس سے نہ ہو سوال ممکن

علاوہ محاکات کے معشوق کے وقار کا ایک کوہستان اِس شعر سے نظر کے سامنے آجاتا ہے اِس شعر کے معنی میں یہ مفہوم بہت وسیع ہے کہ رعب و اقبال - ناز و تمکین اور نہ معلوم کتنی صفات معشوق سوال کو مانع ہیں - محاکات کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو ؎

کرتے ہیں جو لوگ ذکر اُن کا ایک ایک کا منہ میں دیکھتا ہوں

اِس سے عمدہ اور بہتر محاکات کی کیا مثال ہو سکتی ہے - ایسے اشعار جن میں مضامین نئے ہوں یا تشبیہیں جدید ہوں اور صفائی و وضاحت سے نظم ہوں - انتہائی قادر الکلامی اور مشق کا نتیجہ ہیں - ایسے اشعار بھی سہل ممتنع کم نہیں ہوتے - حضرت امیر کی قادر الکلامی ہر ہر قدم پر سر اٹھا اٹھا کر

کہتی ہے ؎

کیا تعجب ہوا آنکھوں نے اگر جان لیا　　دل نے دیکھا نہیں اس پر تجھے پہچان لیا

جدت و ندرت ملاحظہ ہو ؎

رو سیاہ جرم الفت بے قصور آیا نظر　　سطرِ قرآں کی طرح ظلمت میں نور آیا نظر

کیا بے مثل ثبوت ظلمت میں نور کا دیا ہے۔ سطرِ قرآں ایک الہامی تشبیہہ ہے ؎

دونوں ہیں اُدھر ہی سے گر فرق ہے تو اتنا　　تقدیر بنا دی ہے تدبیر بتا دی ہے

اِس مطلع کی وسعت بھی دیکھنے کے قابل ہے ؎

تو وہ بت ہے کہ تجھے ساری خدائی چاہے　　بندہ اللہ سے کس کس کی برائی چاہے

سہل ممتنع اور جدتِ مضامین سے بھی زیادہ مرتبہ اگر کسی نوعیت کا ہو سکتا ہے تو وہ تاثیر کا۔ فی ا
جس شاعر کے کلام میں اثر نہیں ہے۔ اس کا جسم شعر بے روح ہے۔ حضرت امیر کے یہاں ایسے
اشعار موجود ہیں۔ جو تاثیر و تاثر کی روح و جان ہیں۔ چند شعر بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں

ہونٹوں پہ دم ہے لیکن دل میں یہی ہے حسرت　　دو حرف اُن کے مُنھ کے سُن لیتے ہم کسی سے

پنہاں جو سوزِ عشق کرے مرد ہے وہی　　دل گو بھک گیا نفس سرد ہے وہی

میر کا شعر بھی اِسی رنگ اور اسی مضمون کا ہے ؎

عاشق ہیں ہم تو میر کے اِس ضبطِ عشق کے　　دِل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

دونوں کا امتیاز اور مطلع و شعر کا فرق اظہار سے مستغنی ہے ؎

اپنی کہو گذرتی ہے کس طرح اے امیر　　ہم ہیں فقیر لوگ ہماری بھلی کہی

لہو رو، آنسوؤں کا قحط اگر ہے　　اسی دِن کے لئے خونِ جگر ہے

حضرت میر کا ایک شعر مشہور ہے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے　(میر)

اِس پر سودا نے کہا کہ میر کی دایہ نے میر کو سُلا دیا تھا۔ اور سودا نے اِس مضمون کو یوں ادا ک

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت　　خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اِس پر اُس سے زیادہ اعتراض ہوتا ہے کہ سودا کا دماغ اِسقدر بھدا تھا کہ شورِ قیامت
آنکھ نہ کھلی، اور "خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے"۔ مفتی صاحب نے بھی کہا ہے ؎

شورِ محشر امیر کو نہ جگا　　سو گیا ہے غریب سونے دو

اس میں یہ گنجایش باقی ہے کہ ابھی شور اٹھا نہیں ہے مگر سوداؔ تو یہ کہتے ہیں کہ ع

سوداؔ کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت

اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

اِس کی پروا کچھ نہیں تکلیف یا آرام ہے — اے غمِ جاناں مجھے تیری خوشی سے کام ہے

بے سبب نالاں نہیں میں یار کے در پر امیرؔ — آشنا کرتا ہوں اس کو درد کی آواز سے

تیرے وعدے پہ شاد ہوں کیونکر — اپنی قسمت کو جانتا ہوں میں

اے عمرِ رفتہ کہدے یارانِ رفتہ سے تو — بچھڑے ہوئے تمھارے تمکو پکارتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت امیرؔ کی قادر الکلامی کا پایہ کیا تھا۔ اور زبان کی چاشنی کے ساتھ بلندئ جذبات و رفعتِ خیال کے اظہار پر انھیں کس درجہ قدرت حاصل تھی۔ امیر الکلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اُنھوں نے تنوع و رفعت و ندرت وجدت پیدا کر کے شانِ قادر الکلامی کا اظہار کیا اور درجۂ امتیاز حاصل کر کے صفِ معاصرین میں سب سے اوّل رہے۔

حضرت امیرؔ نے اسرارِ علیہ و محسوسانہ، حکیمانہ کو ایسے لطیف اور سلیس پیرایہ میں غزل کے رنگ میں سمویا ہے کہ سبحان اللہ! دو چار شعر تفنن طبع کے لئے ملاحظہ ہوں ؎

لاش پہ عبرت یہ کہتی ہے امیرؔ — آئے تھے دُنیا میں اِس دن کیلئے

کُلّ من علیہا فان کی مکمل تشریح دو مصرعوں میں ہوگئی ؎

زبان ضعفِ پیری میں جلتی رہی — سحر ہو گئی شمع جلتی رہی

عالمِ پیری کی تصویر کس انداز میں کھینچ دی ہے ؎

لذتِ شرمِ گنہ تھی کب فرشتوں کو نصیب — یہ مزا چکھنے کو پیدا خلق میں آدم ہوا

فطرتِ عاصی کا گناہوں پر شرمندہ ہونا اور رحمتِ غفور کا جوش میں آنا عید گنہگار کے لئے ایسی ناقابل بیان کیفیت ہے جو صرف انسان کو ہی نصیب ہوئی۔ ملائک بھی اِس "لذت" سے محروم رہے۔ رشکِ ندامت کا رتبہ کسقدر بلند ہوا ہے۔ سبحان اللہ۔

غرض حضرت امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی اُن چند شعراء میں ہیں، جن کا رنگِ تغزل ہمیشہ قائم رہے گا۔

اِندر دیوتا

(ترجمہ از مقبول حسین احمد پوری [redacted])

(یہ نظم رگ وید کی ایک حمد کا ترجمہ ہے جس کو مشہور مورخ رومیش دت نے انگریزی میں بہ عنوان "Hymn to Indra" نظم کیا ہے۔ اب ہمارے کرم فرما سید مقبول حسین صاحب احمد پوری نے قدرے تصرف کے ساتھ اس کا ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس نظم میں قدیم آریہ قوم کے مذہبی عقائد اور اُن کے جذبات کی کچھ جھلک نظر آتی ہے۔ ا-ز)

اِندر دیو کی شکتی پربل ~~~~ ٹیپ
راج ہے اُس کا بادل بادل

۱

سب سے بلند اور سب سے اعلیٰ ~~~~ تخت ہے اُس کا بادل کالا
سب سے زیادہ قوت اُس کی ~~~~ سب کے دلوں میں عظمت اُس کی
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۲

پربت اور پہاڑ بنایا ~~~~ ہلتی دھرتی کو ٹھہرایا
نیلا نیلا گنبد اوپر ~~~~ چار طرف سے صاف برابر
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۳

اَندر اُس کا باہر اُس کا ~~~~ ندی اُس کی ساگر اُس کا
بجلی اُس کے اشاروں میں ہے ~~~~ سورج عہدہ داروں میں ہے
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۴)

گائے بنائی دُودھ پلایا بیل بنا کے رتھ کو چلایا
گھوڑا اُس کا اُسی کا ہاتھی وہی لڑائی میں بھی ساتھی
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۵)

بستی اور بیاباں اُس کے کھیت پہاڑ اور میداں اُس کے
اُسکی دیا سے بادل چھائے جل تھل ساگر اُس نے بنائے
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۶)

ورترا سے پانی برسایا داسوں کا ابھمان مٹایا
ہے اُس کا ہتھیار نرالا جی لیوا ہے اُس کا بھالا
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۷)

سنکھ میں ہے آواز اُسی کی تیر میں ہے پرواز اُسی کی
اُس کا قابو سب کے اُوپر ہے وہ سب کے اندر باہر
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

(۸)

داسوں کو دھرتی سے مٹایا آریہ لوگوں کو پھیلایا
ہے نیکوں کا وہی سہارا اُسی نے روہن کو بھی مارا
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۹

وَیدک گیان ہے اُس کا گانا — سوما رس[^سوم رس] اُس کا نذرانہ
اُوشا اُس کی پریم سہیلی — سب اُس سے نرالی اور البیلی
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۱۰

راجہ پرجا اُس کے پُجاری — ہم اور تم سب اُس کے بھکاری
یہ نہ سمجھنا اِندر نہیں ہے — اُسی کی چھایا ساری زمیں ہے
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۱۱

دھرتی اور آکاس کا مالک — سب کے دل کی آس کا مالک
مَنتر[1] پڑھو توصیف میں اُسکی — گاؤ بھجن تعریف میں اُس کی
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

جذباتِ منوّر

از حضرت منوّر لکھنوی

مرے اشکوں کی طغیانی سلامت — اِسی دریا میں بہنا چاہتا ہوں
جگر میں گو سکت اتنی نہیں ہے — مگر ہر چوٹ سہنا چاہتا ہوں
بہت ہوتی ہے خاموشی سے اُلجھن — مگر خاموش رہنا چاہتا ہوں
ہے کچھ ایسی ہی میرے دل کی بیتی — کہ تنہائی میں کہنا چاہتا ہوں

[1] مَنتر نہ کہ مَنتر۔ اصل سنسکرت تلفّظ یعنی "م" متحرک اور باقی سب حروف ساکن۔

[^سوم رس]: سوم رس (interlinear gloss above سوما رس)

پسِ پردہ

از ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ صاحب

منورما کے والد لالہ کشن چند تھے لیکن ماں کا نام کسی کو وثوق کے ساتھ معلوم نہ تھا۔ اس قسم کی باتوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں نے البتہ بڑی چھان بین کے بعد پتہ لگا لیا تھا کہ اس کی ماں کا نام کملا تھا۔ لالہ کشن چند اور کملا میں دلی محبت کے علاوہ بظاہر کوئی باقاعدہ رشتہ نہ تھا، اور منورما اس محبت کی یادگار تھی۔

لالہ کشن چند نے منورما کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ختم کرنے کے بعد وہ اسکول میں داخل ہوئی۔ لالہ جی خود اُس کو بڑی توجہ کیساتھ دو گھنٹے روزانہ پڑھاتے تھے۔ اپنے کلاس میں ہمیشہ اول آنیکا سہرا منورما ہی کے سر رہتا تھا۔ اُس کو موسیقی سے بھی دلی لگاؤ تھا، چنانچہ شہر کے سب سے بڑے اُستاد جی لالہ جی کی نگرانی میں اُس کو گانے بجانے کی تعلیم دیتے تھے۔

کالج میں پہونچتے ہی منورما کے حسنِ خداداد نے وہاں کی فضا میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ درجنوں ٹی پارٹیوں کے کارڈ اُسے روزانہ موصول ہوتے تھے اور بعض حضرات کو تو منورما کے جوابی خط کا تصور ہی دل خوش کُن ہوتا تھا۔ لیکن ستم ظریف منورما لالہ جی کی طرف سے پوری آزادی ملنے پر بھی ان دعوتوں میں کبھی نہ شریک ہوتی تھی اور شکریہ کے طور پر کسی کو دو سطر لکھنا بھی اُسے گوارا نہ تھا۔

اس شعلۂ حسن کا طواف کرنیوالے پروانوں میں ڈاکٹر جھا کا نام نامی خاص طور پر قابلِ ذکر تھا۔ ڈاکٹر جھا ایک شکیل، خوش قامت نوجوان تھے جو ولایت سے لٹریچر کے ڈاکٹر ہو کر آئے تھے، اور مقامی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے شاخ کے بجائے جڑ ہی پکڑنا مناسب سمجھا۔ لالہ کشن چند سے ایک پکچر ہاؤس میں اُن کا رسمی تعارف ہوا۔ انھوں نے اپنی حسنِ لیاقت کی بدولت لالہ جی پر وہ سکہ جمایا کہ رشتۂ اتحاد روز بروز مضبوط ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ ڈاکٹر نے اپنی محبت کا ایسا گہرا نقش جمایا کہ اگر کبھی اتفاقاً وہ کشن چند کے یہاں نہ جاتے تو لالہ جی فوراً اپنی کار بھیجتے اور آدمی پر آدمی دوڑاتے۔ وہ منورما کی شادی سے بے نیاز ہو گئے تھے

منورما ڈاکٹر کی طرف خاص طور پر متوجہ ہو گئی۔ اُن کے جاتے ہی وہ ایک کمی محسوس کرنے لگتی جو دوسری طرح پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ وہ ڈاکٹر سے کھُل کر ملتی تھی کیونکہ اُسے اپنانے کے لئے انھوں نے مناسب طریقہ پر سلسلہ جنبانی کی تھی۔

ایک دن موقع مناسب سمجھ کر لالہ کشن چند نے اپنے مختصر حالات ڈاکٹر سے بیان کئے اور زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

گرمی کے دن تھے۔ ڈاکٹر جھا اپنا بہترین سوٹ پہن کر آئے تھے۔ بی۔ اے۔ پاس ہونے کی خوشی میں آج منورما نے اُن کو دعوت دی تھی۔

لالہ کشن چند نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "آ گئے بیٹا۔ منورما نے تو بی۔ اے پاس کر لیا نہ؟ اخبار میں نام نکلا ہے۔"

"جی ہاں"۔ ڈاکٹر نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ "مبارکباد عرض کرتا ہوں۔ غالباً اسی خوشی میں چائے پی رہا ہوں"۔

"بیٹھو۔ ابھی مٹھائی منگاتا ہوں۔ آج کا دن بڑا مبارک ہے، میں اپنی منورما کو تمہیں سونپتا ہوں۔ اسے قبول کرو"۔ کہتے ہوئے لالہ کشن چند نے بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر ڈاکٹر کے ہاتھوں میں دیدیا۔

ڈاکٹر کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھِل اُٹھا۔ اُس نے آہستہ سے منورما کا ہاتھ دبا دیا۔ اور منورما نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

دوسرے دن لالہ جی نے بنگلہ خالی کر دیا۔ ڈاکٹر جھا اور منورما ایک ساتھ رہنے لگے۔

محبت ریگستان کا آدھ کھلا پھول ہے۔ عورت اپنے دامن سے اُسے ہوا دیتی ہے اور مرد اُس کی جڑ میں جوانی کا رس ٹپکاتا ہے۔ پھول رات کے بھیانک سنّاٹے میں کھِل اُٹھتا ہے۔ مگر آنکھ کھلتے ہی پچھلے پہر کی دلچسپیوں کو ختم ہوتے دیکھ کر بے اختیار چلاتا ہے۔ "پیاری دُنیا تو اپنی رنگینیوں کو اتنی جلدی نہ سمیٹ، میں نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہے"۔ ٹوٹنے والا تارا اُس کے بھولے پن پر ہنستا ہوا دُنیا کی بے ثباتی ظاہر کرتا ہے۔ پھول دم بخود ہو کر نکلتے ہوئے سورج کو حسرت کے ساتھ دیکھتا ہے اور دُنیا کی نیرنگی میں محو ہو جاتا ہے۔ یکایک مرد کی ظالم نگاہ دھوپ میں چمکنے والے پھول پر پڑتی ہے اور اُس کو وہ صرف اپنی ریاضت کا پھل سمجھ کر بیدردی کے ساتھ شاخ سے جُدا کر لیتا ہے۔ عورت ہاتھ ملتی رہ جاتی ہے۔ پھول کی رنگینی ختم ہوتے ہی مرد اُسے مٹی میں ملنے کے لئے پھینک دیتا ہے۔

جب تک چڑیا اونچی ڈالیوں پر پھدکتی رہتی ہے، صیّاد اچھا سے اچھا دانہ اور صاف سے صاف پانی چمکدار پیالیوں میں اُس کے سامنے رکھتا ہے۔ مگر پنجرے کی چڑیا کو وہ دانہ پانی نہیں ملتا۔ "اختیار" فرض کے احساس کو دل سے یکقلم محو کر کے ہمیں ظلم و ستم کی تعلیم دیتا ہے۔ ہم مظلوم کے ساتھ اگر کبھی انصاف سے

پیش آتے ہیں تو اُسے "رحمدلی" سے منسوب کرتے ہیں۔

رفتہ رفتہ ڈاکٹر جھا منورما سے کھنچنے لگے۔ اُن کو اس بات کا غرور تھا کہ اگر وہ منورما کا ہاتھ نہ پکڑتے، تو وہ یقیناً تحت الثریٰ کو پہونچ گئی ہوتی۔ منورما بڑی دریادلی سے اُن کے اس احسان کو مانتی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس احسان کو بھی فراموش نہ کر سکتی تھی جو اُس نے ڈاکٹر جھا کو اپنا شوہر منتخب کر کے اُن پر کیا تھا۔ مگر ابھی تک یہ نوک جھوک پردے ہی پردے میں ہوا کرتی تھی۔

ایک دن ڈاکٹر جھا معمول سے زیادہ رات گئے گھر لَوٹے۔ منورما چپ رہی۔ دوسرے اور تیسرے دن پھر وہی پروگرام دُہرایا گیا۔ منورما زہر کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ چوتھے دن ڈاکٹر نے بیوی کی بے اعتنائی کا خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور رات بھر غائب رہے۔ منورما نے پھاٹک بند کرا دیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر دو مرتبہ آ کر لوٹ گئے۔ لیکن جب کالج جانے کا وقت قریب ہوا تو ناچار آواز دی۔ بیسیوں آواز کے بعد پھاٹک کھلا

ڈاکٹر نے جھلا کر کہا۔ "کیا کان میں روئی ٹھونس رکھی تھی؟ دو مرتبے چلا کر لوٹ گیا۔"

"میں نے تھوڑے ہی کہا تھا کہ لوٹ جاؤ"

"مجھ سے بے سر پیر کی باتیں نہ کیا کرو۔ میں کہے دیتا ہوں"

"مجھ سے کوئی نہ بولے۔ میں آپ ہی چپ رہوں گی"

بات بڑھتی گئی ڈاکٹر اپنے دل کی تمام قوتیں اکٹھا کر کے زوروں سے حملہ کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ منورما مرعوب ہو کر چپ ہو جائے مگر منورما ایک چھوٹا سا فقرہ چُست کر کے الگ ہو جاتی تھی۔ آخر کار ڈاکٹر نے گرج کر کہا۔ "ابھی یہاں سے نکل جاؤ"

"یہ بنگلہ میرے باپ کا ہے۔ میں اپنے ہی گھر میں ہوں کسی غیر کے یہاں نہیں" منورما نے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہی یہاں سے چلا جاؤں"

"یہ کہنے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ میں عورت ہوں"

ڈاکٹر نے اپنے احسان گنائے۔ جواب میں منورما نے اپنے احسانات کی طولانی فہرست پیش کر دی۔ ڈاکٹر میں اگر غیرت ہوتی تو وہ ہاتھ بڑھا کر بیوی سے صلح کی درخواست کر لیتا لیکن ایک ہندوستانی شوہر کے لئے بیوی کی بات برداشت کرنا خلاف مصلحت بلکہ شاید مہلک ہوتا ہے۔ وہ کیوں کسی کی بات گوارا کرے، خصوصاً جب وہ ایک دو نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بیبیوں کا شوہر بن سکتا ہو۔ رہی عورت، وہ تو اُس کے پیر کی جوتی ہے۔ جب جی چاہا اُتار کر ایک کونے میں سڑنے کیلئے ڈالدی۔ جوتی کی کیا مجال کہ سر اُٹھائے۔

ڈاکٹر جھا کالج سے لوٹ کر گھر نہ گئے۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ منورما بیتابی کے ساتھ ڈاکٹر کا انتظار کر رہی تھی۔ دِل بہلانے کے لئے وہ ایک ضخیم ناول کے صفحات اُلٹ رہی تھی۔ وہ لیمپ بجھا کر سونے ہی والی تھی کہ ایک موٹر کمپاونڈ میں داخل ہوئی۔ اُس سے ایک خوش قطع نوجوان اُتر کر منورما کے کمرہ کی طرف بڑھا۔

منورما نے نوجوان کا پُر تپاک استقبال کیا۔ یہ ڈاکٹر جھا کے ہم پیشہ اور کوچہ حُسن کے کامیاب رقیب بمل بابو تھے۔ بمل بابو کو ہوائے شوق کوئے جاناں کی طرف اُڑا لائی تھی۔ خوش قسمتی سے دربان نہ تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اپنا ایک منٹ بھی ضائع نہ کرنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے منورما سے پوچھا۔

"کہئے ہیں تو آپ اچھی طرح؟ آج مسٹر جھا نہیں دکھلائی دیتے، کہاں گئے ہوئے ہیں؟"

منورما۔ "جہاں اُنکی طبیعت ہوگی۔"

"یہ آپ کیا فرماتی ہیں؟ میں نے تو اکثر اُنھیں کی زبانی سُنا ہے کہ آپ اُن کو باندھے رکھتی ہیں، اور کالج کے علاوہ کہیں آنے جانے نہیں دیتیں۔"

"اب وہ آزاد ہیں۔"

"کب سے؟"

"آج سے۔"

پرفیسر بمل چُپ ہو گئے۔ جو افواہ اُنھوں نے سُنی تھی اُس کی تائید ہو گئی۔ زیادہ دیر تک ٹھہرنا خلاف مصلحت تھا۔ اب وہ ڈاکٹر جھا سے مِلکر اس کی تصدیق کرنا اور دیکھنا چاہتے تھے کہ میاں بیوی میں ملاپ کی گنجائش ہے یا نہیں۔ بڑے انتظار کے بعد یہ دن آیا تھا۔ اسکا ایک لمحہ بھی وہ ضائع نہ کرنا چاہتے تھے۔ منورما کو ڈاکٹر جھا کی طرف سے بدظن کرنیکے لئے اُنھوں نے کہا۔ "اچھا تو پھر وہ مس کھنّا کے یہاں گئے ہونگے۔ مجھے اُن سے ایک ضروری کام ہے۔ اجازت دیجئے۔ آپ کو تو مذاق سُوجھا ہے۔ خیر کسی فرصت کے دِن آؤں، تو یہ آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔" پروفیسر بمل چلے گئے۔

منورما سمجھ گئی کہ یہ مس کھنّا کون سی بلا ہیں۔ لیکن اُس سے یہ بھی پوشیدہ نہ رہا کہ پروفیسر بمل کس لئے آئے تھے۔ اُس نے چپراسی کو بُلا کو کہا۔ "اس آدمی کی موٹر آج سے کبھی کمپاونڈ میں نہ داخل ہو اور جب وہ میری نسبت پوچھے تو کہدینا کہ "میم صاحبہ" نہیں ہیں۔

منورما کچھ دیر تک ناول کے صفحے اِدھر اُدھر اُلٹتی رہی، لیکن درحقیقت وہ ڈاکٹر جھا کے دِل کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی کہ اسمیں منورما کے خلاف کہاں تک میل یا کدورت آگئی ہے۔

سوچتے سوچتے اور آہیں بھرتے بھرتے اُسے نیند آگئی۔

کمرہ کا لیمپ بجھ گیا۔

موسم بہار کی سہانی رات، تاروں کی مدہم روشنی، درختوں کی نرم پتیوں میں ہوا کا تالی بجانا۔ آم کے بور اور کٹہل کے نازک پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہر ذی روح کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ مگر منورما کا اُداس دل ان دلچسپ مناظر کی طرف سے آنکھیں بند کئے اپنے زخم پر مرہم رکھ رہا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر اُس نے ایک آہ بھری۔ تارے کانپنے لگے۔

"دُنیا کیسا رنگ بدلتی ہے۔ حسین بنکر دل لبھاتی ہے مگر ناگن بنکر ڈستی ہے۔ زمانہ کا فریب کتنا خوبصورت ہے۔ اُس کے دھوکے میں گرفتار ہونے والی عورت کتنی معصوم ہوتی ہے۔ لیکن اپنے کو سب سے بڑا عقلمند سمجھنے والا مرد اُس سے کیا کچھ حاصل کرتا ہے۔ عورت انمول جواہرات کا خزانہ ہے۔ وہ مرد سے کوئی دلخوش کُن وعدہ نہیں کرتی مگر اپنا سب کچھ اُس کی نذر کر دیتی ہے۔ بدنصیب مرد اُس کے حسن کی دولت کو لوٹ کر نشہ میں آنکھیں بند کئے ہوئے بھاگتا ہے۔ اُس شرابی کی طرح جو بدمست ہونیکے بعد دُنیا کی کسی نعمت کی پروا نہیں کرتا اور گندی نالیوں میں لڑھکنے کے لئے ہمدردوں کی گرفت سے اپنے کو چھڑا کر بے تحاشہ اِدھر اُدھر دوڑتا ہے۔ ضبط کر کے بیٹھ رہنے والی عورت کا تو کچھ نہیں بگڑتا لیکن مرد برباد ہو جاتا ہے اور اپنی کرنی کا پھل پاتا ہے۔"

دل کے اُمنڈے ہوئے طوفان نے منورما کو اس سے زیادہ سوچنے کا موقعہ نہ دیا۔ نیند نے اُس کیلئے اپنی آغوش وا کر دی۔

چاند کالے بادلوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ آسمان کے تارے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیل گیا۔ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

ایک دوشیزہ ایک دریائے بے پایاں کے کنارے کھڑی ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے فضا کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔ رہ رہ کر بجلی چمک اٹھتی تھی، جس کی روشنی میں دریائی موجیں مُنھ پھیلائے اپنے شکار کی طرف جھپٹتی نظر آتی تھیں۔ جنگلی جانوروں کی آواز بازگشت نے وادی کو اور بھی وحشتناک بنا دیا تھا۔

دوشیزہ نے آخری مرتبہ دُعا کے لئے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے۔ یکایک زور کی بجلی کڑکی اور دھماکے کے ساتھ دوزخ کے دروازے کُھل گئے۔ ایک نوجوان ہاتھ میں مشعل لئے اُس کی طرف آتا دکھلائی پڑا۔

نزدیک آکر اُس نے سہمی ہوئی دوشیزہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

آسمان کی قندیلیں روشن ہوگئیں اور چاروں طرف اُجالا پھیل گیا۔ موجوں کا تلاطم پُرکیف نغموں میں تبدیل ہوگیا۔

فرطِ مسرت سے دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے دریا کی طرف بڑھے، جہاں سے ابدی سرور کے نغمے پیدا ہوکر ہوا میں گونج رہے تھے۔ نوجوان شرابِ حُسن سے مخمور ہو رہا تھا۔ اُس نے بیتاب ہوکر دوشیزہ کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ دوشیزہ نے وارفتگی کے عالم میں نوجوان کو دونوں ہاتھوں سے کس کر باندھ لیا۔

منورما کے کمرے میں زور کا دھماکا ہوا اور اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس کے سینے پر ایک ضخیم ناول تھا جس کو وہ دونوں ہاتھوں سے دبائے تھی۔

سامنے میز پر شاید کسی چوہے کو پکڑنے کیلئے بلّی کودی تھی، جس سے کئی کتابیں گر پڑیں۔ کمرے کا لیمپ تیل نہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی بُجھ چکا تھا۔ بہرحال بے چینی نے منورما کو سونے نہ دیا۔ ڈاکٹر جھا صبح کیوقت بھی نہ آئے۔ یہاں تک کہ انتظار کرتے کرتے پھر شام ہو چلی۔

اِس وقت منورما کے سامنے تین صورتیں تھیں۔ پہلی صورت تو یہ تھی کہ وہ چپ چاپ کہیں نکلجائے اور شکم پروری کا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈھ لے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ پروفیسر بمل سے بیاہ کرکے ڈاکٹر جھا کی چھاتی پر مونگ دلے، اور اُن کو دکھلادے کہ میں تمہارے رحم وکرم پر نہیں ہوں۔ انکے علاوہ لالہ کشن چند کو خاوند کے سیاہ کرتوت سے آگاہ کرکے اُن کے سایہ میں بھی پناہ لے سکتی تھی۔ لیکن وہ کسی نتیجہ پر پہونچ نہ سکتی تھی۔ پہلا راستہ گھوم پھر کر اُسی پر مہیب وادی کی طرف جاتا تھا۔ جس سے ڈاکٹر جھا نے اُسکو نکالا تھا۔ دوسرے راستے پر رسوائی کے کانٹے تھے جنکی طرف دیکھتے ہی اُس کا دل کانپ جاتا تھا۔ آخری صورت کسی قدر تسلی بخش تھی مگر اُس پر عمل کرنے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہونے کی اُمید نہ تھی۔ لالہ کشن چند اسوقت تیرتھوں کا گشت لگا رہے تھے۔ اِس لئے اُن کو پریشان کرنا مناسب نہ تھا۔ اب منورما کو محسوس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر کو اُس نے ناحق ناراض کردیا۔ لیکن اپنا کوئی قصور نہ دیکھکر اُن سے معافی مانگتے ہوئے بھی اُسکی زبان بند ہوتی تھی۔ اُس کے نزدیک معافی مانگنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ ڈاکٹر کو رات رات بھر گھر سے غائب رہنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ بالآخر اُس نے اس سلسلے میں مس کملتا کے والد ہی سے ملنے کا ارادہ کیا۔

منورما نے عجلت سے کام لینا مناسب نہ سمجھ کر دو دن تک ڈاکٹر جھا کا مزید انتظار کیا۔ تیسرے دن دوپہر کو وہ پیدل ہی مسٹر کھنا کے بنگلہ پر گئی۔ مسٹر کھنا ریٹائرڈ انجینیر تھے۔ اُن کا بنگلہ کچھ زیادہ دُور نہ تھا۔ اسوقت اتفاق سے وہ گھر ہی پر تشریف رکھتے تھے۔ منورما کے آتے ہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑی شگفتگی سے بولے۔

"کہیئے کیا خدمت ہے؟"

منورما آنے کو تو چلی آئی تھی، لیکن وہ کسی سوال وجواب کے لئے تیار نہ تھی۔ مگر اُس کو کہنا ہی پڑا:-

"کچھ نہیں، یونہی ذرا ڈاکٹر جھا سے کچھ کہنا تھا۔ سُنا ہے کہ وہ آجکل یہیں تشریف رکھتے ہیں"

"ہاں وہ تو یہاں گذشتہ چھ سات مہینوں سے آتا ہے۔ اُس کے لئے یہ بنگلہ خانۂ بے تکلف ہے، آپ ڈاکٹر جھا کو کس طرح جانتی ہیں، کیا آپ تعلیم پا رہی ہیں؟"

"جی نہیں۔ یونہی جانتی ہوں"

"کیا وہ آپ کے عزیز ہیں؟"

"تھے مگر اب نہیں ہیں"

ایک جوان عورت کا عزیز ایک نوجوان آدمی تھا مگر اب نہیں ہے، مسٹر کھنا کے کان کھڑے ہو گئے، "تھے مگر اب نہیں ہیں" اِس کا مطلب حرف بحرف اُن کی سمجھ میں آگیا۔ مگر اسوقت وہ دماغی پریشانی کی اُس کیفیت میں مبتلا تھے جب انسان سُننے پر بھی مزید اطمینان کے لئے ایک مرتبہ وہی بات پھر سُننا چاہتا ہے اُنھوں نے کہا "آپ کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا؟"

"میرا مطلب بالکل وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں" منورما نے کہا "ہاں اگر سمجھ کر نہ سمجھنا چاہتے ہوں تو میں نہیں کہہ سکتی"

"اچھا ذرا معاف کیجئے میں اپنا خاص کمرہ کھول لوں، تو آپ کے ساتھ اطمینان سے باتیں کروں"

مسٹر کھنا نے اپنا کمرہ کھولا۔ آرام کرسی کے نزدیک اٹھا کر ایک گدی دار کرسی رکھی اور کہا "آیئے"

منورما کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا "وہ میں سمجھ تو گیا لیکن اگر بالفرض میں نے بدقسمتی سے غلط سمجھ رکھا ہو، تو آپ میری زبان سے وہ بات سُنکر ناراض ہونگی۔ اسی لئے اسکے متعلق ساری باتیں آپ ہی سے سُننا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کل واقعات بلاکم وکاست بیان کردیں، تو میں جرح کرنے کی زحمت سے بچ جاؤں، اور آپ کو پریشانی نہ ہو اور اُس کے ساتھ ہی وقت بھی ضائع نہ ہو"

منورما نے سارا حال صاف صاف کہدیا۔ مسٹر کھنا نے کہا "بیٹی تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ کل ذرا تم شام کو ٹھیک پانچ بجے چلا آنا۔ تم کو یہاں سات بجے تک رہنا پڑیگا۔ کا [illegible] تم سے کہا [illegible] ساتھ کر [illegible] لگا"

منورما نکلنے ہی والی تھی کہ مسٹر کھنّا نے پوچھا "اور ہاں بیٹی تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام منورما ہے۔ میں لالہ کشن چند کی لڑکی ہوں۔ شاید آپ اُن سے واقف ہونگے"

"مسٹر کھنّا نے اپنی عدم واقفیت پر شرمندہ ہوتے ہوئے کہا "خیر میں اِس شہر میں نووارد ہوں، ورنہ ضرور جانتا۔ تم کل ٹھیک ٹائیم پر چلی آنا بیٹی، دیر نہ ہو"

منورما نے گھر پہونچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ راستے میں اُسے اس بات کا کھٹکا تھا کہ کہیں شوہر سے اُس کی ملاقات نہ ہو جائے۔

مسٹر کھنّا عجیب اُلجھن میں پڑے تھے کہ کیا کیا جائے۔ پہلی مرتبہ نئی تہذیب کے چند پجاریوں کے بہکانے پر اُنھوں نے سماج کے قیود کو توڑ کر ذات باہر شادی کرنیکی ٹھانی اور پہلی ہی مرتبہ ٹھوکر کھاتے کھاتے بچے،

مسٹر کھنّا نے سب کچھ طے کر لیا تھا۔ مس کھنّا کو آج ڈاکٹر سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ ڈاکٹر جھا کو گذشتہ دن شادی کا پیغام مل چکا تھا۔ وہ اپنا بہترین سوٹ پہنکر آئے تھے۔ منورما کو حکم ملا تھا کہ وہ چپ چاپ ایک کمرہ میں بیٹھی رہے، کسی سے کچھ نہ بولے۔

مس کھنّا لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہ سمجھ سکتی تھیں کہ پاپا نے آج ایسا حکم کیوں دیا ہے۔ ڈاکٹر کی شادی مئی کی آخری تاریخوں میں ہونے والی تھی، اس عجلت کا مطلب وہ نہ سمجھ سکے لیکن انتظار کی تکلیف اور اپنا راز فاش ہونے کے ڈر سے یہ عجلت بہتر تھی۔ منورما کرسی پر بیٹھی ہوئی دھڑکتے ہوئے دِل کیساتھ کمرہ کی تصویریں بڑے غور کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ کسی کے پیر کی آہٹ پاتے ہی اُس کا دِل دونی رفتار کے ساتھ دھڑکنے لگتا تھا۔ وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ کوئی عجیب واقعہ پیش آنیوالا ہے۔ مگر اسقدر جاننے پر بھی وہ یہ نہ جان سکتی تھی کہ اِس سازش کی تہ میں اصلیت کیا ہے؟

ٹھیک وقت پر ڈاکٹر جھا کو ڈرائنگ روم میں جانیکی اجازت ملی۔ وہ اِس ہال میں بیسیوں مرتبہ چائے پی چکے تھے اور موسیقی سے لُطف اندوز ہو چکے تھے۔ مگر آج اُن کا دِل دھڑک رہا تھا۔ بہرحال وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ کسی کو کمرہ میں آتے دیکھ کر منورما ذرا ٹھٹھک گئی۔ ڈاکٹر نے چاہا کہ مس کھنّا (؟) کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک ہی مرتبہ اُنکی عارضی حیا کو دُور کر دیں۔ مگر آنکھیں ملتے ہی وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ جیسے لوہے کے گرم سنتوں سے اُنھیں باندھنے کے لئے کوئی لئے جا رہا تھا۔ ہٹتے ہٹتے وہ دروازہ کے قریب آگئے۔ اور آخری اطمینان کے لئے اُنھوں نے آنکھیں پھاڑ کر منورما کو دیکھا۔

اگر اُن کے پاس پستول ہوتا تو وہ یقیناً منورما کو گولی مار کر مسٹر کھنّا کا خاتمہ کرنیکے بعد اپنا بھی

وہیں خاتمہ کر دیتے، مگر وہ مجبور تھے۔

منورما رونے لگی۔

ڈاکٹر جھا یہ نہ سمجھ سکے کہ کیا کریں۔ وہ جلدی سے گھبرا کر باہر نکل آئے اور بھاگنا ہی چاہتے تھے، کہ مسٹر کھنّا جو پہلے ہی سے اس کے لئے تیار کھڑے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر لے گئے۔ ڈاکٹر جھا کٹے ہوئے درخت کی طرح دھم سے گر پڑے۔

مسٹر کھنّا نے پریما (مس کھنا) کو آواز دی۔ پریما نے آکر نمستے کی۔

"آیئے مسٹر جھا" مسٹر کھنّا نے ایک ہاتھ میں ڈاکٹر جھا اور دوسرے ہاتھ میں پریما کا ہاتھ لے کر ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ پریما کا چہرہ کنول کی طرح کھل اٹھا اور ڈاکٹر جھا کا منہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح لٹک گیا۔ وہ نہ سمجھ سکے کہ کیا کریں؟ مشین کے پتلے کی طرح مسٹر کھنا کے ساتھ ہو لئے۔

"بیٹی یہ تمہاری بڑی بہن مسز جھا ہیں، اِن کو سلام کرو"

پریما نے منورما کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی جیسے کوئی پاگل بلا مطلب کسی کو دیکھتا ہو۔ اُس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ پاپا کے حکم کی تعمیل کرے۔

مسٹر کھنّا نے ڈرائیور کو پکارا۔ "رحیم صاحب کو پہونچاؤ"

ڈاکٹر نے التجا آمیز نگاہوں سے مسٹر کھنّا کو دیکھا۔ مسٹر کھنّا نے آنکھوں سے اطمینان دلایا۔ کہ میں نوجوانوں کی طرح اوچھی طبیعت کا آدمی نہیں ہوں کہ یہ راز فاش کروں۔ ورنہ میں یہ میل ہی نہ ہونے دیتا۔ میرا کام تو وہیں ختم ہو جاتا کہ میں تمہیں پھٹکار دیتا کہ خبردار اب اِدھر نہ آنا۔ مگر اس راز کے فاش نہ کرنے کے لئے ایک بڑی رشوت تمہیں دینی ہوگی، اور وہ یہ کہ اب منورما سے بگاڑ نہ کرنا۔

ڈاکٹر جھا اور منورما نے مسٹر کھنّا کے پاؤں چھوئے۔

مس کھنّا نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی نکال کر منورما کو پہنا دی۔ انگوٹھی پر کندہ تھا "جھا"

رحیم نے پوچھا "کہاں چلیں حضور کٹڑہ؟"

ڈاکٹر جھا نے کہا "نہیں سول لائن بنگلہ نمبر ۸ پر چلو۔ میں بتا دونگا"



حقیقتِ دل

(منشی دوارکا پرشاد صاحب گہرؔ لکھنوی)

دل اک گو قطرۂ خونِ جگر ہے　　دماغ اس کا ہمیشہ عرش پر ہے
ہیں کھیل اس کے بلندی اور پستی　　تماشا نیستی ہستی و مستی
جہاں تک وسعتِ حدِ نظر ہے　　اسی کی شانِ قدرت جلوہ گر ہے
اسی کا نور ہے شمس و قمر میں　　اسی کی جلوہ ریزی بحر و بر میں
کبھی پستی میں ذرہ سے بھی ہے کم　　بلندی میں کبھی خورشیدِ اعظم
یہی ہے صنعت و حرفت کا بانی
یہی صورت گرِ بہزاد و مانی

بظاہر جو بہارِ آب و گل ہے　　حقیقت سب کی اک ننھا سا دل ہے
یہ ہے جذبات کی چھوٹی سی دنیا　　ہے موجودات کی ننھی سی دنیا
تعلق سب سے ہے سب سے جدا ہے　　خودی کی حد سے باہر خود خدا ہے
دلوں کو دم میں کر لیتا ہے تسخیر　　ہے اس کی خاک بھی دنیا میں اکسیر
کبھی عاشق کبھی معشوق ہے یہ　　کبھی خالق کبھی معبود ہے یہ
کبھی گرجا کبھی دیر و حرم میں
کبھی مسجد کبھی کوئے صنم میں

بظاہر ہر در و دیوار میں ہے　　بباطن پردۂ اسرار میں ہے
کبھی ہے یہ سیاسی جہد و جد میں　　کبھی سعی و عمل کے رد و کد میں
علم بردارِ حریت کبھی ہے　　ہر اک ذی روح کی ہمت کبھی ہے
اسی کا عالمِ ہستی میں غل ہے　　یہی اک شمعِ بزمِ عقلِ کل ہے
نظامِ سلطنت قایم ہے اس سے　　وجودِ زندگی دائم ہے اس سے

یہی مخزن ہے کانِ بحر و بر کا
جواہر لعل و یاقوت و گہر کا

حقیقت دل کی ہر اک پر عیاں ہے — مقیم اس میں زمین و آسماں ہے
مسافر ہے یہ ہستی و عدم کا — محافظ ہر قدم ہر دم ہے دم کا
کبھی سازِ حقیقت کی صدا ہے — کبھی معشوق ازلی کی ادا ہے
نزاکت بھی ہے شوخی بھی حیا بھی — شرارت بھی جفا بھی ہے وفا بھی
کبھی بے خانماں آوارہ برباد — کبھی قیدِ علائق سے ہے آزاد

گھر بس اپنے دل کی کر دکاں بند
کر اس میں دفترِ کون و مکاں بند

جذباتِ مدہوش

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔اے)

لوۂ پیر کی ہے جن کی نظر دیوانی — وہ نہ ہندی نہ حجازی ہیں نہ ہیں ایرانی
وحد ہیں نہ مشرک ہیں نہ منکر اے دوست — قائلِ حسنِ خوبانِ خوش روحانی
اہشِ سدرہ و طوبیٰ انہیں رکھتے ہرگز — طالبِ سرو قد و قامتِ یارِ جانی
، کو بھر ما نہیں سکتا کبھی بد رنگِ جہاں — جو سمجھتے ہیں کہ کیا شے ہے مقامِ فانی
، ر دام ہے یہ قیدِ تن و نفسِ رذیل — اور پھنستا ہی چلا جاتا ہے مرغِ جانی
ا ہیں تھا تیرا نشیمن، وہ ہے اے مرغِ اسیر — باغِ لاہوت کے آگے چمنِ سبحانی
ِ سدرہ نشیں کو نہیں نسبت کوئی — تجھ سے شہبازِ پریدہ زیرِ یزدانی
، لئے ہیں پر پرواز ترے بستۂ خاک — بر سرِ اوجِ فلک بیٹھ کے کر سلطانی

کچھ سمجھتا نہیں تو کون ہے کیا ہے مدہوش
حیف صد حیف تری بے خبری، نادانی

سر بشیشور ناتھ سریواستو مرحوم

جس وقت یہ خبر آئی کہ اودھ چیف کورٹ کے فاضل چیف جج سر بشیشور ناتھ، جو چار ماہ کی رخصت لیکر درستی صحت کی غرض سے یوروپ تشریف لے گئے تھے، واپسی کیوقت ساحل بمبئی پر قدم رکھتے ہی ۱۵ر جولائی کو اچانک علیل ہوگئے اور صرف دو روز کی مختصر علالت کے بعد صرف ۵۷ سال کی عمر میں ۱۷ر جولائی کو اس دار فانی سے رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے، تو تمام شمالی ہند میں عموماً اور اودھ میں خصوصاً صف ماتم بچھ گئی۔ آپ کی وفات سے لکھنؤ کا ایک بہت بڑا شہری، اودھ کی ایک بہت بڑی شخصیت، صوبہ کا ایک بہت قانون دان، ملک کا ایک دریا دل مخیر اور پبلک کا ایک بے لوث خادم دنیا سے اٹھ گیا۔ مرحوم نے اپنی محنت، جفاکشی، قابلیت و انصاف پروری، دیانت و ایمانداری ہی کی بدولت اسقدر جلد اور اسقدر اعلیٰ ترقی کی کہ دیکھتے دیکھتے جج اور جج سے چیف جج کے عہدہ جلیلہ تک فائز ہوگئے۔

سر بشیشور ناتھ ۱۸۸۱ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ چھوٹی ہی عمر میں اسکول کی تعلیمی منزلیں کامیابی کے ساتھ طے کرکے تیرھویں سال میں اسکول فائنل کا امتحان پاس کرلیا اور سترہ سال کی عمر میں گریجویٹ ہوکر دستار فضیلت حاصل کرلی۔ اس کے بعد قانون کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۰۳ء میں جبکہ آپ کی عمر صرف بائیس ۲۲ برس کی تھی، وکالت کی پریکٹس شروع کردی۔ ۱۹۱۹ء میں اودھ کورٹ کے ایڈوکیٹ ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں چیف کورٹ کے قائمقام جج اور ۱۹۲۹ء میں مستقل جج مقرر ہوئے۔ اسکے بعد ۱۹۳۴ء میں قائمقام چیف جج اور ۱۹۳۷ء میں مستقل چیف جج مقرر ہوگئے۔

عجب اتفاق ہے کہ اس مرتبہ کے سوائے آپ کے لئے جولائی کا مہینہ ہمیشہ بہت مبارک ثابت ہوتا تھا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۲۵ء میں آپ قائمقام جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد جولائی ۱۹۲۹ء میں مستقل جج ہوگئے۔ قائمقام چیف جج بھی آپ ۱۹۳۴ء کی جولائی میں ہوئے تھے اور پھر اسی ماہ ۱۹۳۷ء میں مستقل چیف جج ہوئے۔ مگر اس دفعہ یہ مہینہ راس نہ آیا اور ۱۷ر جولائی ۱۹۳۸ء کے منحوس دن آپ نے اس دنیائے فانی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔

سر بشیشور ناتھ ایک قابل وکیل یا فاضل جج ہی نہیں تھے، بلکہ آپ نے تمام عمر پبلک کی ہر ممکن

خدمت میں صرف کردی۔ آپ کی پبلک سرگرمیوں کا آغاز لکھنؤ میونسپل بورڈ سے ہوا۔ جس کے آپ ۱۹۱۴ء میں ممبر منتخب ہوئے تھے اور ۱۹۲۰ء میں چیرمین چنے گئے۔ لکھنؤ میونسپلٹی کی مالی حالت بہت دنوں سے خراب چلی آتی تھی مگر آپ نے انتہائی محنت و کفایت شعاری سے کام لے کر اُسے بالکل درست کردیا۔ گورنمنٹ نے بھی اس کارنمایاں کی یہ قدردانی کی کہ بورڈ کی چیرمینی کے بعد آپ کو لکھنؤ امپرومنٹ ٹرسٹ کا پہلا غیر سرکاری چیرمین مقرر کردیا۔ یہ عہدہ بھی اعزازی تھا۔ مگر آپ نے اسکی خدمات بھی اسقدر محنت و دیانت سے انجام دیں کہ مسلسل تین ٹرم تک آپ ہی ٹرسٹ کے چیرمین نامزد ہوتے رہے، بالآخر ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں گورنمنٹ نے آپ کو .O.B.E کے خطاب ونشان سے ممتاز فرمایا

آپ کو اعلیٰ تعلیم کی توسیع و ترقی سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ یونیورسٹی کی بُنیاد ہی سے آپ کا اُس کے ساتھ تعلق شروع ہوا اور مرتے دم تک آپ یونیورسٹی کورٹ اور کمیٹی کارکن کے ایک با اثر ممبر رہے۔ اس کے علاوہ آپ کو لکھنؤ کے قریب قریب تمام بڑے بڑے اسکولوں اور کالجوں سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ آپ مہا ودیالیہ، لامارٹینی گرل ہائی اسکول، لامارٹینی کالج، کوئن اینگلو سنسکرت ہائی اسکول اور گورنمنٹ ٹکنیکل اسکول کی اگزیکٹو کمیٹیوں کے بھی پریسیڈنٹ تھے۔ دیگر پبلک سرگرمیوں میں بھی آپ ہمیشہ خاص دلچسپی لیتے رہتے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ سیوا سمتی بوائے اسکاؤٹ، رفاہ عام کلب، لیگ برائے انسداد مرض سِل و دق کے پریسیڈنٹ اور امیرالدولہ لائبریری کے سکریٹری تھے سیاسی حیثیت سے آپ ایک اعتدال پسند مدبر تھے۔ لیکن ملک کی پولیٹکل ترقی چاہنے والی تحریکوں میں آپ بھی حسب موقعہ سرگرم حصہ لیتے رہتے تھے۔ مثلاً ۱۹۱۶ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا اکتیسواں اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو آپ اُس کی استقبالیہ کمیٹی کے جنرل سکریٹری تھے اور ۱۹۲۴ء میں جب پراونشل لبرل کانفرنس کا اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا تو آپ ہی نے اُس کی صدارت فرمائی۔

آپ فطرتاً صلح کل اور عادتاً صلح جو واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ اس آخری خصوصیت کی تعریف ایک پبلک تقریب کے موقعہ پر ہز اکسلنسی سر ولیم میرس گورنر صوبہ متحدہ نے مرحوم کی شان میں فرمایا تھا کہ "فرقہ وارانہ اختلافات میں مفاہمت و مصالحت کرنے میں جو خدمات جلیلہ آپ نے انجام دی ہیں، وہ خاص قدر و منزلت کی مستحق ہیں"۔ درحقیقت مرحوم نے ہر طرح کے پبلک فرائض کا بارِگراں اپنے سر پر لے رکھا تھا۔ اور ان کو وہ اس قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے کہ ہر طرف سے تعریف و تحسین کی صدا بلند ہوتی تھی۔ ان احسانات کے لئے صوبہ کی پبلک آپکی ہمیشہ مرہونِ منت رہیگی۔

ایک ایسے شخص کا جس کی لیاقت اور خدمات کا ریکارڈ اِسقدر شاندار ہو، لکھنؤ کیا صوبہ بھر میں

ہر دلعزیز ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ قانون پیشہ طبقہ میں جو ہر دلعزیزی اور وقار آپکو حاصل تھا اُس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ چنانچہ جب اودھ کی پہلی بار کونسل کا الکشن ہوا تو آپ کے ووٹروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ اور اس کا سلسلہ مدت تک جاری رہا۔ بہرحال جج مقرر ہونے تک آپ اودھ بار ایسوسی ایشن کے مسلّمہ لیڈر رہے۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر صاحب نے آپ کی قانون دانی کی داد دیتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ ہمیشہ وکالت میں آپ نے اپنا معیار جس قدر بلند رکھا اس سے اعلیٰ تر معیار شاید کسی وکیل نے کبھی رکھا ہو۔ سر تیشور ناتھ کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ آپ کا ظاہر و باطن دونوں یکساں تھے۔ آپ کیرکٹر کے بہت بلند، طبیعت کے نیک، مزاج کے شگفتہ، آداب صحبت کے ماہر اور اسقدر خوش اخلاق واقع ہوئے تھے کہ جو شخص آپ سے ایک مرتبہ بھی بات کر لیتا تھا، وہ ہمیشہ کے لئے آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ سنجیدگی و متانت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ایک مہربان دوست، فیاض رفیق، متواضع مہمان نواز اور فیاض طبع محب وطن تھے۔ آپ کی ذات سے سیکڑوں حاجتمندوں کی ضرورتیں رفع ہوتی تھیں۔ آپکی خیرات میں مذہب و ملت یا ذات پات کسی کی قید نہ تھی۔ چنانچہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب ممبر سروس کمیشن صوبہ متحدہ نے ایک پبلک جلسہ میں اس کا علانیہ اعتراف کیا ہے کہ آپ بیسیوں مسلمان بیواؤں اور یتیموں کی مدد کیا کرتے تھے۔ پبلک چندوں میں بھی آپ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ غرض آپ کے دروازے سے کبھی کوئی شخص مایوس یا شکستہ خاطر ہو کر نہیں آیا۔

آپ میں ایثار کا مادہ بھی بہت زیادہ تھا۔ ججی پر تقرر ہونے سے آپ کو بہت کچھ مالی نقصان پہونچا تھا۔ کیونکہ وکالت میں آپ کی بہت بڑی آمدنی تھی، لیکن چونکہ وکالت کی شب و روز مصروفیت کے باعث آپ کو پبلک خدمات کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس خیال سے آپ نے ججی قبول کرلی۔

تمدنی اصلاح کے بھی آپ بڑے حامی تھے۔ چنانچہ لکھنؤ ودھوا آشرم کے آپ پریسیڈنٹ تھے اور مردانہ کھیلوں سے بھی آپ کو دلچسپی تھی۔ غرض ہر حیثیت سے آپ صحیح معنوں میں ایک مکمل جنٹلمین تھے۔ شہر و صوبہ میں آپ سب طبقوں میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ بات یہ ہے کہ آپ کے مزاج میں کسی قسم کی رعونت یا تمکنت کو بالکل دخل نہ تھا اور ہر کس و ناکس سے آپ حسن اخلاق اور خاطر سے پیش آتے تھے۔ رسالہ زمانہ کے آپ شروع سے قدردان تھے جب عرصہ دراز تک آپ کی خدمت میں باقاعدہ طور پر شرف باریابی ملتا رہا ہے۔

آپ نے پسماندگان میں ایک بیوہ، چھ صاحبزادے، تین صاحبزادیاں اور سیکڑوں احباب

چھوڑے ہیں۔ آپ کی لاش بمبئی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے کانپور لائی گئی۔ سرسیا گھاٹ پر داہ سنسکار کیا گیا۔ آپ کے ماتم میں کچہریاں اور دفتر بند رہے۔ ایشور آپ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

آپ کی وفات پر "ہندوستان ریویو" کے فاضل ایڈیٹر ڈاکٹر سچدآنند سنہا صاحب نے جو تعزیتی مضمون رسالہ مذکور کے جولائی نمبر میں لکھا ہے۔ اُس میں آپ کی خصوصیات مندرجہ ذیل سطروں میں قلمبند کر دی ہیں:۔

"His life was gentle: and the elements.

So mixed in him, that Nature might stand up.

And say to all the world. 'This was a man.' "

ہمارے رفیق مکرمی محمد یعقوب خاں صاحب کلآم بی۔ اے، نے اِس اقتباس کا برجستہ ترجمہ اشعار ذیل میں کیا ہے۔ جو اِس مضمون کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے:۔

گذاری عمر بصد عزت و بصد شوکت تھا اختلاط عناصر کا اُس میں کچھ ایسا
بہ بانگ دہل یہ کہتی ہے مادرِ فطرت حقیقی معنی میں "انسان" یہ بشیشور تھا

ہمارے دوست اقبال ورما صاحب سحرؔ ہتگامی نے اس وفات حسرت آیات کے متعلق ایک برجستہ قطعہ تاریخ کہا ہے جو درج ذیل ہے:۔

سر بشیشور ناتھ کی یہ موت آہ! کس قدر طاری ہے دل پہ رنج و یاس
آ گئی "شامِ اودھ" میں تیرگی لکھنؤ کا لکھنؤ اب ہے اُداس
آج ہم سے چرخِ ناہنجار نے چھین لی خوشخوئیوں کی اِک اساس
آہ وہ آداب و اخلاق اب کہاں؟ اب کہاں وہ وضع کا بے مثل پاس؟
کیا ہوئی وہ ساری قانونی تمیز؟ کیا ہوا وہ سب کمال بے قیاس؟
عدل کا پھول آج بھی ہے خوشنما ہاں، وہ پہلی سی نہیں بو اور باس؟
چیف جج کا پایۂ عالی مگر طبعِ عالی کو نہ آیا حیف راس!
آپ کی سی شیوہ دانی اب کہاں آپ کا سا اب کہاں آئیں شناس؟
یوں تو ایسی ناگہانی موت پر کرب سے یکجا نہیں ہوش و حواس
سب سے بڑھ کر رنج ہے اس بات کا ہو رہی ہے قوم کی قوم اب نراس
بس یہی کہہ دو یہ تاریخ سحر "سر بشیشور ناتھ کا سُرلوک واس"

تنقیدِ کتب

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری[1]

کسی خاص زبان کی ڈکشنری اسی زبان میں لکھنا اگرچہ مشکل اور بڑی وسیع معلومات کا کام ہے لیکن کسی زبان کی ڈکشنری کا ترجمہ غیر زبان میں کرنا نہ صرف دشوار ہے بلکہ بعض اوقات محال ہوجاتا ہے۔ ہندوستان میں جب سے انگریزی عملداری ہوئی ہے، انگریزی زبان کا سیکھنا ضروری ہوگیا ہے، اس لئے شروع ہی سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مستند انگریزی ڈکشنری کا اُردو یا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ متعدد اہل قلم نے اس کی کوششیں کیں، جن میں سب سے زیادہ عمدہ اور مستند ڈاکٹر فیلن کی مشہور ڈکشنری ہے۔ عام ڈکشنریوں سے جو عموماً بازاروں میں ملتی ہیں دفتر کے کلرکوں یا اسکول کے طالب علموں کا تو کام نکل جاتا ہے لیکن ان کی مدد سے کوئی علمی یا ادبی کام نہیں نکل سکتا۔ اور اب ڈاکٹر فیلن کی ڈکشنری بھی پرانی اور نایاب ہوگئی ہے، کیونکہ جب وہ مرتب ہوئی تھی اُس وقت سے اب تک انگریزی زبان کی وسعت کہیں سے کہیں پہونچ گئی ہے اور اس میں نئے نئے الفاظ کا آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ اب ڈاکٹر فیلن کی ڈکشنری سے بھی پورا کام نہیں نکل سکتا۔ اس لئے سخت ضرورت تھی کہ ایک جدید انگلش ہندوستانی ڈکشنری تالیف کی جائے۔ ملک کو ہندوستانی زبان کے سچے خادم مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو و پروفیسر اُردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا شکرگذار ہونا چاہیئے جن کی جدوجہد سے مندرجہ عنوان انگلش اُردو ڈکشنری وجود میں آئی۔ یہ ڈکشنری کن کن دقتوں اور کن کن مصیبتوں سے مرتب ہوئی اس کا ذکر خود مولوی صاحب نے اپنے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس ضخیم ڈکشنری میں انگریزی الفاظ اور محاوروں کی تعداد دو لاکھ تک پہونچتی ہے، اور اُردو ترجمہ کے الفاظ کی تعداد لکھو کھا ہے۔ اگرچہ انگریزی الفاظ کے ترجمہ میں متعدد اہل قلم کا حصہ ہے۔ لیکن اصل محنت و جانفشانی مولوی عبدالحق صاحب کی ہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا حصہ ہے جنھوں نے بڑی دیدہ ریزی سے ترجموں پر نظرِ ثانی کی۔

---

[1] حجم ۱۵۳۸ صفحات قیمت سولہ روپیہ، ملنے کا پتہ انجمن ترقیِ اُردو اورنگ آباد دکن۔

مولوی عبدالحق صاحب نے ایک کمال یہ بھی کیا ہے کہ اگر کسی انگریزی لفظ کے لئے انھیں اُردو میں کوئی موزوں لفظ نہ ملا، تو انھوں نے اُس کا ترجمہ نہایت خوش اسلوبی سے گھڑ لیا ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ Colour blind. کا اُردو میں کوئی مترادف موجود نہیں ہے چنانچہ اُس کا ترجمہ مولوی صاحب نے "رتوندا" کے وزن پر "رنگوندا" بنالیا ہے جو چسپاں تو ہوگیا۔ اب رواج پائے یا نہ پائے، یہ مستقبل کی بات ہے۔ اسی طرح Absentee. کا ترجمہ "غائب باش" بروزن "حاضر باش" بنالیا گیا ہے۔ مولوی صاحب کی یہ اختراعات واقعی بہت قابلِ تعریف ہیں۔

بہرحال ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اِس سے اچھی انگلش اُردو ڈکشنری اِس وقت کوئی دوسری موجود نہیں ہے۔ ہم اس کی تیاری مولوی عبدالحق دنیز انجمن ترقی اُردو کا ایک بہترین کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ ڈکشنری ہر اسکول و کتب خانہ میں ہونی چاہئے۔ اِسکی چھپائی میں بہت احتیاط برتی گئی ہے۔ اور ٹائپ میں ہوئی ہے، اور مولوی صاحب نے کاغذ بھی خاص طور پر ولایت سے تیار کرایا ہے جو باریک ہونے کیساتھ بہت مضبوط ہے۔

انور[1]

مسٹر فیاض علی ایڈوکیٹ فیض آباد کا یہ دوسرا ضخیم اور کامیاب ناول ہے۔ اِس سے پیشتر آپ "شمیم" نامی ایک مقبول عام ناول لکھ چکے ہیں۔ یہ ناول بھی کیا بلحاظ زبان اور کیا باعتبار اسلوب بیان اسقدر دلچسپ ہے کہ شروع کرکے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ اِسکی سب سے بڑی خصوصیت اس کی کردار نگاری ہے قصہ کا ہیرو انور نامی ایک نوجوان گریجویٹ ہے جو بمبئی میں ایک بہت بڑے کارخانہ کا منیجر ہے۔ یہ شخص بہت نیک، سنجیدہ مزاج اور بات کا دھنی ہے۔ دوسرا شخص جو ہیرو سے بھی زیادہ نمایاں خصوصیات رکھتا ہے انور کا دوست بلکہ مربی ممتاز ہے اُس کی فلسفیانہ تقریریں اور حکمت طرازیاں پڑھکر طبیعت کو ایک خاص مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ناول کی ہیروین کشور جہان بیگم بمبئی کی ایک دولتمند لڑکی ہے۔ انور اور کشور جہان میں حسنِ اتفاق سے ملاقات ہوجاتی ہے، جو آخر عشق و محبت کا درجہ اختیار کرلیتی ہے ہیروین ایک بھولی بھالی اور ناتجربہ کار لڑکی ہے جو بہت جلد ڈاکٹر شیرازی جیسے عیار طرار اور اس کی عیارہ بہن زہرہ جمال کے مکرو فریب میں پھنس کر انور کے، جسے وہ واقعی دل سے چاہتی ہے، خلاف ہوجاتی ہے اور خود بھی تکلیفیں اُٹھاتی ہے اور انور کو بھی پریشان کرتی ہے۔

اس ناول کے ڈو کیرکٹر اور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ایک عذرا، ممتاز کی وفادار اور جان نثار بیوی اور

[1] ضخامت ۵۰۷ صفحات، قیمت ۲ روپے ۔ ملنے کا پتہ :۔ انڈین پریس الہ آباد۔

دوسری مہ جبین، ممتاز کی محبوبہ اور انور کی عاشق۔ مہ جبین نے اگرچہ بازاری حسن وعشق کے ماحول میں پرورش وتربیت پائی ہے، مگر اُس کی رگوں میں شرافت کا خون دوڑتا ہے، جسکی بدولت اُسے حسن فروشی سے دلی نفرت ہے۔ ممتاز اس پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے، مگر مہ جبین کو انور سے محبت ہے، اُس کے پھندے میں نہیں آتی ہے، بہرحال مہ جبین، ممتاز اور انور تینوں کا کیرکٹر ناول میں نہایت خوبی وکامیابی سے بیان کیا گیا ہے۔

پلاٹ کسی قدر اُلجھا ہوا ہے اور اسمیں رینالڈ کے ناولوں کی تقلید نمایاں ہے۔ ڈاکوؤں کے طلسمی قلعہ اور ڈاکٹر شیرازی کی عجیب وغریب موت نے اُسے اور بھی غیر فطری بنا دیا ہے۔ لیکن اس سے ناول کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اس ناول کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ قصّہ کو اسقدر طوالت دی گئی ہے کہ وہ ساڑھے سات سو صفحات پر ختم ہوتا ہے۔ طوالت آجکل کے زمانہ میں جبکہ لوگ عموماً عدیم الفرصت ہیں، کسی قدر کھلتی ہے۔ بایںہمہ سرسری سی نظر سے پڑھنے والوں کا دل بھی اسے پڑھکر خوش ہوگا۔ ممتاز، انور اور مہ جبین کی تقریروں میں جو فلسفیانہ استدلال ہوتا ہے اُس کا جواب اُردو ناولوں میں شاید ہی کہیں نظر آئے اکثر مقامات میں اس استدلال میں نوعِ انسان کی نیکی سے انکار بھی پنہاں ہے لیکن اُن موقعوں پر مصنف کی ستم ظریفی بھی قابل داد ہے۔

بہرحال اس دلچسپ ناول کے لئے ہر کتبخانہ اور ہر لائبریری میں جگہ ملنی چاہیے۔ مختلف ہاف ٹون بلاکوں نے اس کی دلکشی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ لکھائی چھپائی کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ کتاب انڈین پریس الٰہ آباد میں چھپی ہے اور جلد بندی انگریزی وضع پر ہوئی ہے

دہلی[1]

مولوی محمود علی خاں صاحب نے یہ کتاب بچّوں کے لئے بطور "دہلی گائڈ" تالیف کی ہے۔ جس میں نئی اور پُرانی دِلّی اور وہاں کے مختلف مشہور تاریخی اور قابلِ دید مقامات کے حالات درج کئے ہیں۔ مثلاً دہلی کے آٹھ شہر، دہلی کے بادشاہ، جامع مسجد، لال قلعہ، قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ، پُرانے قلعے اور نئی دہلی۔ ان جملہ مقامات کے تاریخی وجغرافیائی حالات مع نقشوں اور تصویروں کے درج ہیں۔ کتاب بہت آسان اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے اور سبق آموز ہے، لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔

---

[1] ضخامت ۹۴ صفحات۔ قیمت چار آنہ (۴ر) ملنے کا پتہ:۔ جامعہ ملیہ دہلی۔

*

رفتارِ زمانہ

(ممالک غیر)

اقتصادیات عالم | ظاہر بیں نظروں کو سیاسی مطلع ابر آلود ہی نظر آ رہا ہے اور اسپین و چین میں عرصہ سے خون کی بارش ہو رہی ہے لیکن اقتصادی مطلع نسبتاً بہت کچھ صاف ہے اور پیشتر کے مقابلہ میں اس وقت بے روزگاری میں خاصی کمی ہو گئی ہے۔ ۱۹۳۲-۳۳ء میں کساد بازاری کے باعث بے روزگاری کی کثرت تھی، مگر اُس وقت سے برابر کمی ہو رہی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے اعداد و شمار سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سال گذشتہ کی حالت ۱۹۲۹ء سے بھی (جو فارغ البالی کا سال تھا) بہتر حالت رہی۔ لیکن یہ صورت چنداں تسلی بخش نہیں ہے بلکہ اس میں آئندہ مصیبت کا پورا سامان نظر آ رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت تمام ممالک میں توسیع اسلحہ کے جنون میں جنگی سامان بنانے کے کارخانے کھلتے ہی چلے جا رہے ہیں جس سے وہاں کے باشندوں کے لئے روزگار کی صورت تو پیدا ہو گئی ہے لیکن دنیا کے امن و امان کو بڑا خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ علاوہ بریں چین، جاپان، جرمنی، اٹلی اور اسپین میں لوگوں کی کافی تعداد فوج میں بھرتی ہے مگر جس طرح گذشتہ جنگ عظیم کے بعد بے روزگاری ایک حادثۂ عظیم بن کر نمودار ہوئی تھی اسی طرح موجودہ روزگار کی صورت بھی بعد میں بے روزگاری میں تبدیل ہو جائے گی۔ اِس خطرہ سے دنیا کو محفوظ کرنے کی غرض سے مدبّرانِ ملک کو ابھی سے مناسب تدابیر پر عمل درآمد کرنا چاہیئے تاکہ جب سامانِ جنگ بنانے کی ضرورت باقی نہ رہے تو تھوڑی سی ردوبدل کے بعد تمام کارخانے دوسری اشیاء کی ساخت کے کام میں لائے جا سکیں، نیز ان کارخانوں کے مزدوروں کو پہلے ہی سے اس لائق بنا دیں تاکہ ان اشیاء کی ساخت کے لئے لگائے جا سکیں۔

برطانیہ، جرمنی، زیکوسلاویکیا | جب سے جرمنی میں ہٹلر برسرِ اقتدار ہوا ہے اس وقت سے برطانیہ کی کبھی ایسی تشویشناک حالت نہیں ہوئی تھی جیسی کہ آجکل ہے۔ کیونکہ برطانیہ ابھی مکمل طور پر جنگ کے لئے تیار نہیں ہو پایا ہے اور اس کوشش میں ہے کہ فی الحال دوسری کوئی بڑی لڑائی چھڑنے نہ پائے۔ برطانیہ نے اپنے حسن تدبیر سے اب تک جرمنی کو زیکوسلاویکیا کے خلاف جنگ آزمائی سے روکے رکھا ہے مگر جرمنی کے ذمہ دار وزراء بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ آخر جرمن صبر و تحمل کی کوئی حد ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا

کہ جرمنی کب کیا کر بیٹھے اور زیکوسلاویکیا کے کسی واقعہ کو اپنے لئے ناقابل برداشت قرار دیکر حملہ آور ہوجائے غالباً جرمنی اسی انتظار میں ہے کہ برطانیہ اور فرانس ذرا کسی دوسری طرف مشغول ہوجائیں تو وہ اپنے منصوبے پر عملدرآمد کرے، کیونکہ اس کو اس بات کا پورا اندیشہ ہے کہ اگر اس نے زیکوسلاویکیا کی طرف قدم بڑھایا تو روس و فرانس ہر طرح سے زیکوسلاویکیا کی مدد کریں گے۔ اسی خیال سے جرمنی نے روس کے خلاف جاپان کی امداد کرنے کا اعلان کردیا ہے۔ اور حدود وادی رائن اور علاقہ سار میں یعنی فرانسیسی سرحد پر زبردست مورچہ بندیاں کررہا ہے تاکہ ضرورت کے وقت فرانس کی شدید مزاحمت کرسکے۔ لیکن جرمنی کا ایک با اثر طبقہ دانشمندی سے کام لیکر بغیر کسی جنگ و جدل کے جرمن مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہے۔ کیونکہ زیکوسلاویکیا سے جنگ کرنا ہونے پر یورپ میں ایک عام جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ ہے، اور گو جرمنی کی فوجی طاقت میں بہت کافی اضافہ ہوگیا ہے تاہم ابھی تک اُسے اپنی کامیابی کا یقین نہیں ہے۔ برطانیہ کے ارباب حل و عقد نے بخوبی محسوس کرلیا ہے کہ اب مشرقی اور وسطی یورپ میں جرمنی کا غلبہ مستقل طور پر روکا نہیں جاسکتا کیونکہ جغرافیائی و اقتصادی لحاظ سے جرمنی کے لئے ان ممالک پر سیاسی یا اقتصادی تسلط جمانا قدرتی امر ہے۔ یہ بات بھی اب اُن کے ذہن نشین ہوگئی ہے کہ ہرچند جرمنی کے اندر نازیت کے مخالفین موجود ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ جنگ چھڑ کر دور نازیت کا خاتمہ ہوجائے تاہم غیر ممالک کو جرمنی کی اس اندرونی کمزوری پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نازیوں نے جرمن عوام کے لئے روزگار مہیا کرنے میں وہ کام کیا ہے کہ ان کے اکثر مخالفین بھی اِس کے باعث اُن کے حامی ہوگئے ہیں۔

اسپین اٹلی اور برطانیہ کے مابین معاہدہ ہوجانے کے بعد مسولینی اور جنرل فرینکو کو پوری اُمید ہوگئی تھی کہ جلد ہی باغیوں کو مکمل فتح حاصل ہوجائیگی، لیکن دوسری طرف روس اور فرانس نے اسپین کی جمہوری حکومت کو اور زیادہ مدد دینا شروع کردیا۔ چنانچہ تازہ ترین خبر ہے کہ دریائے ایبرو کے محاذ پر باغیوں کے خلاف جمہوری حکومت کو بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ پچھلے چھ ہفتوں میں جنرل فرینکو کو کامیابی حاصل ہوتی رہی لیکن یکایک ایبرو پر جمہوری فوج نے زبردست حملہ کردیا۔ اگر یہ خبر صحیح ہے کہ اس دریا کے پار جمہوری فوجیں بڑھ رہی ہیں تو جنرل فرینکو کو والنشیا کی طرف بڑھنے میں بڑی رکاوٹ ہوجائیگی کیونکہ اسے اپنی فوجیں شمال کی جانب بھیجنا پڑیں گی۔ اسپیدام سیرّہ کے کنارے جو ٹیرول ساگنٹو روڈ کے متوازی گئی ہے جمہوری فوجیں استقلال کے ساتھ باغیوں کا مقابلہ کررہی ہیں۔

فلسطین کی دہشت انگیزی میں ابھی تک بہتری کی کوئی صورت ظہور پذیر نہیں ہوئی، چنانچہ موجودہ حالت

ا Spadam.sirra ٹ Teruel Sagunto Road

طانیہ کے لئے بہت پریشان کن ہے۔ وزیر نوآبادیات نے حال ہی میں دار العوام میں اعلان کیا تھا کہ
ام امن میں امداد دینے کی غرض سے دو سو مزید پولیس بھرتی کرکے فلسطین بھیجنے کا انتظام کیا جارہا ہے۔
ں کے علاوہ ماہ ستمبر میں ایک نئی پلٹن بھی بھیجی جائیگی تاکہ گورنمنٹ دیہاتی حلقوں میں بھی مستقل طور سے اپنا
لط قائم کرکے اپنا پرانا دبدبہ حاصل کرسکے۔ اگر اس سے بھی زیادہ امداد کی ضرورت ہوگی تو اس کا بھی مناسب
ام کیا جائیگا۔ فلسطین کمیشن ماہ ستمبر میں لندن میں اپنی تحقیقاتی کارروائی کریگا لیکن ان کوششوں کے
وجود اس بات کی امید بہت کم ہے کہ عربوں اور یہودیوں میں مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہوسکے۔ کیونکہ
نوں فریق ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں اور دونوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان
ا ہے کہ وہ ملک کی تقسیم کے سخت خلاف ہیں۔ غرض فلسطین کے معاملات اب تک ویسے ہی اُلجھے
ئے ہیں۔

وس اور جاپان آخر کار روس اور جاپان بھی برسرپیکار ہوگئے۔ روسی فوج نے مانچوکو کے حدود میں اپنی
ج داخل کردی۔ جاپان نے صدائے احتجاج بلند کی لیکن روس کے متوجہ نہ ہونے پر چھ گھنٹہ کی لڑائی
بعد روسیوں کو چانگ کیو فنگ اور ساتون ڈنیگ سے بیدخل کردیا۔ غالباً پچھلی کسریں نکالنے کے لئے۔
ں اس موقعہ کو بہترین خیال کرتا ہے۔ جبکہ جاپان چین سے اُلجھا ہوا ہے۔ چین کو تو پہلے ہی سے روس
سامان جنگ بہم پہونچا رہا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اگر روس جاپان سے جنگ آزمائی کی ہمت کرگیا تو
چین میں جاپان کی فتحیابی بہت مشکوک ہوجائیگی۔ کیونکہ جاپان کافی عاجز آچکا ہے، گو وہ اب بھی
ہر کافی مطمئن نظر آرہا ہے اور علانیہ یہی کہہ رہا ہے کہ روس کو اُس سے جنگ آزمائی کا حوصلہ نہ ہوگا۔ اُسے
لنے کا اس وجہ سے حوصلہ ہوگیا ہے کہ روس میں بھی اندرونی سازشوں سے سخت ہلچل مچی ہوئی ہے
الرائے اصحاب کے خیال میں کوشش یہ ہورہی ہے کہ روس کو مشرق بعید کی طرف پھنسا کر یورپ
رف سے غافل کردیا جائے۔ تاکہ جرمنی بے دھڑک زیکوسلاویکیا پر قبضہ کرسکے۔ جرمنی نے یہ اعلان
کردیا ہے کہ اگر روس و جاپان میں جنگ چھڑ گئی تو جرمنی جاپان کی اخلاقی اور دوسرے طریقوں سے
رے گا۔" لیکن شکر ہے کہ یہ جنگ مقامی ہوکر عارضی طور پر ختم ہوگئی ہے۔ فریقین میں قرار پایا ہے کہ
اگست کو بارہ بجے رات تک جو علاقہ جس کے قبضہ میں تھا وہ اسی طرح رہے اور سرحد کا تصفیہ ایک
ن کے ذریعہ ہو جائے۔ جس میں دو روسی اور دو جاپانی ممبر ہوں۔

ہندوستان

صوبہ متوسط کی وزارت کا قصہ گو بظاہر ختم ہوگیا ہے اور نئے وزیر اعظم مسٹر شکلا نے اپنی کیبنٹ

مرتب کرلی ہے لیکن ہنوز تشویش باقی ہے کہ دیکھئے اس انقلاب عظیم کا آئندہ کیا اثر ہو؟ مہاتما گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے ڈاکٹر کھرے کے طریق عمل پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور ان کی خودمختاری اور گورنر صوبہ کی امداد لینے پر انھیں موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ ڈاکٹر کھرے نالاں ہیں کہ ان کے ساتھ رہنمایان کانگریس نے جو سلوک کیا اس سے ذمہ داری اور جمہوریت دونوں کے اُصولوں کا خون ہوگیا ہے۔ اکثر اخبارات اور ہندوستان کی لبرل پارٹی ڈاکٹر کھرے سے متفق ہے اور بعض اصحاب اس سلسلہ میں مسٹر نریمان کے واقعہ کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور اس بات کا خوف ظاہر کر رہے ہیں کہ پے در پے ایسی کارروائیوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس فسطائیت یعنی مطلق العنان حکومت کی طرف جا رہی ہے مہاتما گاندھی نے اس الزام سے کانگریس کی بریّت کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اپنے اخبار "ہریجن" مورخہ ۶۔ اگست میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ لڑانے والی مشین کی حیثیت سے کانگریس کے لئے واجب ہے کہ وہ اپنے نظام کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے بڑے سے بڑے کانگریسی کارکن کی بلا لحاظ اُس کی حیثیت و رتبہ کے رہنمائی کرے ان کی رائے میں کانگریس کسی دوسرے طریق پر اپنی لڑائی نہیں لڑ سکتی ہے۔ معترضین کے اس الزام کا کہ کانگریس فسطائیت کا ڈھنگ اختیار کر رہی ہے۔ مہاتما گاندھی یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ فسطائیت کو شمشیر برہنہ کا درجہ حاصل ہے جس کے تحت میں ڈاکٹر کھرے کی گردن جدا کردی گئی ہوتی مگر چونکہ کانگریس کا طریق عمل جبر و تشدد پر نہیں ہے بلکہ نیک نفسی پر مبنی ہے۔ اس لئے ہر کس و ناکس کو اس کی تمام کارروائیوں پر نکتہ چینی کا پورا حق حاصل ہے۔ بہ حال اس قضیہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی مداخلت سے اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ گورنر صوبہ متوسط کے متعلق بھی ورکنگ کمیٹی کی نکتہ چینی کو لوگ برحق نہیں قرار دیتے ہیں۔ اور ملک کے ایک بڑے طبقے میں بہت کچھ بدظنی پھیلی ہوئی ہے۔

صوبۂ متحدہ میں ترقیِ دیہات کی اسکیم صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کی کانگریس گورنمنٹ نے ترقیِ دیہات کے سلسلہ میں بڑے غور و خوض کے بعد ایک وسیع پروگرام تیار کیا ہے جس کی غرض و غایت دیہات میں مجلسی، تمدنی و اقتصادی زندگی کو از سرِ نو ترتیب دینا ہے۔ مجوزہ اسکیم میں زراعت کی طرف اولین توجہ دی گئی ہے اور مویشیوں کی نسل کی ترقی و بہبودی، دستکاری، صنعت و حرفت، معمولی سود پر قرض کا انتظام، پیداوار کی فروخت کا بندوبست، علاج معالجہ کا انتظام اور تعلیم بالغان وغیرہ کی طرف پوری توجہ دی جائیگی۔ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ گورنمنٹ کے مختلف محکمے جن کا تعلق دیہات سے ہے اشتراک عمل کریں۔ نیز سرکاری ملازم و غیر سرکاری کارکن بھی اتفاق

د اتحاد سے کام کریں اور دونوں ایک دوسرے کو رفیق کار سمجھکر متحدہ و مشترکہ طور پر کوشش کریں

اس خیال سے کہ مجوزہ اسکیم کا عمل درآمد کامیابی کے ساتھ ہو یہ تجویز کیا گیا ہے کہ پہلے مخصوص اور منتخب رقبوں میں اسکیم کا تجربہ کیا جائے ۔ یعنی بیس سے تیس گاؤں تک کو متحد کرکے یعنی تقریبًا پندرہ ہزار کی آبادی کا ایک رقبہ قائم کیا جائے اور اس طرح بارہ پندرہ رقبے قائم کئے جائیں ، جن کے اندر ہر گاؤں میں ایک انجمن ترقی معاشرت[1] قائم کی جائے اور اس میں گانوں کے ۷۵ فیصدی بالغ مرد شریک کئے جائیں اور اس رقبہ کے اندر کے تمام گانوں کی انجمنیں متفق و متحد ہو کر ایک یونین[2] قائم کریں اور پورے ضلع کے لئے ایک انجمن ترقی دیہات ضلع قائم ہو اور صوبہ بھر کے لئے ایک صوبجاتی ترقی دیہات بورڈ ہو ۔

ہر گانوں کے لئے ایک دیہاتی گائیڈ اور ہر رقبہ کے لئے ایک آرگنائزر[3] ، تمام ضلع کے لئے ایک انسپکٹر اور کمشنری کے لئے ایک سپرنٹنڈنٹ اور کل صوبہ کے لئے ایک افسر[4] ترقی دیہات مقرر کیا جائے ہر گانوں کی انجمن Better Living Society ایک نمایندہ پنچایت انتخاب کریگی جس کا ایک سرپنچ اور ایک سکریٹری ہوگا ۔ کسی اسکیم پر عملدرآمد کے لئے ضروری فنڈ بصورت نقدی یا بشکل جنس یا محنت (Labour) گانوں کے اندر ہی سے مہیا کیا جائیگا اور جو کمی رہ جائے اُسے یونین گورنمنٹ عطیہ سے پورا کرے ۔ سرکاری افسران بحیثیت اپنے عہدہ کے پنچایت کے ممبر شمار کئے جائیں گے

اس اسکیم پر اکثر نکتہ چینی ہو رہی ہے لیکن صاحب وزیر اعظم اور آنریبل مسٹر کاٹجو وزیر محکمہ نے صوبے کے اکثر مقامات پر خود جاکر اصحاب متعلقہ سے تبادلہ خیالات کیا ہے اور ہر جگہ مقامی کارکنوں کو حسب ضرورت اس اسکیم میں ضروری ترمیمات کا اختیار دیا ہے ۔

گورنمنٹ عنقریب ہی انتظامی و عدالتی اختیارات کے علحدہ کرنے کا بھی بندوبست کر رہی ہے مسٹر ڈبل کمشنر اس ڈیوٹی پر تعینات کئے گئے ہیں ، اور انھوں نے ایک اسکیم تجویز کی ہے جس کی رو سے زائد اخراجات کے بغیر ان صیغوں کی علحدگی عمل میں آسکیگی ۔ یہ اسکیم عنقریب امتحانی حیثیت سے جاری ہونے والی ہے ۔ دیکھئے اس سے یہ دیرینہ شکایت پورے طور پر رفع ہوتی ہے یا نہیں ۔

کاشتکاروں کی امداد کے متعلق اس وقت کئی مسودات قانون زیر غور ہیں ۔ زمیندار و تعلقدار صاحبان کو ان کے متعلق بڑی شکایتیں ہیں ، اور انھوں نے جا بجا ان کے خلاف بڑے بڑے دھوم دھامی

---

[1] Better Living Society [2] Union. [3] Organiser.

[4] Rural Development Officer.

جلسے بھی کئے ہیں جن میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں، اور بڑے بڑے ریزولیوشن پاس ہوئے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اگر زمیندار صاحبان کاشتکاروں کی اصلاح و بہبودی کے لئے خود ہی ایثار سے کام لیں اور اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ اپنے آسامیوں کی نفع رسانی میں صرف کرنے کا مصمم ارادہ کرلیں تو کسی گورنمنٹ کو کوئی مزید کارروائی کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ بحالت موجودہ عام کاشتکاروں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور زمیندار صاحبان کا غم وغصہ بہت کچھ بے محل ہے۔ ابھی کانگریس کے رہنما ان کے بنیادی حقوق کے خلاف نہیں ہیں اور مصالحت سے کام لینا چاہتے ہیں، لیکن بعد چندے کانگریس کیا دنیا کی کوئی طاقت اس قدر کثیر حصۂ آبادی کو ہمیشہ کے لئے جاہل و نادار بنائے نہیں رکھ سکتی ہے۔

بنگال میں پرجا پارٹی کے لیڈر مسٹر فضل الحق نے جو مخلوط وزارت قائم کر رکھی ہے اُس کو سوا برس سے زیادہ کی مدت گذر گئی ہے۔ یا تو الکشن کے وقت جو اُمیدیں اُس کی ذات سے قائم ہوئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں، یا اسمبلی کی مخالف پارٹیاں جس میں کانگریس پارٹی بھی شامل ہے زور پکڑ گئیں جس سے حق وزارت ڈانواں ڈول ہوگئی ہے۔ اس اثنا میں وزرا میں بھی کچھ اندرونی مناقشے ہوئے، جس کی وجہ سے سید نوشیر علی وزارت سے علحدہ کئے گئے اور باقی وزرا کا از سر نو تقرر ہوا۔ بہر حال ان دنوں حق وزارت کے مخالفین کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ پرجا پارٹی کے کئی ممبر سید نوشیر علی کے ساتھ مل گئے ہیں، جنھیں پست اقوام اور کانگریس پارٹی کی تائید بھی حاصل ہے۔ چنانچہ اب اس بات کی سخت کوشش ہو رہی ہے کہ حق وزارت کو شکست دیکر ایسی مخلوط وزارت قائم کی جائے جسے سب پارٹیوں کی حمایت حاصل ہو اور جس کی طرفدار کانگریس پارٹی بھی ہو۔ حال میں یہ کوششیں کسی حد تک کامیاب ہوتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ چنانچہ ۲۹۔ جولائی کو اسمبلی کا سیشن شروع ہوتے ہی مخالف جماعتوں نے وزارت کے خلاف دس طاقتی ریزولیوشن پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ دونوں طرف سے بڑے زور کی تیاریاں ہوئیں، جلسوں اور اشتہار بازی کے علاوہ لاٹھی ڈنڈوں سے بھی کام لیا گیا۔ نیز ممبران اسمبلی پر فریقین کی طرف سے ہر قسم کا جائز و ناجائز دباؤ ڈالا گیا۔ مخالف جماعت کے قریب ممبر اجلاس اسمبلی سے ایک رات پہلے ہی سے آکر اسمبلی ہال میں آکر سوئے، اسمبلی کے باہر ہزارہا لوگوں نے مسٹر حق کی حمایت میں مظاہرہ کیا، دونوں طرف سے ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی۔ لیکن ۸۔ اگست کو جب اسمبلی میں سب سے پہلے مہاراجہ قاسم بازار وزیر مال کے خلاف طاقتی رزولیوشن پیش ہوا تو یوروپین و انگلو انڈین پارٹی کی مدد سے رزولیوشن

گر گیا، ملامت کی طرف ایک سو گیارہ ووٹ اور اس کے خلاف ایک سو تین ووٹ آئے۔ اس کے بعد مسٹر سہروردی اور مسٹر ملک دیگر وزراء کے خلاف ریزولیوشنوں کا بھی یہی حشر ہوا مگر ان کے لئے رائے شماری کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد بقیہ ریزولیوشنوں کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ بہرحال اس وقت تو مسٹر حق کی وزارت اپنی جگہ پر قائم رہی لیکن مخالفین کی تعداد دیکھتے ہوئے اس کی آئندہ زندگی کی طرف سے کسی کو اطمینان نہیں ہو سکتا ہے۔ اس وقت انگریز ممبروں کی امداد سے قطع نظر مسٹر حق اپنے ہندوستانی ساتھیوں کی تائید بڑی ترکیبوں سے قائم رکھ سکے۔ کئی لوگوں کو انھیں پارلیمنٹری سکرٹری بنانا پڑا اور اب خبر ہے کہ کئی ممبروں کو مزید وزارتیں دینے کا بھی وعدہ ہو رہا ہے۔ انگریز لوگ اس کے خلاف ہیں، چنانچہ خوف ہے کہ اس قضیہ میں شاید ان کی ہمدردی عرصہ تک قائم نہ رہ سکے۔ خصوصاً جبکہ مخالفین شد و مد کے ساتھ اپنی کوششیں جاری کئے ہوئے ہیں۔

پنجاب | پنجاب میں بھی مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی متحدہ پارٹی کی وزارت قائم ہے جس کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں ہیں۔ کانگریس گورنمنٹوں کی طرح پنجاب گورنمنٹ کا مقصد بھی زراعت پیشہ کو فائدہ پہونچانا ہے جس میں زمیندار اور کاشتکار دونوں شامل ہیں۔ مگر جہاں کانگریسی حکومتیں کاشتکاروں کا زیادہ خیال رکھتی ہیں، وہاں پنجاب میں زمینداروں کا زیادہ لحاظ ہوتا ہے۔ چنانچہ حال میں پنجاب گورنمنٹ نے چار قوانین پاس کئے ہیں جن کا مجموعی نام "قوانین زمیندارہ" ہے۔ پنجاب میں زراعت پیشہ لوگوں کو کچھ خاص حقوق حاصل ہیں۔ نئے پاس شدہ قوانین میں ایک کا مقصد یہ ہے کہ دیوانی عدالتیں آئندہ کسی شخص کو زراعت پیشہ ہونے کی ڈگری نہ دیں۔ اور قانون انتقال اراضی کے خلاف تمام "بینامی" سودے منسوخ کر دئے جائیں۔ دوسرا ایکٹ قانون ساہوکارہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص ڈپٹی کمشنر سے لائسنس حاصل کئے بغیر لین دین کا کام نہ کرے، اور اگر کریگا تو اس کے دعوے کی کوئی سماعت نہ ہوگی۔ تیسرا ایکٹ واپسی اراضیات مرہونہ سے متعلق ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جن زراعتی اراضیات کا ۸۔ جون ۱۹۰۱ء سے پیشتر رہن نامہ ہو چکا ہے وہ منسوخ قرار دیا جائے اور اگر مرتہن دوران قبضہ اراضی میں اصل سے دگنا روپیہ وصول نہیں کر چکا ہے تو اسے ایک خاص حساب کے رو سے معاوضہ دلایا جائے۔ چوتھے قانون کا منشا یہ ہے کہ جو زمیندار لین دین کرتے ہیں وہ بھی بجز اُن صورتوں کے جو اس قانون میں درج ہیں زراعت پیشہ اقوام کی زمینوں کو رہن یا بیع نہ کر سکیں اس کے علاوہ پنجاب گورنمنٹ نے ایک مارکٹنگ بل یعنی مسودۂ قانون خرید و فروخت بھی اسمبلی میں پیش کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جو زمیندار و کاشتکار اپنی پیداوار منڈیوں میں لاکر فروخت کرتے ہیں انھیں لوٹ مار سے بچایا جائے۔ کیونکہ لوگ جھوٹے باٹوں سے تول کر یا ڈنڈی مار کر

ان بیچاروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ چونکہ پنجاب کی وزارت در اصل ایک "زمیندار وزارت" ہے، اور ان قوانین سے ساہوکاروں اور دیگر کاروباری لوگوں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے پنجاب کے غیر زمیندار طبقہ میں اس وقت ان کے خلاف بڑا شور وشر مچ رہا ہے۔ چنانچہ لائل پور میں ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی زیر صدارت ایک زبردست کانفرنس ہوئی، جس میں متعدد ریزولیوشن سر سکندر حیات اور ان کے رفقائے کار کے خلاف پاس کئے گئے۔ پریس اور پلیٹ فارم دونوں طرف سے ان قوانین کی مخالفت ہو رہی ہے، دیکھئے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

علمی خبریں اور نوٹ

سررشتہ لاسلکی سرکار عالی حیدرآباد دکن کے دو سال ۱۹۳۶-۳۷ء کے دوران میں "زمانہ" کے پندرہ مضامین نظم دنثر ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد دکن سے باجازت براڈکاسٹ کئے ہیں۔ ان میں ادبی۔ تاریخی۔ تنقیدی سبھی قسم کے مضامین ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ ایک مدت کے انتظار کے بعد حضرت ریاض خیرآبادی کا مکمل دیوان "ریاض رضوان" کے نام سے آٹھ سو انتیس (۸۲۹) صفحات پر پچھلے ماہ حیدرآباد دکن سے دیدہ زیب لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع ہو گیا ہے، اور چھ روپیہ قیمت پر منیجر صاحب شاہکار بک ڈپو گورکھپور یا حیدرآباد دکن سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

مشہور شاعر حضرت فانی بدایونی کا مکمل اردو فارسی مجموعۂ کلام انجمن اردو کی طرف سے جامعہ ملیہ کے زیر اہتمام دہلی میں زیر طبع ہے۔

انجمن ترقی اردو مولانا حالی مرحوم کی مشہور تصنیف "حیات جاوید" بھی (جو سر سید مرحوم کی مکمل ومفصل سوانح عمری ہے اور جو عرصہ سے نایاب تھی) عنقریب دوبارہ شائع کر رہی ہے۔ یہ ایڈیشن عمدہ کاغذ پر خاص اہتمام سے طبع ہو رہا ہے۔

ہم کو افسوس ہے کہ مکرمی سحر ہنگامی کی نظم "جہانگیری انصاف" (مندرجہ زمانہ جون ۳۸ء) کا ایک شعر جو مقطع سے پیشتر لکھا جانا چاہئے، کاتب کی سہو سے درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ ناظرین براہ مہربانی اس شعر ذیل کو نظم مذکور میں مقطع سے پہلے درج فرمالیں ؎

کر چکی عرض وہ اس طرح جہانگیر سے جب　　مطمئن ہو کے وہ فی الفور گئی اپنے گھر

پرنٹر شری نعمہ بیروال پریس کانپور

ایڈیٹر و پبلشر منشی دیانرائن نگم بی۔اے